خواتین اور دوشیزاؤں کیلئے اپنی طرز کا پہلا ماہنامہ
خواتین ڈائجسٹ
جنوری 2023
سالِ نو نمبر

BAKE PARLOR
CHINESE SAUCES
New Packaging
SOY SAUCE
SYNTHETIC VINEGAR
CHILLI SAUCE
TRIO PACK
SAVE 50
consumers@bakeparlor.com | www.bakeparlor.com | bakeparlor | bakeparlor_pk

خواتین ڈائجسٹ

خط و کتابت کا پتہ
خواتین ڈائجسٹ
37- اردو بازار کراچی

MEMBER
APNS
CPNE

بانی و مدیر اعلیٰ ــــــ محمود ریاض
مدیرہ ــــــ سعدیہ خاتون
مدیر ــــــ آذر ریاض
نائب مدیرہ ــــــ رضیہ جمیل
مجلس ادارت ــــــ امت الصبور
بلقیس بخاری
فنانس ــــــ علی سنان
پبلشر ــــــ خالد جیلانی

جنوری 2023
جلد 50 شمارہ 09
قیمت 120 روپے

واٹس اپ
0317 2266944

زر سالانہ بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک

پاکستان (سالانہ) ------ 1,440 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ ----- 22000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا - 24000 روپے
سالانہ خریدار بننے کے لیے ای میل کریں
subscriptions@khawateendigest.com

خط و کتابت کا پتہ: خواتین ڈائجسٹ، 37 - اردو بازار، کراچی۔

پبلشر آزر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91، بلاک W، نارتھ ناظم آباد، کراچی

Phone: 32721777, 32726617 Fax: 92-21-32766872 0317 2266944

Email: info@khawateendigest.com Website www.khawateendigest.com

مدیرہ

کچھ باتیں

خواتین ڈائجسٹ کا جنوری 2023 کا شمارہ پیش خدمت ہے۔
دنیا ایک اور سال پرانی ہو گئی۔ ایک اور سال اختتام کو پہنچا۔
نئے سال کی [illegible] امیدیں اور خوشیاں [illegible] رہی ہیں۔
جانے والے سال سے بہت سی تلخیاں بہت سے دکھ وابستہ ہوں گے۔ کچھ خوشیاں بھی زندگی میں آئی ہوں گی [illegible] ہماری یادوں کا حصہ بنتے جا رہے ہیں۔ یہ خوشیاں، غم، محرومیاں زندگی کا حصہ ہیں۔ زندگی [illegible] کا نام ہے۔
نئے سال میں [illegible] کے چکر [illegible] زندگی کی الجھنیں اور مسائل نئے سال میں [illegible] ایک اور سال ہماری زندگی سے رخصت ہو گیا۔ بہت سا قیمتی وقت [illegible] لوگوں کے لیے ہے جنہوں نے وقت کی اس [illegible] اپنے ساتھ ساتھ دوسروں کے لیے بھی کچھ کیا۔ [illegible] اور خوشیاں بانٹیں۔
ماضی ہمارے ہاتھ سے نکل چکا ہے۔ مستقبل پر ہمارا اختیار نہیں۔ ہمارے پاس صرف لمحہ موجود ہے۔ اپنے حال پر توجہ دیں۔ جو وقت ہے اسے تھام لیں۔ اسی پر ہمارا مستقبل استوار ہو گا۔
قارئین کو نیا سال مبارک۔
دعا ہے یہ سال آپ کے لیے، ہمارے لیے، ہمارے ملک کے لیے عافیت، سلامتی اور خوشحالی کا سال ثابت ہو۔ آمین۔

انشا جی،

انشا جی ۔ چاند کے شیدائی — چاند کی تلاش میں اتنی دور نکل گئے کہ واپسی کا راستہ ہی بھول گئے۔ [illegible] بہت اچھے شاعر، بہت بڑے مزاح نگار [illegible] ان کے ساتھ [illegible] انشا جی کی شخصیت پر لکھا [illegible] ان کی [illegible] ان کی شخصیت ان کی ذات کے حوالے سے ان پر مضامین لکھے [illegible] کتاب [illegible] ان کی شخصیت پر اور ان کی تحریروں اور شاعری پر کسی نے تنقید [illegible] اٹھایا۔
[illegible]
[illegible] ساتھ لے جاتی ہے۔
انشا جی کی [illegible] محسوس ہوتا ہے جیسے ہم خود زندگی کی [illegible] ہوں۔

اس شمارے میں،

- دل کی رگ رگ — آسیہ رئیس خان کا مکمل ناول،
- [illegible] کا مکمل ناول — ، [illegible] — نمرہ احمد کا مکمل ناول،
- [illegible] الطاف [illegible] کا ناولٹ،
- [illegible] کے افسانے،
- [illegible] کا ناول — ، آپ کی پسندیدہ مصنفہ — [illegible] سے ملاقات،
- [illegible] ، کرن کرن روشنی — احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا سلسلہ،
- نفسیاتی ازدواجی الجھنیں اور دیگر سلسلے شامل ہیں۔

قرآن پاک زندگی گزارنے کے لیے ایک لائحہ عمل ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی قرآن پاک کی عملی تشریح ہے۔ قرآن اور حدیث دین اسلام کی بنیاد ہیں اور یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔
قرآن مجید دین کا اصل ہے اور حدیث شریف اس کی تشریح ہے۔
پوری امت مسلمہ اس پر متفق ہے کہ حدیث کے بغیر اسلامی زندگی نامکمل اور ادھوری ہے۔ اس لیے ان دونوں کو دین میں حجت اور دلیل قرار دیا گیا۔ اسلام اور قرآن کو سمجھنے کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا مطالعہ کرنا اور ان کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔
کتب احادیث میں صحاح ستہ یعنی صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابوداؤد، سنن نسائی، جامع ترمذی اور موطا مالک کو جو مقام حاصل ہے وہ کسی سے مخفی نہیں۔
ہم جو احادیث شائع کر رہے ہیں، وہ ہم نے ان ہی چھ مستند کتابوں سے لی ہیں۔
حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے علاوہ ہم اس سلسلے میں صحابہ کرام اور بزرگان دین کے سبق آموز واقعات بھی شائع کریں گے۔

کرن کرن روشنی

ادارہ

جب برائی زیادہ ہو جائے

ام المومنین زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نیند سے جاگے اور فرمایا۔
"لا الہ الا اللہ" خرابی ہے عرب کی اس آفت سے جو نزدیک ہے، آج یاجوج اور ماجوج کی آڑ اتنی کھل گئی۔" (یعنی انگوٹھے اور کلمے کی انگلی سے حلقہ بنایا)
میں نے عرض کیا۔ "یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! کیا ہم تباہ ہو جائیں گے، ایسی حالت میں جب ہم میں نیک لوگ موجود ہوں گے؟"
آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"ہاں! جب برائی زیادہ ہو گی۔" (یعنی فسق و فجور یا زنا یا اولاد زنا یا معاصی)

(صحیح مسلم)

فتنوں کا نزول

سیدنا اسامہ زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ کے محلوں میں سے ایک محل پر چڑھے پھر فرمایا۔
"تم دیکھتے ہو جو میں دیکھتا ہوں؟ بے شک میں تمہارے گھروں میں فتنوں کی جگہیں اس طرح دیکھتا ہوں جیسے بارش کے گرنے کی جگہوں کو۔" (یعنی بہت ہوں گے بوندوں کی طرح مراد جمل اور صفین اور قتل عثمان اور شہادت حسین رضی اللہ عنہ اور ان کے سوا بہت سے فساد مسلمانوں میں ہوئے) (صحیح مسلم)

فتنوں کا بیان

سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم سیدنا عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نزدیک بیٹھے ہوئے تھے۔
انہوں نے کہا۔
"تم میں سے کس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فتنوں کا ذکر کرتے ہوئے سنا ہے؟"
بعض لوگوں نے کہا کہ ہاں ہم نے سنا ہے۔
سیدنا عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا۔ "شاید تم فتنوں سے وہ فتنے سمجھے ہو جو آدمی کو اس کے گھر بار اور

مال اور ہمسائے میں ہوتے ہیں۔"

سیدنا عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ "ان فتنوں کا کفارہ تو نماز اور روزے اور زکوٰۃ سے ہو جاتا ہے لیکن تم میں سے ان فتنوں کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کس نے سنا ہے جو دریا کی موجوں کی طرح اُمڈ کر آئیں گے؟"

سیدنا حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ لوگ خاموش ہو گئے۔ میں نے کہا کہ "میں نے سنا ہے۔"

سیدنا عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا۔

"تو نے سنا ہے تیرا باپ بہت اچھا تھا۔"

سیدنا حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا۔

"میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے۔" آپ فرماتے تھے کہ

"فتنے دلوں پر ایسے آئیں گے ایک کے بعد ایک کے بعد ایک جیسے بوریے کی تیلیاں ایک کے بعد ایک ہوتی ہیں پھر جس دل میں فتنہ رچ جائے گا اس میں ایک کالا داغ پیدا ہوگا اور جو دل اس کو نہ مانے گا تو اس میں ایک سفید نورانی دھبہ ہوگا یہاں تک کہ اسی طرح کالے اور سفید دھبے ہوتے ہوتے دو قسم کے دل ہو جائیں گے۔ ایک تو خالص سفید دل چکنے پتھر کی حدیث بیان کی۔

کہ "یہ دروازہ ایک شخص ہے جو مارا جائے گا یا مر جائے گا۔ پھر یہ حدیث کوئی غلط (دل سے بنائی ہوئی بات) نہ تھی۔

(صحیح مسلم)

شیطان کا فتنہ ڈالنا

سیدنا جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

"ابلیس اپنا تخت پانی پر رکھتا ہے پھر اپنے لشکروں کو دنیا میں فساد کرنے کو بھیجتا ہے۔ پس اس سے مرتبہ میں زیادہ قریب وہ ہوتا ہے کہ جو بڑا فساد ڈالے۔ کوئی شیطان ان میں سے آکر کہتا ہے کہ میں نے فلاں فلاں کام کیا (یعنی فلاں سے چوری کرائی، فلاں کو شراب پلوائی) تو شیطان کہتا ہے کہ تو نے کچھ بھی نہیں کیا۔ پھر کوئی آکر کہتا ہے کہ میں نے فلاں کو نہ چھوڑا یہاں تک کہ اس میں اور اس کی بیوی میں جدائی کرادی تو اس کو اپنے پاس کرلیتا ہے کہ ہاں تو نے بڑا کام ہے۔" اعمش نے کہا کہ "اس کو چمٹا لیتا ہے۔"

(صحیح مسلم)

فتنے مشرق کی طرف سے ہوں گے

سیدنا سالم بن عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ وہ کہتے تھے۔

"اے عراق والو! میں تم سے چھوٹے گناہ نہیں پوچھتا، نہ اس کو پوچھتا ہوں جو کبیرہ گناہ کرتا ہو۔ میں نے اپنے والد سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے سنا۔ وہ کہتے تھے۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے کہ "فتنہ ادھر سے آئے گا۔" اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ہاتھ سے مشرق کی طرف اشارہ کیا جہاں شیطان کے دونوں سینگ نکلتے ہیں اور تم ایک دوسرے کی گردن مارتے ہو (حالانکہ مومن کی گردن مارنا کتنا بڑا گناہ ہے) اور موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کی قوم کا ایک شخص مارا تھا اور وہ غلطی سے مارا تھا (نہ بہ نیت قتل کیونکہ گھونسے سے آدمی نہیں مرتا) اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ

"تو نے ایک خون کیا پھر ہم نے تجھے غم سے نجات دی اور تجھ کو آزمایا جیسا آزمایا تھا۔" (طہٰ۔۔۔40)

قیصر اور کسریٰ کے خزانے

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ کہتے ہیں کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جب کسریٰ (ایران کا بادشاہ) مر گیا تو اس کے بعد کوئی کسریٰ نہ ہوگا اور جب قیصر (روم کا بادشاہ) مر جائے گا تو اس کے بعد کوئی قیصر نہ ہوگا (اور یہ دونوں ملک مسلمان فتح کرلیں گے) قسم اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ ان دونوں کے خزانے اللہ کی راہ میں خرچ کیے جائیں گے۔"

امت کی تباہی

حضرت ثوبان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"اللہ تعالیٰ نے میرے لیے زمین کو لپیٹ لیا (یعنی سب زمین کو لپیٹ کر میرے سامنے کر دیا) تو میں نے اس کا مشرق اور مغرب دیکھا اور میری حکومت وہاں تک پہنچے گی جہاں تک زمین مجھے دکھلائی گئی اور مجھے دو خزانے ملے ایک سرخ اور سفید، اور میں نے اپنے رب سے دعا کی کہ میری امت کو عام قحط سے ہلاک نہ کرے اور ان پر کوئی غیر دشمن ایسا غالب نہ کرے کہ ان کا جتھا ٹوٹ جائے اور ان کی جڑ کٹ جائے۔ (یعنی بالکل نیست و نابود ہو جائیں)

میرے پروردگار نے فرمایا۔

"اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! جب میں کوئی حکم دیتا ہوں پھر وہ نہیں پلٹتا اور میں نے تیری یہ دعا قبول کیں اور تیری امت عام قحط سے ہلاک نہ کروں گا، نہ ان پر کوئی دشمن جو ان میں سے نہ ہو ایسا غالب کروں گا کہ جو ان کی جڑ کاٹ دے، اگرچہ زمین کے تمام لوگ (مسلمانوں کو تباہ کرنے کے لیے) اکٹھے ہو جائیں۔ (مگر ان کو تباہ نہ کرسکیں گے) یہاں تک کہ خود مسلمان ایک دوسرے کو ہلاک کریں گے اور ایک دوسرے کو قید کریں گے۔"

(صحیح مسلم)

تم اگلی امتوں کی راہوں پر چلو گے

سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"البتہ تم اگلی امتوں کی راہوں (یعنی گناہوں میں اور دین کی مخالفت میں) پر چلو گے (نہ یہ کہ کفر اختیار کرو گے) بالشت برابر بالشت کے اور ہاتھ برابر ہاتھ کے یہاں تک کہ اگر وہ گوہ کے سوراخ میں گھسے تو تم بھی گھسو گے۔"

ہم نے عرض کیا۔ "یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! اگلی امتوں سے مراد یہودی اور نصاریٰ ہیں؟"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "(اگر یہ نہیں تو) اور کون ہیں؟"

(صحیح مسلم)

قریش تباہ کرے گا

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"لوگوں کو قریش میں سے یہ خاندان (یعنی بنی امیہ) ہلاک کرے گا۔"

صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا۔ "پھر ہمیں کیا حکم ہوتا ہے؟"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

"اگر لوگ ان سے الگ رہیں تو بہتر ہے۔"

(صحیح مسلم)

فتنے میں حصہ لینا

سیدنا ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"بے شک کئی فتنے ہوں گے، خبردار رہو! وہاں کئی فتنے ہوں گے۔ بیٹھنے والا ان میں سے چلنے والے (لوگوں سے) بہتر ہوگا اور بھاگنے والے (لوگوں سے) چلنے والا بہتر ہوگا۔ خبردار رہو، جب فتنہ اور فساد اترے یا واقع ہو تو جس کے اونٹ ہوں۔ وہ اپنے اونٹوں میں جا ملے اور جس کی بکریاں ہوں اور اپنی بکریوں میں جا ملے اور جس کی (کھیتی کی) زمین ہو، وہ اپنی زمین میں جا رہے۔"

ایک شخص نے کہا "یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! جس کے اونٹ نہ ہوں اور نہ بکریاں اور نہ زمین ہو وہ کیا کرے؟"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "وہ اپنی تلوار اٹھائے اور پتھر سے اس کی باڑھ کو کوٹ ڈالے۔

(یعنی لڑنے کی کوئی چیز باقی نہ رکھے جو لڑائی کا حوصلہ ہو) پھر اپنے بچاؤ میں جتنی ہو سکے جلدی کرے۔ الٰہی! میں نے تیرا حکم پہنچا دیا، الٰہی میں نے تیرا حکم پہنچا دیا۔ الٰہی میں نے تیرا حکم پہنچا دیا۔"

ایک شخص بولا۔ "یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! بتلایئے کہ اگر مجھ پر زبردستی کریں۔ یہاں تک کہ مجھے دو صفوں میں سے یا دو گروہوں میں سے ایک لے جائیں پھر وہاں کوئی مجھے تلوار مارے یا تیر آئے اور مجھے قتل کرے؟"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "وہ اپنا اور تیرا گناہ سمیٹ لے گا اور دوزخ میں جائے گا۔"

(صحیح مسلم)

مسلمانوں کی لڑائی

سیدنا احنف بن قیس کہتے ہیں۔ "میں اس ارادہ سے نکلا کہ اس شخص کا شریک ہوں گا (یعنی سیدنا علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا سیدنا معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مقابلے میں شریک ہوں گا) راہ میں مجھے سیدنا ابوبکرہ ملے کہنے لگے کہ

"اے احنف! تم کہاں جاتے ہو۔"

"میں نے کہا کہ" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا زاد بھائی کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔"

"سیدنا ابوبکرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا" اے احنف! تم لوٹ جاؤ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے کہ "جب دو مسلمان اپنی تلواریں لے کر لڑیں تو مارنے والا اور جو مارا جائے دونوں جہنمی ہیں۔"

میں نے عرض کیا یا کسی اور نے کہا کہ "یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! قاتل تو جہنم میں جائے گا لیکن مقتول کیوں جائے گا؟" آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "وہ بھی تو اپنے ساتھی کے قتل کا ارادہ رکھتا تھا۔"

(صحیح مسلم)

دو مسلمان گروہوں میں لڑائی

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"قیامت قائم نہ ہوگی یہاں تک کہ (مسلمانوں کے) دو بڑے بڑے گروہ لڑیں گے۔ ان میں بڑی لڑائی ہوگی اور دونوں کا دعویٰ ایک ہوگا" (یعنی دونوں کا دین ایک ہوگا اور دونوں یہ دعویٰ کریں گے کہ ہم اللہ کے دین کے لیے لڑتے ہیں)۔

(صحیح مسلم)

فتنہ کا بیان

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، دنیا فنا نہ ہوگی یہاں تک کہ آدمی قبر پر گزرے گا پھر اس پر لیٹے گا اور کہے گا کاش میں اس قبر والا ہوتا اور اس کے ساتھ دین نہ ہوگا مگر بلا۔"

(صحیح مسلم)

ہرج کا بیان

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

"قیامت قائم نہ ہوگی یہاں تک کہ ہرج بہت ہوگا۔" لوگوں نے عرض کیا۔ "یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! ہرج کیا ہے؟"

آپ نے فرمایا۔ "قتل قتل۔" (یعنی خون بہت ہوں گے)

(صحیح مسلم)

قاتل و مقتول کا بیان

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

"قسم اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ دنیا ختم نہ ہوگی یہاں تک کہ لوگوں پر ایک دن آئے گا کہ مارنے والا یہ نہ جانتا ہوگا کہ اس نے کیوں مارا اور جو مارا جائے گا وہ نہ جانے گا کہ کیوں مارا گیا؟"

لوگوں نے کہا۔ "یہ کیسے ہوگا؟"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "کشت و خون ہوگا قاتل اور مقتول دونوں جہنمی ہیں۔"

(صحیح مسلم)

زمین حجاز کی آگ

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"قیامت قائم نہ ہوگی یہاں تک کہ ایک آگ حجاز کے ملک سے نکلے گی اور وہ بصرہ کے اونٹوں کی گردنوں کو روشن کر دے گی۔" (یعنی اس کی روشنی ایسی تیز ہوگی کہ عرب سے شام تک پہنچے گی۔ حجاز مکہ اور مدینہ کا ملک اور بصرہ ایک شہر کا نام ہے)

(صحیح مسلم)

بت کی عبادت

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"قیامت قائم نہ ہوگی یہاں تک کہ دوس کی عورتوں کے سرین ذی الخلصہ کے گرد ہلیں گے۔" (یعنی وہ اس کا طواف کریں گی) ذی الخلصہ ایک بت تھا جس کو دوس، جاہلیت کے زمانے میں تبالہ میں پوجا کرتے تھے۔

لات و عزیٰ کی عبادت

ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کہتی ہیں کہ "میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا آپ نے فرمایا۔

"رات اور دن ختم نہ ہوں گے جب تک لات اور عزیٰ (جاہلیت کے بت) پھر نہ پوجے جائیں گے۔" میں نے عرض کیا۔ "یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میں تو سمجھتی تھی کہ جب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اتاری کہ اللہ وہ ہے جس نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت اور سچا دین دے کر بھیجا تا کہ اس کو سب دینوں پر غالب کرے اگرچہ مشرک لوگ برا مانیں کہ یہ وعدہ پورا ہونے والا ہے (اور اسلام کے سوا اور دین غالب نہ رہے گا۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "ایسا ہوگا جب کہ اللہ تعالیٰ کو منظور ہوگا پھر اللہ تعالیٰ ایک پاکیزہ ہوا بھیجے گا جس کی وجہ سے ہر مومن مر جائے گا یہاں تک کہ ہر وہ شخص بھی جس کے دل میں دانے کے برابر بھی ایمان ہے مر جائے گا اور وہ لوگ باقی رہ جائیں گے جن میں بھلائی نہیں ہوگی پھر وہ لوگ اپنے (مشرک) باپ دادا کے دین پر لوٹ جائیں گے۔"

(صحیح مسلم)

خشکی اور سمندر

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"تم نے سنا ہے ایسا شہر جس کے ایک جانب خشکی ہے اور ایک جانب سمندر ہے؟"

صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا۔ "کہ ہاں یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! ہم نے سنا ہے۔" (یعنی قسطنطنیہ ہے)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "قیامت قائم نہ ہوگی یہاں تک کہ اس شہر سے اسحاق علیہ السلام کی اولاد میں سے ستر ہزار لڑیں گے، پس جب اس شہر کے پاس آئیں گے تو اتر پڑیں گے پس ہتھیار سے نہ لڑیں گے اور نہ تیر ماریں گے بلکہ لا الہ الا اللہ واللہ اکبر کہیں گے تو اس کی طرف جو دریا میں ہے گر پڑے گی۔ پھر دوسری بار لا الہ الا اللہ واللہ اکبر کہیں گے تو اس کی دوسری طرف گر پڑے گی۔ پھر تیسری بار لا الہ الا اللہ واللہ اکبر کہیں گے تو ہر طرف سے کھل جائے گا پس وہ اس شہر میں گھس پڑیں گے اور لوٹیں گے جب وہ مال غنیمت کو بانٹ رہے ہوں گے تو اچانک ایک چیخنے والا آئے گا اور کہے گا کہ دجال نکل آیا ہے تو وہ ہر چیز کو چھوڑ دیں گے اور دجال کی طرف پلٹیں گے۔"

(صحیح مسلم)

ابن انشاء ـ یادیں باتیں

اے حمید

بات اتنی پرانی بھی نہیں ہے۔

ابھی اسی اگست کی ایک دوپہر تھی کہ ہم لوگ امرتسر سے ہجرت کر کے لاہور آ گئے۔ شاہ عالمی دروازے کی راکھ میں سے ابھی دھواں اٹھ رہا تھا۔ مسجد شہید گنج میں چھپے ہوئے سکھ ابھی تک ریلوے اسٹیشن کے باہر مہاجرین کیمپ پر فائرنگ کر رہے تھے۔ لاہور شہر کی فضا جلے ہوئے مکانوں کی بو سے بوجھل تھی۔ والٹن کے مہاجرین کیمپ میں تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔

مشرقی پنجاب سے مسلمان پناہ گیروں کی ریل گاڑیاں دھڑا دھڑ لاہور پہنچ رہی تھیں۔ ادھر سے ہندو سکھ شرنارتھیوں کے قافلے مشرقی پنجاب کی طرف جا رہے تھے۔ زندگی کے ہر شعبے میں ایک انتشار، ایک اداسی طاری تھی۔ امرتسر، جالندھر، لدھیانہ اور مشرقی پنجاب کے دوسرے دیہات سے جو مسلمان بھی لاہور پہنچا، زخم خوردہ تھا۔

ہم امرتسر کے ادیب، شاعر دوست پہلے گوالمنڈی کے ایک ہوٹل میں بیٹھا کرتے تھے۔ پھر وہاں سے مال روڈ پر پاک ٹی ہاؤس میں آ کر ڈیرا جما لیا۔ پاک ٹی ہاؤس کا نام پہلے انڈیا ٹی ہاؤس ہوا کرتا تھا۔ اس ٹی ہاؤس کی روشن چمکیلی فضا میں ہم نے باہر سے آئے ہوئے دوستوں کو پہلی بار دیکھا۔ کسی نے کہا۔

"میرا نام اشفاق احمد ہے۔"

کسی نے کہا۔

"مجھے ناصر کاظمی کہتے ہیں۔"

"میں اے حمید ہوں۔ تم سب سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔"

اور پھر ایک روز میں نے ابن انشاء کو دیکھا۔ دبلا، سانولا، لہرائے چمکیلے بال اور ناک پر موٹے شیشوں کی عینک...... پہلی بار دیکھنے پر مجھے وہ کسی ہندو ساہوکار کا منیم جی لگا۔ میرا حمید اختر نے تعارف کروایا۔

"ہمارا یار غار اور ترقی پسند ادیب ابن انشاء۔"

میں نے انشاء سے ہاتھ ملایا۔ وہ شرما سا گیا۔ اس کی آنکھوں میں ایک بڑی ذہین اور شریر چمک سی آ گئی۔ اب وہ مجھے ایک بے حد شرارتی اور نٹ کھٹ لڑکا لگا اور مجھے اس سے مل کر خوشی ہوئی۔ حمید اختر بولا۔

"اے حمید! تمہیں ابن انشاء سے مل کر بہت خوشی ہوگی کیونکہ تمہاری طرح یہ بھی کبھی کبھی چڑیوں، طوطوں کی باتیں بڑے مزے لے لے کر کرتا ہے۔"

ابراہیم جلیس نے قہقہہ لگا کر کہا۔

"ارے کینے ایسا اندر سے شیر محمد قیصر ہے۔"

حمید اختر بولا۔ "اور دھرائی بھی۔"

ابراہیم جلیس نے ایک فلک شگاف قہقہہ لگایا۔ ابن انشاء نے بڑے بھولپن سے سر ہلاتے اور عینک کے شیشے صاف کرتے ہوئے کہا۔

"دوستو! میں ابن انشاء ہوں، لیکن چائے کا آرڈر کون دے رہا ہے؟"

احمد راہی کہنے لگا۔ "یہ جلیس بڑے اونچے اونچے قہقہے لگاتا ہے، اسے پکڑنا چاہیے۔"

حمید اختر نے جلیس کی گردن پکڑ کر کہا۔ "منگواؤ کینے چائے۔"

ابراہیم جلیس نے گردن جھکا کر ہنستے ہوئے کہا۔

"چائے کا آرڈر میں دیتا ہوں مگر پیسٹری ابن انشاء منگوائے گا۔"

ابن انشاء شیشے صاف کر کے عینک ناک پر جما رہا تھا۔ اس کے نچلے ہونٹ کے کونے میں شرارت بھری مسکراہٹ کی لکیر ابھری۔ کہنے لگا۔

"دوستو! میرا یہ تجربہ ہے کہ میں نے جب بھی ٹی ہاؤس میں پیسٹری منگوائی، باسی آئی ہے۔ یہاں ساتھ والی میز پر ناصر کاظمی بیٹھا ہے۔ اس کا ادھار بھی چلتا ہے اور بیرے اسے تازہ پیسٹری لا کر دیتے ہیں۔"

ناصر کاظمی نے آخری سگریٹ کا آخری کش لگایا اور ساتھ والی میز سے اٹھ کر ہماری میز پر آ گیا۔ ابن انشاء کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

"پیارے! میں تو چائے کے ساتھ اناس کھایا کرتا ہوں لیکن تمہاری خاطر سارے لاہور شہر کی پیسٹری منگوا سکتا ہوں۔"

پھر اس نے ٹی ہاؤس کے بیرے لال کو بلا کر کہا۔

"لال! میرے دوستوں کو عمدہ پیسٹریاں لا کر کھلاؤ۔"

یہ میں نے محسوس کیا کہ ابن انشاء فضول خرچ بالکل نہیں تھا بلکہ وہ ہر خرچ کو فضول سمجھتا تھا۔ بڑا کم خرچ تھا، لیکن بالانشین تھا۔ اس کے دوست اس کو بہت چاہتے تھے۔

جلد ہی ہمارا ایک ترقی پسند گروپ بن گیا۔ حمید اختر، ابراہیم جلیس، کرمانی، سبط حسن، احمد راہی، عارف عبدالمتین، ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور، احمد ندیم قاسمی، عبداللہ ملک اور دوسرے احباب نے مل کر انجمن ترقی پسند مصنفین کی بنیاد رکھی۔ ہر ہفتے اس کے ادبی اجلاس ہونے لگے۔ افسانے، مضامین اور غزلیں نظمیں پڑھی جاتیں زوردار بحثیں ہوتیں۔ ابن انشاء ان بحثوں میں بھرپور حصہ لیتا۔

انہی دنوں ابن انشاء نے اپنی مشہور طویل نظم "بغداد کی رات" لکھی اور انجمن کے اجلاس میں پڑھی۔ اس پر بحث شروع ہو گئی۔ ابن انشاء انجمن کے اصول و ضوابط کے مطابق اس بحث میں حصہ نہیں لے سکتا تھا۔ چنانچہ وہ میرے ساتھ کرسی پر بیٹھا پہلو بدلتا رہا۔ اسلوب کے اعتبار سے یہ نظم اس عہد کی ترقی پسند نظموں سے بہت مختلف تھی۔ بیان بڑا سادہ تھا۔ اظہار بھی اس طرح کے خیالات کا تھا کہ جو اس زمانے کی ترقی پسند تحریک سے ذرا ہٹ کر تھے۔

بہرحال بحث جاری رہی۔

کچھ نے کہا یہ چاند ہے کچھ نے کہا چہرہ تیرا

مجھے ابن انشاء کی یہ نظم بڑی پسند آئی۔ شاید اس لیے کہ میں خود بغداد کی راتوں کا مسافر تھا اور الف لیلیٰ کی شہزادیوں سے عشق کیا کرتا تھا۔ میں ابن انشاء سے پیار کرنے لگا اور یہی اس سے میری دوستی کا آغاز تھا، کیونکہ میں دوستی نہیں کر سکتا، پیار کر سکتا ہوں اور میں ابن انشاء سے پیار کرنے لگا۔ اب مجھ پر انکشاف ہوا کہ وہ بھی مجھ سے پیار کرتا ہے۔

ان دنوں ابن انشاء ایبٹ روڈ پر نشاط سینما کے سامنے والے ایک چھوٹے سے سرخ مکان میں رہتا تھا۔ یہ مکان انہوں نے پھلور سے آنے کے بعد الاٹ کروالیا تھا۔ اس مکان کی چھت آگے کی جانب ڈھلوانی تھی اور سرخ تھی۔ ابراہیم جلیس اس مکان کو چینی پیگوڈا کہا کرتا تھا۔ مکان کے آگے ایک ننھا سا آنگن تھا۔ آنگن میں پیپل کے پیڑ کی ٹھنڈی چھاؤں رہتی۔ میں اور انشاء برآمدے میں بیٹھے باتیں کیا کرتے۔ وہ آئینہ میز پر رکھے کھرچ کھرچ کر شیشہ بنا رہا ہوتا۔ اندر سے چائے کی دو پیالیاں آ جاتیں۔

"اے حمید! لاہور کی گلیاں بغداد کی گلیوں سے بڑی ملتی جلتی ہیں۔" میں نے کہا۔ "تم نے بغداد کی گلیاں کہاں دیکھی ہیں؟"

ابن انشاء نے سر ہلا کر مسکراتے ہوئے کہا۔

"ایک نہ ایک دن بغداد کی گلیاں ضرور دیکھوں گا۔"

پھر وہ تولیے سے گال رگڑتے ہوئے پوچھتا۔
"تم نے نیا چینی رسالہ "نیو ٹائمز" پڑھا؟"
"نہیں تو۔"
"میں ابھی لاتا ہوں۔"
اندر سے وہ "نیو ٹائمز" کا رسالہ اٹھا لایا اور ہم مل کر اس کی ورق گردانی کرنے لگے۔ چائے پیتے ہوئے وہ مجھ سے باتیں کرنے لگا۔
"اے حمید! تم رومانٹک ہو۔ تمہیں سیاسی شعور بھی ضرور ہونا چاہیے۔ میں چاہتا ہوں تم نیو ٹائمز، باقاعدگی سے پڑھا کرو۔ پھر جب تم کہانیاں لکھو گے تو وہ تمہاری یادگار کہانیاں ہوں گی۔"
میں نے "نیو ٹائمز" کا رسالہ بند کر کے ابن انشاء کے کان میں کہا۔
"ریحانہ کا ایک اور خط آیا ہے۔"
ابن انشاء کی آنکھوں میں چمک سی آ گئی۔
"کہاں ہے کمینے۔ لا مجھے بھی پڑھ کر سنا۔"
"میں اپنی محبوبہ کا خط تمہیں کیوں سناؤں؟"
ابن انشاء نے جھک کر آئینہ برآمدے کے ستون سے لٹکا دیا اور بالوں میں کنگھی کرتے ہوئے بولا۔
"کمینے! مجھ سے اپنی محبت کے بارے میں مشورہ نہیں لو گے تو کیا حمید اختر اور سبط حسن سے لو گے؟ چلو، میں تمہیں اجازت دیتا ہوں کہ تم اپنے محبت بھرے خطوط میں میری نظم، بغداد کی ایک رات کے شعر استعمال کر سکتے ہو۔"
میں نے کہا۔ "میں اپنی محبوبہ سے ہاتھ نہیں دھونا چاہتا۔"
ابن انشاء اپنی شرارت بھری چمکیلی آنکھیں جھپکا کر بولا۔
"پھر کیا ہوا۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہو گا کہ وہ تمہیں چھوڑ کر مجھے خط لکھنے شروع کر دے گی۔ ویسے بھی وہ بے چاری تمہارے لمبے لمبے رومانٹک افسانے کب تک سہتی رہے گی۔ میں اسے چھوٹی چھوٹی پیاری پیاری نظمیں سنایا کروں گا۔ فکر نہ کرو۔ کبھی کبھی تمہارے افسانوں کا ذکر بھی کر دیا کریں گے۔"
میں نے ریحانہ کا خط نکال کر ابن انشاء کو دیا۔ وہ کھول کر پڑھنے لگا۔ اس کے ابرو کبھی اوپر اٹھتے کبھی نیچے گرتے۔ عینک کے پیچھے چمکیلی آنکھیں لفظوں کا تعاقب کرنے لگیں۔
"ارے یہ خط جعلی تو نہیں؟ مجھے تو یہ تمہاری کارستانی معلوم ہوتی ہے۔"
میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔
"ریحانہ کے خط بڑے رومانٹک ہوتے ہیں۔ تمہیں اس لیے شک ہوا۔ نیچے دیکھو اس کا نام لکھا ہوا ہے۔"
ابن انشاء نے خط کے نیچے ریحانہ کے دستخط بڑے غور سے دیکھے۔
"ریحانہ کے دستخط تو میں بھی کر سکتا ہوں۔ یا تو یہ خط تم نے خود لکھا ہے اور یا پھر ریحانہ کو تم خود لکھ کر دیتے ہو۔"
میں ہنس پڑا۔ ابن انشاء بھی مسکرایا۔ پھر میری طرف گردن جھکا کر کہنے لگا۔
"کمینے! کیوں شریف بیبیوں کو خراب کر رہے ہو۔ اچھا میں اس لڑکی سے ملوں گا۔ کہوں گا، بی بی! یہ امرتسری بدمعاش تو بیک وقت چار لڑکیوں سے عشق کر رہا ہے۔ نہیں تو ابھی کوالٹی ریسٹورنٹ میں چل کر مجھے فروٹ کیک کھلاؤ۔"
میں نے ابن انشاء کے کندھے پر ہاتھ مار کر کہا۔ "منظور ہے۔"
کوالٹی ریسٹورنٹ میکلوڈ روڈ پر ریجنٹ سینما کے بالکل سامنے ہوا کرتا تھا۔ بعد میں یہاں موٹروں کا شوروم کھل گیا۔ اب وہ بھی نہیں رہا۔ اس ریسٹورنٹ کی بہار تھوڑے دن ہی رہی۔ اس ریسٹورنٹ میں کوئی خاص بات بھی نہیں تھی۔ لیکن کچھ عرصہ ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں کی منڈلی اس ریسٹورنٹ میں اپنی محفل جماتی رہی۔ شاید اس کی وجہ یہ بھی ہو کہ یہ نیا نیا کھلا تھا۔ اس ریسٹورنٹ میں اتری ہوئی میری ایک تصویر آج بھی میرے پاس ہے جس کے نیچے ابن

انشاء نے اپنے ہاتھ سے لکھا تھا۔ "نٹ کھٹ اے حمید۔"
ابن انشاء کپڑے پہن کر تیار ہوا تو ہم ایبٹ روڈ پر آ گئے۔
"ذرا حسرت صاحب کو دیکھتے چلتے ہیں۔ شاید کرمانی بھی آ گیا ہو۔"
روزنامہ امروز کا دفتر ان دنوں ایبٹ روڈ پر ہوا کرتا تھا اور ابن انشاء کے مکان کے بالکل سامنے تھا۔ ہم امروز کے دفتر میں آ گئے۔ چراغ حسن حسرت ابھی تشریف نہیں لائے تھے۔ ہم نے چق اٹھا کر دیکھا ان کا کمرہ خالی تھا۔ اس دفتر کے پہلو میں کسی ٹرانسپورٹ کمپنی کا دفتر تھا اور باہر ایک آدھ ٹرک اکثر کھڑا رہتا اور کلینرز وغیرہ چھوٹی موٹی مرمتوں میں لگے رہا کرتے تھے۔ ٹرانسپورٹ کمپنی کے منیجر کا دفتر حسرت صاحب کے کمرے کے برابر میں تھا۔ اور اس کے آگے بھی چق پڑی رہتی تھی۔
ایک روز ایسا ہوا کہ ایک نووارد کلینر کو ڈرائیور نے کہا کہ منیجر سے جا کر ٹائر کی پرچی لے آئے۔ کلینر کو ابھی دفتر کے نشیب و فراز کا علم نہیں تھا۔ اس نے منیجر کے دفتر میں جانے کے بجائے حسرت صاحب کے دفتر کی چق اٹھائی اور اندر آ گیا۔ سامنے میز پر ٹیبل لیمپ جلائے حسرت صاحب کالم لکھ رہے تھے۔ کلینر نے ایک بھاری بھرکم مونچھوں والے آدمی کو دیکھا تو سمجھ گیا کہ یہی منیجر ہے۔ اب حسرت صاحب کو بھی کسی نووارد کی موجودگی کا احساس ہوا۔ چشمے کے پیچھے سے اپنی بڑی بڑی سرخ آنکھیں اٹھا کر پوچھا۔
"فرمائیے مولانا! میں کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"
کلینر نے ٹھیٹھ پنجابی لہجے میں کہا۔
"جی کرم داد ڈرائیور پھجی اشتی نے نیا ٹائر منگا ہے۔"
حسرت صاحب چونک گئے۔ ایک ہاتھ سے چشمہ اتارا اور بولے۔
"کیا فرمایا مولانا؟"
کلینر نے بالکل ویسے ہی انداز میں پھر کہا۔
"جی پھجی اشتی کا ڈرائیور کرم داد نیا ٹائر مانگتا ہے۔"
چراغ حسن حسرت اٹھ کر کمرے سے باہر آ گئے اور اکاؤنٹینٹ کو آواز دے کر کہا۔
"مولانا، لنڈے بازار سے کچھ ٹائر منگوا کر یہاں رکھوا دیجیے۔ لوگ امروز میں ٹائر مانگنے بھی آ جاتے ہیں۔"

☆☆☆

امروز کا یہ دفتر ایک لمبا ہال کمرہ تھا جس میں تختے کھڑے کر کے پارٹیشن کر دی گئی تھی۔ حمید اختر ایک میز پر انڈیا کے اخبار پھیلائے اس کے تراشے کاٹ رہا تھا۔ اونچا لمبا، صحت مند نوجوان اور سر پر براؤن رنگ کے بالوں کا گھنا چھتا۔ حمید اختر اب یہ جملہ پڑھے گا تو اسے اپنے خوب صورت گھنے بال بہت یاد آئیں گے، کیونکہ اب اس کے سر سے بالوں کا سایہ اٹھ چکا ہے۔
دبلا پتلا گورا چٹا خوب صورت عبداللہ ملک خبروں کا ترجمہ کر رہا تھا اور بار بار ماتھے پر آئے ریشمی بالوں کو پیچھے ہٹا رہا تھا۔ ایک جانب عبدالشکور احسن بیٹھے کچھ لکھ رہے تھے۔ حمید ہاشمی اور کرمانی ابھی نہیں آئے تھے۔ ہم کچھ دیر بیٹھے حمید اختر اور عبداللہ ملک سے باتیں کرتے رہے۔ حمید اختر نے چائے کی چینک منگوائی اور ہم چائے پینے لگے۔
امروز کے دفتر سے باہر نکلے تو میرا خیال تھا ابن انشاء فروٹ کیک والی بات بھول گیا ہوگا۔ میں سویرا کے دفتر کو جانے کے لیے گوالمنڈی کی جانب مڑنے لگا تو ابن انشاء نے کہا۔
"کوالٹی ریسٹورنٹ ادھر نہیں ادھر ہے۔"
ہم کوالٹی ریسٹورنٹ میں آ کر بیٹھ گئے۔
شیشوں کے پیچھے سے میکلوڈ روڈ والے پیپل کے گھنے درخت نظر آ رہے تھے۔ کسی وقت کوئی تانگہ گزر جاتا۔ بہت کم لوگ آ جا رہے تھے۔ پیپل کے پتے بڑے ہرے بھرے تھے۔ کچھ شاخوں پر نسواری

رنگ کی تی تی کو تتلیاں بھی پھوٹی تھیں۔ شاید بہار کا موسم تھا۔ یعنی چیت بیساکھ کا مہینہ تھا۔

ان دنوں نہ گرمی لگتی تھی نہ سردی۔ ہر موسم پر بہار کے موسم کا گمان ہوتا تھا۔ مجھے یاد ہے یہ ان ہی دنوں کی بات ہے، میں کافی ہاؤس میں اکیلا بیٹھا کچھ لکھ رہا تھا کہ مضبوط تن و توش والا ہاکسر نما صفدر میر اندر آیا اور میری طرف دیکھ کر ہنستے ہوئے بولا۔

"ارے تو یہاں بیٹھا ہے اور باہر اتنی خوب صورت لو چل رہی ہے۔"

ہاں۔ ان دنوں مئی جون کی تپتی ہوئی دوپہریں، گرم لوئیں اور پوہ ماگھ کے مہینوں میں چلنے والی سرد برفیلی ہوائیں، یہ سب کچھ بڑا اچھا لگتا تھا۔

موسموں میں ہمارے بدن کی خوشبو تھی۔ گرم لوئیں ہمارے سانس کا ایک جھونکا تھیں۔ دسمبر کی سرد ہوائیں ہمارے جسموں سے چھو کر گرم ہو جاتی تھیں اور بہار کی ہوائیں ہمیں اپنے ساتھ ساتھ اڑائے لیے پھرتی تھیں۔ چیلوں کے زرد اور سرخ پتوں کی طرح ہم موسموں کے ساتھ ساتھ جوان ہوتے تھے۔

ہر موسم کا طلوع ہوتا سورج ہم سے ہاتھ ملاتا تھا۔ آدھی رات کے ستارے ہمیں لاہور کی سنسان سڑکوں پر سرگشت کرتے دور سے پہچان لیتے تھے اور ہم ستاروں کو دیکھ کر وقت بتا دیا کرتے تھے۔ گرم لوئیں ہمیں ٹھنڈا رکھتی تھیں۔ سرد ہوائیں ہمیں گرم کر دیتی تھیں۔ بہار کی ہوائیں ہمیں اعتدال بخشتی تھیں اور راتوں کی آوارہ گردی ہمیں دن کو نئے نئے خیال عطا کرتی تھی۔

لیکن اب ایسا نہیں ہے۔ موسموں کا ہاتھ ہمارے ہاتھ سے چھوٹ گیا ہے۔ خزاں، بہار اور رت جھڑ کا تیر ہماری کمان سے نکل گیا ہے۔ اب ہم صبح دیکھتے ہیں۔ سورج طلوع ہوتا نہیں دیکھتے، رات دیکھتے ہیں۔ ستارے نہیں دیکھتے۔ موسم ہمارے ایئر کنڈیشنڈ اور سنٹرلی ہیٹڈ کمروں کے دروازوں پر دستکیں دے کر گزر جاتے ہیں۔

گرمیوں میں ہم اپنی ایئر کنڈیشنڈ خواب گاہوں میں کمبل اوڑھ کر سوتے ہیں اور سردیوں میں ہم اپنے سنٹرلی ہیٹڈ کمروں میں بغیر لحاف کے سوتے ہیں۔ ہم نے موسموں کو دھوکا دیا ہے۔ ہم نے موسموں کا مذاق اڑایا ہے، لیکن موسموں کی بھی اپنی عزت نفس ہوتی ہے۔ ہم نے ان کی عزت مجروح کی۔ انہوں نے ہم سے انتقام لیا۔ ہم نے انہیں چکر میں ڈالا، انہوں نے ہمیں بے راہرو کر دیا۔ موسم تو اپنی جگہ پر کھڑا رہا۔ مگر ہم اپنے مدار سے ہٹ گئے۔

ابن انشا میرے سامنے بیٹھا تھا۔ ابھی وہ اپنے مدار سے ہٹا نہیں تھا۔ ابھی موسموں کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں تھا۔ ابھی اسے گرمی لگتی تھی۔ سردی محسوس ہوتی تھی۔ وہ پھولوں کی خوشبو محسوس کرتا تھا۔ اسے طوطوں کی آوازیں سنائی دیتی تھیں اور ہم دونوں کی زمین ایک ہی سورج کے گرد چکر لگا رہی تھی۔

ہمارا مدار ایک ہی تھا۔ چائے آگئی۔ میں چائے بنانے لگا۔ میں نے ابن انشا سے کہا کہ فروٹ کیک کی جگہ کریم رول کیوں نہ منگوا لیں؟

کہنے لگا۔ نہیں، فروٹ کیک مہنگا ہوتا ہے، وہی منگواؤ۔

میں ابن انشا کو چھیڑ رہا تھا۔ مجھے اس سے پیار تھا۔ اور اس کی دوستی مجھے بڑی عزیز تھی۔ اس کی صحبت میں بیٹھنے کے لیے میں موقعے ڈھونڈا کرتا تھا۔ ان دنوں وہ بھی اتنا مصروف نہیں ہوا کرتا تھا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے، ہم بہت کم ایک دوسرے سے الگ رہتے تھے۔ صبح ہوتے ہی سے چکر شروع ہوتا۔ کبھی امروز کے دفتر میں تو کبھی 'سویرا' کے دفتر میں اور کبھی 'ادب لطیف' کے دفتر میں۔ یہاں سے فراغت ملتی تو لاہور کی گلیوں میں گشت لگانے نکل کھڑے ہوتے۔

شام کو ٹی ہاؤس یا کافی ہاؤس میں محفلیں لگتیں۔ سب ہی دوست وہاں موجود ہوتے۔ کیسی کیسی پیاری صورتیں بیٹھا کرتی تھیں۔ کسی کونے میں انور جلال شمزا کے قہقہے گونج رہے ہیں۔ کہیں ضمیر الحسنین کی لطیفہ بازیاں اور فقرے بازیاں ہو رہی ہیں۔ کہیں احمد بشیر بلند آواز میں باتیں کر رہا ہے اور کہیں ناصر کاظمی اپنی

تازہ غزل سنا رہا ہے۔

سیڑھیوں کے ساتھ والی میز پر قیوم نظر نے منڈلی جما رکھی ہے۔ مجھے۔ ٹی ہاؤس کا دروازہ کھلا اور صفدر میر بھی اپنے پاؤں جھاڑتا، موٹی موٹی آنکھوں سے ماحول کا جائزہ لیتا اندر آگیا۔ حمید اختر اور سبط حسن نے اسے اشارے سے اپنی طرف بلا لیا ہے۔ اب فضا میں کبھی کبھی صفدر میر کا صحت مند طوفانی قہقہہ بھی گونج اٹھتا ہے۔ اتنے میں حسن لطیفی بھی اپنا لمبا کوٹ سنبھالتے اندر آگئے ہیں۔ وہ بھی ہمارے ساتھ بیٹھ گئے۔ لطیفی صاحب یہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ لدھیانہ کا اصل نام ارض لدھ ہے اور اس کا ذکر بائبل میں ملتا ہے۔

ابن انشا نے کہا۔

"پھلور کا ذکر توریت میں ملتا ہے۔ اس کا اصل نام "پھل اور" تھا۔ حضرت موسیٰ نے جب اپنے آدمیوں کو وادی سینا کے شمال کی طرف روانہ کیا تو واپس آ کر انہوں نے انگور کے گچھے اور سرخ سیبوں کی ٹوکریاں پیش کیں اور کہا کہ یہاں سے دو دن دو رات کی مسافت پر ایک بستی ہے جس کے باغ پھلوں سے لدے ہوئے ہیں پس حضرت موسیٰ کے ایک حواری نے اس کا نام، پھل اور، رکھ دیا اور جو بگڑتے بگڑتے پھلور بن گیا۔"

"بھائی یوں تو ہر شہر کا نام کسی نہ کسی کتاب میں مل جائے گا۔" انور جلال نے ساتھ والی میز سے آواز لگائی۔

"یار ذرا چوہڑکانہ کا نام تلاش کرنا کہ کون سی کتاب میں ہے؟"

ابن انشا بولا۔

"یار! تحقیق کا سارا کام مجھے ہی کیوں سونپ دیا۔ کچھ تم بھی تو ہمت کرو۔"

سب نے پیسے ڈال کر چائے منگوائی اور چائے کی گرمی میں محفل اور زیادہ گرم ہوگئی۔

بات میں کوالٹی ریسٹورنٹ کی کر رہا تھا۔

ابن انشا اس وقت میرے سامنے بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ میں بھی چائے پی رہا تھا۔ ہم فروٹ کیک بھی کھا رہے تھے۔ ابن انشا نے جیب سے ایک میٹھی گولی نکال کر مجھے دی اور اپنے منہ میں ڈال لی۔ میں نے پوچھا۔

"یہ کیسی گولی ہے؟"

کہنے لگا۔

"برخوردار! پوچھا نہیں کرتے۔ یہ پیپر منٹ کی گولی ہے۔ تمہارا گلا سہگل کے موافق ہو جائے گا۔ کھا جاؤ۔"

ابن انشا بھنے ہوئے چنوں، ریوڑیوں، میٹھی گولیوں اور اسی قسم کی نقل کے طور پر کام آنے والی چیزوں کا بڑا شوقین تھا۔ چلتے چلتے کسی ریڑھی والے کے پاس کھڑا ہو جاتا۔

"یار! تھوڑی سی گنڈیریاں لے لیں۔ چلتے بھی جائیں گے اور چوستے بھی جائیں گے۔"

پان اسے کھانا بالکل نہیں آتا تھا۔ پان وغیرہ کا اسے شوق بھی نہیں تھا۔ بس کسی نے زیادہ اصرار کر کے کھلا دیا تو کھا لیا۔ ہاں جب ہم ڈھاکے گئے تو وہاں اس نے دو ایک بار بڑے شوق سے پان کھایا تھا۔ کراچی میں آباد ہونے کے بعد بھی میرا خیال ہے، اسے پان کھانے کی عادت نہیں پڑی تھی۔ وہ پان اس طرح کھاتا جیسے اسے کوئی مصیبت پڑ گئی ہے۔ پان اس کے منہ سے باہر آنے کی کوشش کرتا اور وہ اسے اندر نگلنے کی کوشش کیا کرتا۔ پیک تھوکتے وقت وہ دونوں ہاتھ سینے پر باندھ کر آگے کو جھک جاتا اور بڑی احتیاط سے جھک کر بلکہ بیٹھ کر تھوکتا۔ میں اسے کہا کرتا:

"یار تم گلے میں تولیا باندھا کرو۔"

وہ ہنس کر کہتا۔

"ہم وضع دار لوگ ہیں۔ پان کھانے میں ہر ممکن احتیاط سے کام لیتے ہیں۔"

پھر پٹ پٹ آنکھیں جھپکا کر کہتا۔

"یار! ویسے پان ایسی چیز خود کھانے سے بہتر ہے کہ کسی دوسرے کو کھلا کر اس کا تماشا دیکھا جائے۔"

ایک دن ہم گوالمنڈی کے چوک سے گزر رہے تھے۔ ابن انشاء نے ایک جگہ گول گپے والے کو دیکھا تو وہاں رک گیا۔
"گول گپے کھاتے ہیں۔"
ریڑھی والے نے ایک ایک پیالی ہمارے ہاتھوں میں تھمادی اور کھٹاس سے بھر بھر کر گول گپے مع چھوا کالے ابلے ہوئے چنوں کے ہماری پیالیوں میں رکھنے لگا۔ گول گپے کھاتے کھاتے ابن انشاء نے بڑے غور سے کھٹاس میں ڈوبے کالے چنوں کو دیکھا اور بولا۔
"یار! یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ کالے چنے کس خوشی میں ساتھ دیتے ہیں؟ یہ تو ہم بھی مانتے ہیں کہ بکری مینگنیاں ڈال کر دودھ دیتی ہے۔ لیکن یہ دکان دار کالے چنے ڈال کر گول گپے کیوں دیتا ہے۔"
میں پھر واپس کوالٹی ریسٹورنٹ میں چلا ہوں۔
ابن انشاء میرے سامنے بیٹھا چائے پی رہا تھا اور گری بھی چوس رہا تھا۔ سگریٹ وہ نہیں پیتا تھا لیکن کبھی کبھی..... بہت شاذ و نادر..... کسی دوست سے سگریٹ لے کر پی لیتا تھا۔ سگریٹ کو وہ یوں آگ دکھاتا جیسے ابھی بھک سے اڑ جائے گا۔ پھر جو وہ سگریٹ کا حشر کرتا، میں اسے بیان نہیں کرسکتا کیوں کہ مجھے سگریٹ سے بہت محبت ہے اور اس کا یہ حشر دیکھ نہیں سکتا تھا۔
اس روز کوالٹی ریسٹورنٹ میں مجھے سگریٹ دیکھ کر اس نے خلاف معمول مجھے سگریٹ پینے سے منع کرنے کی کوشش کی۔
"اے حمید! سگریٹ کے بجائے جوس پیا کرو۔"
میں نے کہا "جوس بھی پیتا ہوں۔"
کہنے لگا۔
"وہ تو مجھے پتا ہے۔ تم امرتسری پہلوان کی اولاد ہو۔ دہی کا ادھر کا بھی پیتے ہو۔ جوس پیتے تو میں نے خود تمہیں دیکھا ہے بلکہ میں نے تمہیں کئی بار جوس والے کی ریڑھی کے پاس مالٹوں کے چھلکے کھاتے بھی دیکھا ہے کیونکہ بقول کرشن چندر مالٹوں کے چھلکوں میں وٹامن زیادہ ہوتے ہیں۔
اگر تم اس باقاعدگی سے ہر سیزن میں مالٹے کے چھلکے کھاتے رہے تو ایک نہ ایک دن ضرور دودھ دینے لگو گے۔"
ابن انشاء باتیں کرتا رہا، خود بھی ہنستا رہا۔ مجھے بھی ہنساتا رہا۔ پھر میرے افسانوں پر گفتگو شروع ہوگئی۔ میرا ایک افسانہ "منزل منزل" ادب لطیف کے سالنامے میں چھپا تھا۔ ابن انشاء کان میں ماچس کی سلائی گھماتے ہوئے بولا:
"اس کہانی میں مجھے وہ منظر بڑا پسند آیا جہاں راجدہ ڈیوڑھی میں بیٹھ کر جھابڑی والے سے کھٹے سنگترے خریدتی ہے۔"
پھر پوچھنے لگا۔
"یہ راجدہ لڑکی جو ہے..... میرا مطلب ہے کہ یہ ریحانہ نہیں ہے ناں؟"
پھر خود ہی بولا۔
"لیکن ریحانہ تو بقول تمہارے کنیرڈ کالج میں پڑھتی ہے۔ وہ راجدہ نہیں ہوسکتی۔ اچھا ایک بات ہے۔ کمینے! یہ بھولی بھالی لڑکیاں تمہارے قریب بہت آجاتی ہیں۔"
میں نے کہا۔
"خدا کی قسم میں نے آج تک کسی لڑکی کو فریب نہیں دیا۔"
گردن ہلا کر مسکراتے ہوئے بولا۔
"بکواس بند کرو کمینے۔"
"تمہارے لیے چائے اور بناؤں؟"
"نہیں، فروٹ کیک منگواؤ۔"
ہاف سیٹ چائے اور فروٹ کیک بھی آگیا۔ میکلوڈ روڈ کے پیپل کے درختوں میں ہوا سرگوشیاں کررہی تھی۔ ابن انشاء چائے کی چسکیاں لے رہا تھا۔ میں نے 'منزل منزل' کی ہیروئن راجدہ کی کوئی بات کی تو بولا۔
"یار! راجدہ کا جو ناک نقشہ تم نے کھینچا ہے اسے دیکھ کر مجھے پھلوری کی ایک لڑکی کا خیال آتا ہے۔"
بس اس سے آگے ابن انشاء نے کچھ نہ بتایا۔ اپنی رومانٹک زندگی کے بارے میں بھی کوئی بات نہیں کی تھی۔ میں نے جب بھی کریدنا چاہا، وہ ٹال جاتا اور کوئی دوسری بات شروع کردیتا۔ بہت دنوں بعد جب وہ کراچی آچکا تھا تو اس نے مجھے ایک چھوٹی سی رومانٹک داستان سنائی۔ پھر اس نے مجھ سے مشورہ لیا۔
میں نے ایسا مشورہ دیا کہ تختہ ہی الٹ گیا۔ ابن انشاء مجھے گالیاں دیتا رہ گیا۔ ویسے اسے گالی دینا نہیں آتی تھی۔ مجھے صرف ایک گالی دیا کرتا۔
'حرامزادے..... اور یہ گالی جب بھی میں اس کی زبان سے سنتا تو مجھے بڑی خوشی ہوتی۔ یوں لگتا جیسے وہ مجھے کوئی اعزاز دے رہا ہے۔
میں نے ابن انشاء سے کہا۔
"پرسوں ریحانہ کا کانووکیشن ہے۔ اسے بی اے کی ڈگری مل رہی ہے۔"
"میرے ساتھ تم بھی چلنا۔ بڑا مزہ رہے گا۔"
ابن انشاء اپنی عینک کی کمانی ٹھیک کرتے ہوئے بولا۔
"کمینے! تم تو اس کے بھائی بن کر چلے جاؤ گے میں کیا بن کر جاؤں گا۔" اور میں نے ابن انشاء کو وہی گالی دی جو وہ مجھے دیا کرتا تھا۔
(اے حمید کی تصنیف
ابن انشاء یادیں، باتیں، بہار، خزاں کا ایک باب)
☆☆

باتیں ایشل فیاض سے

شاہین رشید

1۔ اصلی نام؟

''ایشل فیاض۔''

2۔ پیار کا نام؟

''ایشو۔''

3۔ تاریخ پیدائش اسال؟

''21/اکتوبر/1994۔''

4۔ قد استارہ؟

''5 فٹ 7 انچ/لبرا۔''

5۔ مادری زبان؟

''پنجابی۔''

6۔ بہن بھائی/آپ کا نمبر؟

''ہم سات بہن بھائی ہیں اور میں سب سے چھوٹی ہوں۔''

7۔ شادی/ بچے؟

''شادی نہیں ہوئی ابھی ارادہ بھی نہیں ہے۔''

8۔ تعلیم؟

''اولیول۔''

9۔ اس فیلڈ میں آمد/ گھر والوں کا ردعمل؟

''بچپن سے ہی فیلڈ میں آنے کا شوق تھا جد وجہد کی اور آگئی شروع شروع میں گھر والوں نے اعتراض کیا مگر جب ڈرامہ آیا پھر فلم آئی تو سب راضی ہوگئے اور اب تو سب کو بہت شوق ہے میرا ڈرامہ دیکھتے ہیں۔''

10۔ بچپن میں کس سے بہت ڈر لگتا تھا؟

''سمندر سے لگتا تھا اور ابھی بھی لگتا ہے۔''

11۔ پہلی کمائی کتنی تھی اور کس کے ہاتھ میں رکھی تھی؟

''پہلی کمائی بائیس ہزار تھی اور امی کے ہاتھ میں دے دی تھی۔''

12۔ بچپن کا پہلا پیار؟

''میری امی ہیں میرا پہلا پیار، اس کے بعد باقی گھر والے۔''

13۔ گھر میں کس کے ہاتھ میں ذائقہ ہے؟

''امی کے ہاتھ میں اور باقی بہن کے ہاتھ میں بھی۔''

14۔ صبح جلدی اٹھ جاتی ہیں ا آج کیا نہ ملے تو صبح نہیں ہوتی؟

''رات جلدی سوتی ہوں اس لیے صبح جلدی اٹھ جاتی ہوں اور ایسی کوئی چیز نہیں ہے۔''

15۔ کیا برداشت نہیں بھوک یا غصہ؟

''بھوک برداشت نہیں۔''

16۔ پاکستان کے لیے کیا سوچتی ہیں؟

''پاکستان سے مجھے پیار ہے کیونکہ یہ میرا ملک ہے۔''

17۔ سیاست میں کون پسند ہے؟

''سیاست میں دلچسپی نہیں ہے۔''

18۔ کس ملک کی شہریت کی خواہش ہے؟

''پاکستان سے بڑھ کر کوئی نہیں، کوئی خواہش نہیں

کسی بھی ملک شہریت کی۔''

19۔ کس چیز پر پیسا اڑا کر پچھتاتی ہیں؟

''میں پیسہ نہیں اڑاتی کسی بھی چیز پر۔ جو چاہیے ہوتا ہے امی کو کہہ دیتی ہوں۔''

20۔ میڈیا میں کیا اچھا ہے کیا برا ہے؟

''میڈیا میں سب کچھ اچھا ہے۔ برا تو کچھ بھی نہیں ہے۔''

21۔ اسپورٹس سے آپ کا لگاؤ/ کون سا کھیل پسند ہے؟

''کھیلوں کا شوق نہیں مجھے۔ لیکن کرکٹ دیکھ لیتی ہوں خاص طور پر جب پاکستان اور انڈیا کا میچ ہو رہا ہوتا ہے۔''

22۔ کس بات پر آپ کی آواز اونچی ہو جاتی ہے؟

''کسی بھی بات پر نہیں۔ غصے میں بھی میں خاموش ہو جاتی ہوں۔''

23۔ تین چیزیں جنہیں خریدنا آپ کا خواب ہے؟

''گھر یک۔ ڈھونڈ رہی ہوں جو کہ نہیں مل رہی۔''

24۔ کس کی خاطر فیلڈ چھوڑ سکتی ہیں؟''

''اپنے گھر والوں کی خاطر۔''

25۔ کون سا کام ہے جو پہلے کبھی نہیں کیا تھا اب کرنے لگی ہیں؟

''مطالعہ کرنے لگی ہوں کتابیں پڑھنے لگی ہوں۔''

26۔ تنہائی کا احساس کب ہوتا ہے؟

''اللہ کا شکر ہے کبھی نہیں۔''

27۔ گھر کی کوئی چیز خراب ہو جائے تو ٹھیک کرانے کی ذمہ دار کس کی ہوتی ہے؟

''گھر کے بڑوں کی، خاص طور پر امی کی۔''

28۔ زندگی میں کچھ واپس لینے کا چانس ملے تو کیا واپس لینا چاہیں گی؟

''پھر سے بچپن میں جانا چاہتی ہوں۔''

29۔ گھر میں آپ کے فیصلے پر کون مداخلت کرتا ہے؟

''میرے فیصلے میں نہیں...... میرے گھر والے کرتے ہیں۔''

30۔ بیمار ہونے پر بیماری کو سیریس لیتی ہیں؟

''نہیں...... کیونکہ گھر والے بہت خیال رکھتے ہیں۔''

31۔ کبھی غربت میں وقت گزارا؟

''میں ہر حال میں اللہ کی شکر گزار رہنے والی بندی ہوں۔''

''ویسے اللہ کا شکر ہے ایسا وقت نہیں دیکھا۔''

32۔ بریانی میں بوٹی نہ ملے تو؟

''تو کوئی بات نہیں۔ مجھے ہر وقت گوشت کھانا پسند بھی نہیں۔''

33۔ طالب علمی کے دور میں کون سے مضمون سے نفرت تھی؟

''نفرت تھی نہ کوئی برا لگتا تھا۔ البتہ اکاؤنٹ مجھے مشکل لگتا تھا۔''

34۔ ڈاکٹر، حکیم اور ہومیو پیتھک کس پر زیادہ یقین ہے؟
"سب ہی اچھے ہیں۔ اور جس کی دوائی سے آرام آجائے۔"
35۔ دنیا کا سب سے بورنگ کام؟
"ہر کام اگر دل سے کیا جائے تو وہ بور نہیں لگتا۔"
36۔ کیا دل سے اترا ہوا شخص پہلے جیسا مقام حاصل کر سکتا ہے؟
"میری زندگی میں تو پہلے جیسا مقام حاصل کر سکتا ہے۔ دوسروں کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔"
37۔ اپنے ہر کام کے لیے کس سے مشورہ لیتی ہیں؟
"اپنے بڑوں سے۔"
38۔ موجودہ حکومت سے مطمئن ہیں؟
"مجھے سیاست سے دلچسپی نہیں تو حکومت کے بارے میں کیا جانوں۔"
39۔ گھر کا کون سا کام کرنا پسند نہیں؟
"گھر کے سارے کام بہت دل سے کرتی ہوں۔"
40۔ غصے میں منہ سے کیا نکلتا ہے؟
"غصہ بہت کم آتا ہے اور غصے میں چپ ہو جاتی ہوں اور جب تک غصہ ٹھنڈا نہیں ہو جاتا کسی سے بات نہیں کرتی۔"
41۔ ٹی وی ٹاک شو کے بہترین اینکر؟
"مجھے کوئی آئیڈیا نہیں ہے۔ کیونکہ میں نیوز نہیں دیکھتی۔"
42۔ آپ کا رازدار کون ہے؟
"میں ایک کھلی کتاب کی طرح ہوں، میرے کوئی راز نہیں ہیں۔"
43۔ فیملی پر آپ کا کتنا رعب ہے؟
"میں گھر میں سب سے چھوٹی ہوں، اس لیے مجھے سب کی سختی پڑتی ہیں۔ خواہ وہ والدین ہوں یا بہن بھائی۔"
44۔ کون سی تاریخیں یاد رکھتی ہیں؟
"مجھے تاریخیں یاد نہیں رہتی اس معاملے میں بہت بری ہوں۔"
45۔ ایک کھانا جو ہمیشہ کھا سکتی ہیں؟
"بالکل۔۔۔ اور میں گھر میں رکھے کھانے دوبارہ بھی کھا سکتی ہوں۔"
46۔ کیا اپنے پروگرام بار بار دیکھتی ہیں؟
"نہیں۔۔۔۔ دیکھتی۔"
47۔ اپنے ڈرامہ دیکھ کر کیا محسوس کرتی ہیں؟
"کچھ بھی نہیں۔"
48۔ ایک غلطی جس پر کبھی معافی نہیں مانگی؟
"معافی مانگنے سے کوئی چھوٹا بڑا نہیں ہو جاتا۔ اور میں تو مانگ لوں معافی اگر میں نے کچھ غلط کیا ہو۔"
49۔ پہلی فلم جو سینما میں دیکھی؟
"میری اپنی فلم کاف کنگنا۔"
50۔ بچپن میں کس وجہ سے مار کھائی تھی؟
"بہت ساری وجوہات تھیں۔ جیسے ٹائم پر کھانا نہ کھانا وغیرہ۔"
51۔ کون سا رول کرنے کی خواہش ہے؟
"اللہ کا شکر ہے جو رول ملتا ہے بہت اچھا ہوتا ہے اور میں بہت لکی ہوں کہ مجھے ہمیشہ اپنے لیڈ رول ہی ملے ہیں۔"
52۔ ایک گانا جو اکثر گنگناتی ہیں؟
"نہ گانے سنتی ہوں اور نہ ہی گنگناتی ہوں۔"
53۔ کس رول کو کرنے سے انکار کیا؟
"بہت بولڈ کام نہیں کر سکتی۔"
54۔ کس سیاست دان کا رول کرنے کی خواہش ہے؟
"میں سیاست دانوں کے بارے میں نہیں جانتی۔"
55۔ چاند پر پہنچ کر دنیا میں پہلا پتھر کس کو ماریں گی؟
"سوچنا پڑے گا۔"
56۔ علم نجوم پر کتنا یقین ہے؟ کبھی نجومی کو ہاتھ دکھایا؟
"نہیں کبھی نہیں دکھایا کیونکہ مجھے اپنے اللہ پر یقین ہے۔"
57۔ کس کام کو کرنے کے لیے بہت سوچتی ہیں؟
"کسی کام کے لیے بھی نہیں۔"
58۔ کب جھوٹ کا سہارا لیتی ہیں؟
"نہ نہ۔۔۔۔ میں جھوٹ نہیں بولتی۔"
59۔ تقریب میں شرکت کے کس کی مرضی سے تیار ہوتی ہیں؟
"گھر والوں کی مرضی سے۔"
60۔ ادھار کس سے بلا جھجک مانگ لیتی ہیں؟
"بڑی بہن سے، بڑے بھائی سے اور ابو سے۔"
61۔ آپ کے اب تک کے ڈراموں، فلموں اور کمرشلز کی تعداد؟
"ڈرامے کتنے ہیں، کچھ پتا نہیں نہ ہی میں نے گنے ہیں۔ کافی کر لیے ہیں اور آگے بھی کرنے ہیں۔"
62۔ رول کون سے اچھے لگتے ہیں نگیٹو یا پوزیٹو؟
"دونوں اچھے لگتے ہیں۔ نگیٹو کے بھی اپنے مزے ہیں لوگ عجیب نظروں سے دیکھتے ہیں اور پوزیٹو سے محبت ملتی ہے۔"
63۔ کوئی فیصلہ جو غلط ثابت ہوا ہو؟
"میں اپنے فیصلے خود نہیں کرتی، گھر والوں کے مشورے سے سارے کام کرتی ہوں۔"
64۔ کچن سے لگاؤ ہے؟ کبھی شیف بننے کی خواہش ہوئی؟
"جی بالکل ہے۔ پاستا، چکن کڑاہی وغیرہ سب بنا لیتی ہوں اور جو دل چاہتا ہے بنا لیتی ہوں انہیں شیف بننے کی کوئی خواہش نہیں تھی۔"
65۔ کبھی سوچا کہ اگر سوشل میڈیا نہ ہوتا تو؟
"سوشل میڈیا کے بہت سارے فائدے بھی ہیں اور نقصان بھی۔ بس یہ آپ پر منحصر ہے کہ اسے کس طرح لے کر چلیں گے۔"
66۔ کس شخص پر چاہتے ہوئے بھی غصہ نہیں کر سکتیں؟
"میں کسی پر بھی غصہ نہیں کرتی۔ اور مجھے غصہ آتا بھی کم ہے۔ میں ویسے بھی غصے میں خاموش ہو جاتی ہوں اور کسی سے بات نہیں کرتی۔"
67۔ شکل بدلنے کا موقع ملے تو کس کی طرح نظر آنا چاہیں گی؟
"اللہ نے سب کو اس کے حساب سے بنایا ہے اور اللہ کا لاکھ لاکھ شکر کرتی ہوں کہ اس نے مجھے بہت اچھی شکل دی ہے۔"
68۔ ایک نصیحت جو اپنی ہم عمر کو کرنا چاہیں گی؟
"کچھ بھی نہیں سوائے اس کے کام کریں اپنے بڑوں کی بات مانیں۔"
69۔ ملک کی ترقی کی راہ میں کون رکاوٹ ہے عوام یا حکمران؟
"مجھے بالکل بھی سیاست کی کچھ نہیں ہے دلچسپی بھی نہیں ہے اس لیے کوئی آئیڈیا بھی نہیں ہے۔"
70۔ اپنا فیوچر کیسا دیکھتی ہیں؟
"فیوچر کے بارے میں تو صرف اللہ ہی جانتا ہے۔"
71۔ سگنل پر کھڑے ہو کر کن چیزوں کا جائزہ لیتی ہیں؟
"کہ ہم کتنے خوش قسمت ہیں کہ تمام نعمتیں ملی ہوئی ہیں۔ یہ احساس فقیروں کو دیکھ کر ہوتا ہے۔"
72۔ بچپن میں کون سے فنکار پسند تھے؟
"ریما جی۔"
73۔ خواتین رائٹرز میں آپ کی پسندیدہ رائٹر؟
"سب ہی اچھی ہیں۔ کسی ایک کا کیا نام لوں۔"
74۔ بچپن میں کون کون سے گیمز کھیلے؟
"استاد شاگرد والے گیمز زیادہ شوق سے کھیلے۔"
75۔ شاپنگ کے وقت کس کا خیال آتا ہے؟
"امی کا۔۔۔ پھر ان کے لیے ضرور شاپنگ کرتی ہوں۔"
76۔ اپنی تعریف سن کر کیسا لگتا ہے؟
"بہت اچھا لگتا ہے تعریف کس کو بری لگتی ہے۔"
77۔ کبھی چھپ چھپ کر دوسروں کی باتیں سنی؟
"نہیں کبھی نہیں۔"

78۔ اپنی کمائی کس چیز پر خرچ کرتی ہیں؟
"گھر والوں کو دے دیتی ہوں۔"
79۔ کس طرح کے کام کرتے مشکل لگتے ہیں؟
"کوئی کام بھی مشکل نہیں اگر دل سے کیا جائے تو"
80۔ یوٹیوب میں آپ کا پسندیدہ چینل؟
"میں یوٹیوب کے چینلز تو نہیں کرتی۔"
81۔ کیا آپ کے اندر بھی ایک ولن ہے؟
"پتا نہیں..... میں نے بھی غور نہیں کیا، لیکن کوشش ہوتی ہے کہ کسی کا دل نہ دکھاؤں۔"
82۔ بچت کس شکل میں کرتی ہیں؟
"میری ساری کمائی اور میرے چیک امی کے ہاتھ میں جاتے ہیں وہ ہی بچت کرتی ہوں گی۔"
83۔ شادی میں کن رسموں کے خلاف ہیں؟
"میں نے بھی غور نہیں کیا اور پھر جس کا جو دل چاہے کرے ویسے اسلامی پوائنٹ آف ویو سے ہی رسمیں ادا کرنی چاہئیں۔"
84۔ کون سا کھانا مجبوراً کھاتی ہیں؟
"ہمارے گھر میں دیسی کھانا پکتا ہے اور ہم وہی کھاتے ہیں کوئی نخرے نہیں کرتا۔ کبھی کبھی ایک ہی کھانا دو تین بار بھی کھانا پڑتا ہے تو کھالیتے ہیں۔"
85۔ آپ کے موبائل پر صبح سویرے پہلا میسج کس کا آتا ہے؟
"آج کل تو صبح سویرے شوٹس والوں کے اور پروڈکشن والوں کے ہی میسج آئے ہوتے ہیں۔"
86۔ صبح سویرے کیا بات لبوں سے نکلتی ہے؟
"کوئی خاص نہیں، اپنا فون چیک کرتی ہوں، میسج وغیرہ دیکھتی ہوں۔ اور ہاں سب سے پہلے اللہ کا شکر ادا کرتی ہوں۔"
87۔ فیملی میں کون مزاج کا گرم ہے؟
"کوئی بھی نہیں کہ جس کو بہت زیادہ غصہ آتا ہے۔"
88۔ آپ کی کس بات سے آپ کے والدین ناراض ہوجاتے ہیں؟
"کوشش تو یہی ہوتی ہے کہ ناراض نہ کروں..... اور ایسی کوئی بات ہوتی بھی نہیں ہے۔"

89۔ آپ کے علاوہ آپ کی فیملی سے کون اس فیلڈ میں ہے؟
"کوئی نہیں۔"
90۔ بچپن کا کون سا خواب پورا نہیں ہوا؟
"اللہ کا شکر ہے کہ ابھی تک تو سارے خواب پورے ہو رہے ہیں آگے کا کچھ نہیں کہہ سکتی۔"
91۔ پسندیدہ تہوار؟
"ہر طرح کے تہوار اچھے لگتے ہیں پر عید زیادہ اچھی لگتی ہے۔"
92۔ پسندیدہ جانور؟
"مجھے جانوروں سے بہت ڈر لگتا ہے۔ اس لیے کوئی پسندیدہ نہیں ہے۔"
93۔ کن باتوں سے موڈ خراب ہوجاتا ہے؟
"کسی کی باتوں سے میں اپنا موڈ خراب نہیں کرتی۔"
94۔ کیا چیز نشے کی حد تک پسند ہے؟
"کوئی بھی چیز نشے کی حد تک پسند نہیں ہے۔"
95۔ مہینے میں کتنی بار گھر سے باہر کھانا کھاتی ہیں؟
"عموماً نہیں کھاتی۔ کیونکہ امی منع کرتی ہیں اور ویسے بھی باہر کے کھانے سے میرا پیٹ ڈسٹرب ہوجاتا ہے۔"
96۔ بجلی کی بچت کس طرح کی جاسکتی ہے؟
"کوئی آئیڈیا نہیں، لیکن جہاں آپ بیٹھے ہیں وہیں کی بجلی آن رکھیں باقی بند کردیں۔"
97۔ کھانا کھانے کا مزہ کہاں ہے بیڈ پر، چٹائی پر یا ڈائننگ ٹیبل پر؟
"ہمارے گھر میں ہمیں اجازت ہی نہیں ہے کہ بیڈ پر بیٹھ کر کھانا کھائیں۔ ڈائننگ ٹیبل پر سب کے ساتھ مل کر کھانا کھاتے ہیں۔"
98۔ گھر میں کس کے لیے اپنا شیڈول بدل سکتی ہیں؟
"سب کے لیے ہی۔"
99۔ اچھی بری خبر سب سے پہلے کس کو سناتی ہیں؟ "کبھی ایسا تجربہ نہیں ہوا۔"

☆☆

اترا میرے آنگن میں نئے سال کا سورج
یاد آئے عہد گزشتہ کے فسانے کتنے

وقت کے سمندر میں ایک اور سال کا اضافہ 22 رخصت ہو چکا ہے۔ ایک اور نیا سال ہمارے سواگت کو کھڑا ہے۔

ہر طلوع ہونے والا سورج اپنے ساتھ نئے خواب لے کر آتا ہے۔ سال گزشتہ کے بہت سے دکھ اور پچھتاوے بھی یاد آتے ہیں۔ وقت ہاتھ سے نکل جانے کا احساس دل کو کچوکے دیتا ہے، پھر ان یادوں کو ذہن سے جھٹک کر ہم نئے سال کے لیے ارادے باندھتے ہیں، خود سے عہد و پیماں کرتے ہیں۔

نئے سال کے آغاز پر ہم نے اپنی قارئین سے اسی حوالے سے سوالات کیے ہیں۔ آیئے دیکھتے ہیں ہماری قارئین نے کیا جواب دیے ہیں۔

سوالات یہ ہیں

س 1۔ خواتین اور شعاع میں آپ نے بے شمار ناول، ناولٹ پڑھے ہوں گے کس مصنفہ کی کون سی ہیروئن آپ کو بہت اچھی لگی اور کس ہیروئن کو پڑھ کر آپ کو ایسا لگا کہ "ارے یہ تو میں ہوں۔"

س 2۔ نئے سال کے لیے آپ نے کیا ارادے باندھے ہیں کیا کرنا چاہتی ہیں، نئے سال سے آپ کی کیا توقعات ہیں؟

س 3۔ کیا آپ اپنی زندگی سے مطمئن ہیں؟ زندگی میں کیا کمی محسوس ہوتی ہے۔ زندگی میں کیا تبدیلی چاہتی ہیں۔

نئے سال کا سورج

آدکرہ

رمشا روشن، الہ آباد

تمام قارئین کو سال نو مبارک ہو اور ادارہ کے اسٹاف کو بھی۔

1۔ نمرہ احمد اس سال خواتین ڈائجسٹ میں "ملا" کے ساتھ موجود رہیں۔ عمیرہ احمد کی حسین موتیا، سمیرا حمید کی شوخ سی چراغ، نمرہ احمد کی سمجھدار کشمالہ ہر ہیروئن پسند رہی ہے۔ راحت جبیں کی خوددار اور محنتی نرمین بھی قابل تحسین ہیروئن تھی۔ چراغ کی شوخیاں شرارتیں ہم دونوں بہنوں نے بہت ڈسکس کیں۔ کشمالہ کی سمجھداری اور ذہانت کے قصے اپنی بہن کے گوش گزار کیے اور موتیا کی خوبصورتی اور سادگی کے، جہاں تک اپنے جیسا لگنے کی بات ہے تو کشمالہ کی کیریر بنانے کی سوچ کی طرح میری بھی سوچ ہے اپنا کیریر بنانے کی۔ مائنڈ سیٹ اسٹرونگ ہونے کی اپنی کمائی جب اپنے ہاتھ میں آتی ہے تو کتنا سکون اور خوشی ہوتی ہوگی۔

کسی کا دل دکھانا اچھا نہیں لگتا حساسیت جب کوئی دھوکا دے تو دوبارہ اس پر اعتبار کرنا نہیں آتا یہ عادتیں مجھ میں کشمالہ سے مشترک ہیں۔ اور پھوہڑ پن میں تو حنا بشریٰ کے ناولٹ "بکھی" کی کشف سے بھی چار ہاتھ آگے ہی ہوں گی..... ہاہا۔

2۔ نئے سال میں صوم و صلوٰۃ کا پابند رہنا ہے۔ ان شاء اللہ لکھنے لکھانے کا کام جاری رکھنا ہے۔ مطالعہ کرنا ہے ڈھیر سارا یعنی کمرے کو لائبریری ہی بنالینا ہے (سوچنے میں کون سے پیسے لگتے ہیں..... ہاہا)۔ اپنی خامیوں پر قابو پانا ہے ان شاء اللہ۔ خصوصاً

زیادہ بولنے پر کنٹرول کرنا ہے اور بھی ڈھیر سارے ارادے کرنے ہیں۔ (فارغ ہو کر بیٹھ کر سوچوں گی کہ کون کون سے کرنے ہیں..... ہاہاہا) نئے سال سے توقع کرتی ہوں کہ خوشبو کی نوید بن کر ہم سب کے لیے اپنی جھولی میں خوشیاں، امید و روشنی کے جگنو بھر کر لائے۔

3۔ جی بالکل! بالکل مطمئن اور پرسکون ہیں ہم اپنی لائف میں کسی تبدیلی کے خواہاں نہیں ہیں (خواہش نہ ہونے کے باوجود شادی کی صورت تبدیلی لائی جارہی ہے۔ جس کے لیے دعا ہے کہ یہ فیصلہ، یہ تبدیلی خوش آئند ثابت ہو (آمین)) بس آپ کی دعاؤں اور محبتوں کی ضرورت ہے۔

(ہماری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں درشنا)

سلمٰی مسرت، راولپنڈی

1۔ بے شمار تحریریں ہیں جن کو پڑھ کر خیال آیا کہ یہ میں لکھنا چاہتی تھی؟ یہ میں ہوں؟ لیکن زیادہ نہیں لکھوں گی کیوں کہ مجھے قطعاً خود نمائی پسند نہیں لیکن جواب دینا ضروری ہے، میں بیچ میں بہت جھجک رہی ہوں بہر حال سائرہ رضا کا سرسوں کا پھول کی ہیروئن بالکل میری کاپی ہے۔

نمرہ کے (مصحف) میں بے شمار جھلکیاں ہیں، جنت کے پتے کی ہیروئن میں مکمل میرا عکس، جہل کے کردار سعدی کی سوچیں، باتیں میرا آئیڈیل اور رقص شرر موسیقی پر تحریر لکھنا میرا ارمان تھا اس موضوع پر کوئی نہیں لکھتا زبردست ناول تھا۔

عمیرہ احمد کے ناول نام تھا دوسرا آسمان درست نام نہیں آرہا ان دنوں میرے حالات بہت گردش میں تھے۔ میں بار بار حوصلہ کھو رہی تھی اس تحریر نے مجھے ٹوٹنے سے بچالیا، اتنی کی لاابالی بلندیوں کی چھوتی ہوئی لڑکی مکمل زمین پر لگ گئی۔

زندگی کا سب سے بڑا فیصلہ ایک ناولٹ یا ناول جو (نسیم سحر قریشی) کا تھا اپنے اللہ اور والدین کے آگے جھک کر کیا جو میرے جیسی لڑکی کے لیے بہت مشکل تھا میری گفتگو سوچوں پر اور اخلاق کردار پران تحریروں کے احسانات ہیں۔ ہاں دنیا ہے اور اس کے مجھ سے دور ہو کر رب سے دوستی کی 15 تیس سال قرآن کو دیے آج میرا روشن قلب سلیم میں والدہ اور قرآن کے بعد عمیرہ اور نمرہ کا ہاتھ ہے

2۔ نئے سال کے لیے اپنے وطن اور ہم وطنوں کے لیے اللہ کے گھر میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے شہر میں ڈھیروں دعائیں مانگی ہیں پہلی بار بیرون ملک گئی۔ اتنی فرصت ملی۔ لوگوں سے مل کر مشاہدے سے ثابت ہوا میرے پاکستان جیسا کوئی نہیں۔ اس سال ان شاء اللہ اپنے دین کو (درس و تدریس) زیادہ وقت دینا ہے۔

3۔ الحمدللہ بہت مطمئن پرسکون ہوں میری ہر سانس فلک الحمد و لک شکر۔

کی صرف شکر کی ہے صبر کیا ہے میرا مطلب ہے میرے معاشرے میں برداشت کی شدید کمی ہے۔ نعمتوں کے ڈھیر پر بیٹھ کر مسلسل ناشکری شکوہ اور رشتوں کی بے حسی ہے۔ وقت کی شدید بے برکتی کیوں ہے، برکت والے وقت پر سب سوتے ہیں بجے راتیں گزارتے ہیں دن بنا کر غیر فطری زندگی میں کس کو سکون ملے گا۔

زرینہ خانم انصاری، مظفر گڑھ

1۔ کئی عشرے ہو گئے خواتین، شعاع، کرن پڑھتے ہوئے کئی تحریریں دل کو چھو گئیں۔ مصنفین تو تقریباً تمام ہی اچھا لکھتی ہیں لیکن مجھے رخ چوہدری بہت پسند تھیں میری پسندیدہ ترین مصنفہ ممتاز عرفان تھیں وہ جب تک لکھتی رہیں۔ میں سب سے پہلے ان کی کہانی پڑھتی تھی اللہ انہیں خوش رکھے نجانے اب وہ کہاں چھپ گئی ہیں۔ ہیروئن بھی کئی اچھی لگیں صابرہ۔ شاکر قسم کی ہیروئن دل کو بھاتی ہیں، پرانے رسالے کھنگالنے پڑیں گے لیکن وہ بھی اکثر بانٹ دیتی ہوں کسی کا بھلا ہو جائے۔

ایک افسانہ پڑھا تھا اب یاد نہیں، کس رسالے میں تھا عنوان بھی بھول گیا ہے۔ اس میں ایک خاتون کو کچھ موبائل کا کوئی پروسیجر سمجھ میں نہیں آتا تھا بس وہ فون سن اور کر سکتی تھیں انہیں ڈیلیٹ کرنا آتا نہ ہی کسی کا فون بند ہو کر بچ کر سکتیں کہ کس کا ہے تب میں نے کہا، او ہو یہ تو میں ہوں میری بھی صرف فون کرنے اور سننے تک معلومات محدود ہیں۔

2۔ نئے سال کے کیا ارادے باندھے جائیں، ہونا تو وہی ہے جو اللہ تعالیٰ چاہتا ہے ہم یونس پر بھیجنے والے لوگ کیا ارادے باندھیں سوچا ہے زیادہ سے زیادہ عبادت کرنی ہے اللہ و رسول کریم ایک دفعہ پھر اپنا گھر دکھا دے لیکن جو مہنگائی ہے مشکل نظر آتا ہے امید تو اچھی رکھنی چاہیے۔ آگے اللہ مالک ہے۔

3۔ الحمدللہ ثم الحمدللہ میں اپنی زندگی سے بہت مطمئن ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے ہزاروں نعمتوں سے نوازا ہے۔ انسان پیدا کیا۔ مسلمان پیدا کیا۔ بے عیب پیدا کیا۔ اچھے کھاتے پیتے گھر میں پیدا کیا۔ تعلیم حاصل ہوئی۔ باعزت ملازمت کی اب پنشن ملتی ہے۔ کسی چیز کی کمی نہیں۔ اپنے بھتیجے کے گھر بیٹی بیٹے کے گھر ٹھاٹ سے رہتی ہوں بھابھی بہت اچھی ہیں، بھتیجے کی دلہن پلنگ پر کھانا دیتی ہے، بھتیجے کا ایک ننھا سا دو سال کا گول مٹول سا خوبصورت بیٹا ہے، وہ میرے دل کی ٹھنڈک ہے۔ بس ایک ہی زندگی کی غم رہی کہ رب تعالیٰ نے اولاد کی نعمت نہیں دی لیکن مجھے اللہ سے کوئی شکوہ نہیں۔ پانچ میرے بھانجے ہیں ایک بھتیجا ہے، میں کہتی ہوں۔ میرے چھ بیٹے ہیں۔ مجھے کسی چیز کی کمی نہیں، بہترین گزارا ہو رہا ہے کوئی تبدیلی نہیں چاہتی اب اللہ تعالیٰ سے ایک دعا ہے۔ خاتمہ ایمان پر کرے۔

نجمہ جبار، بہاولپور

1۔ حسب معمول سروے کے سوالات بہت دلچسپ ہیں ہمیشہ کی طرح خاص کر پہلا سوال اور مجھے ہنسی آرہی ہے اب کیا اور کیسے بتاؤں اپنی ہی تعریف کروں۔

ہاہاہا۔ میں ذاتی طور پر کافی بزلہ سنج ہوں۔

چھوٹی چھوٹی خوشیوں کو منانا۔ بولنا ملنا ملانا مجھے بہت پسند ہے۔ خاموشی میری طبیعت میں نہیں زیادہ اتنے عرصے سے شعاع وخواتین پڑھ رہی ہوں تو کتنے ہی کردار ہیں جن کو پڑھ کر کہا یہ میں ہوں جی ہاں 1997 کا آپ کے ادارے کے "کرن" میں آنے والے طویل سلسلے وار "رنگ خوشبو ہوا بادل" جو کہ افشاں آفریدی نے لکھا تھا اور یہ میری پسندیدہ بھی ہیں۔ اس ناول کی ہیرو کو پڑھ کر لگا کہ یہ میں ہوں۔ اسی طرح افشاں آفریدی کے ناول "میرا سارا، رنگ اتار دو" کی شیریں کو پڑھ کر بھی یہ ہی لگا" آسیہ رئیس خان کے شعاع کے ناول "ہو کر مجبور" کی ہیروئن بھی مجھے میں ہی لگی۔ شعاع وخواتین میں ہی ناول پڑھا تھا جس میں تین گنجے بھائی ہوتے ہیں (نعیمہ ناز کا ناول) اس ناول کی مزاحیہ ہیروئن کو پڑھ کر بھی لگا یہ میں ہوں۔ اور بھی بہت سے کردار ہیں جن کو پڑھ کر یہ ہی لگا مگر اب سب کا ذکر کیا تو صرف میرے سوالات کی جگہ بچے گی۔

شعاع اور خواتین نے ہمیں متوازن زندگی کو گزارنے کے لیے اتنے سالوں تک اتنا کچھ سکھایا۔ ہر معاملے میں دینی ہو یا دنیاوی، اخلاقی ہو یا روحانی۔

2۔ گزشتہ سال چینل کا کام کرنا ناول پڑھنا اور پھر اس پر اتنی سخت محنت کرنا اور آخر میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے کامیابی ملنا میرے لیے بہت بڑے اعزاز کی بات ہے اور میری اس کامیابی میں میرے ملک کی مایہ ناز رائٹرز کا بہت بڑا ہاتھ ہے جنہوں نے نہایت کھلے دل سے مجھے اپنے چینل پر ناول پڑھنے کی اجازت دی۔

ذاتی حوالے سے گزشتہ سال کامیابیوں کا سال قرار دیا جا سکتا ہے۔

نئے سال میں اپنی شاعری کو ترتیب کے ساتھ اپنی فیس بک پیج پر لگانے کا ارادہ ہے۔ ایک ناول بھی لکھ رہی ہوں ان شاء اللہ وہ بھی نئے سال کسی بھی شمارے میں لگ جائے گا۔ نئے سال سے مجھے ڈھیر ساری توقعات ہیں جن میں سب سے پہلی جو توقع ہے کہ ہمارا ملک امن کا گہوارہ بن جائے۔ اللہ پاک میرے بچوں کو کامیاب فرمائے۔

3۔ جی جی بالکل الحمدللہ میں اپنی زندگی سے مطمئن ہوں۔ اللہ پاک نے ہر نعمت سے نواز رکھا ہے گھر جیسا سکھ، محرم کی محبت اور اولاد جیسی نعمت دے کر اللہ نے میرا دامن خوشیوں سے بھر دیا ہے۔ زندگی میں جو کمی محسوس ہوتی ہے، وہ ہے میرے ابو جان کی ابدی جدائی، یہ کمی ایسی ہے کہ بیان نہیں کی جا سکتی کس کس لمحے میں ان کی یاد نہیں آتی۔ اللہ پاک انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے آمین۔

تبدیلی نہیں چاہتی جیسی میں زندگی گزار رہی ہوں، وہ اللہ کی منشا کے مطابق ہے۔ بچے بھی گھر کا کام کرتے ہیں اور ساس بھی ساتھ اور میرا دن پڑھنے لکھنے میں گزرتا ہے جتنی تمام رسالے اور ساتھ جس یہ تمام جو کہ مجھے بہت پسند ہے اور تمام رسائل میں شرکت کرنا شاعری اور لکھنا ساتھ درس تدریس کے شعبے سے وابستگی بھی ہے اور شادی سے پہلے بس یہ ہی حسرت تھی کہ کچھ ایسا ہو کہ بعد میں بھی پڑھتی رہوں اور ایسا ہی ہوا کہ میرے خاندان والے مجھے ہر طرح سے سپورٹ کرتے ہیں۔

سونیا ربانی، قاضیاں محلہ بالا

1۔ ہاں جی شعاع اور خواتین کو دوبارہ میری زندگی میں آئے سال ہونے کو ہے اور اس عرصے میں بہت ساری کہانیاں نظروں سے گزری ہیں مگر مسئلہ یہ ہے کہ اب پہلے والی بات نہیں رہی (مطلب کچھ بھی یاد نہیں رہتا ہے)

مگر پھر بھی شعاع میں پڑھی۔ تحریری عمرالیرا، حسنہ حسین کی۔ یہ ناول آدھا ہی پڑھ سکی مطلب کے درمیان سے شروع کیا تھا ناں! پھر بھی یہ ناول دل کے بہت قریب رہا جب جنت اپنے ابا کے آنگن میں گھوم رہی تھی۔ تب مجھے اس میں اپنی جھلک نظر آئی۔

اور دوسرا ناول فرزانہ کھرل کا ہم اور بلبلیں (جو کچھ لڑکیوں کو سمجھ میں ہی نہیں آیا) مجھے اس ناول کی بدرا بہت بہت اچھی لگی اور اس سے زیادہ عون اچھا لگا۔ کیونکہ عون کی اور میری سوچ ایک جیسی لگی تھی۔ فرزانہ کے اصول لفظ (وہ وقت بھی آ گیا بالآخر اس نے جان لیا دنیا میں کچھ آخری بھی ہوتا ہے' آخری بار' آخری نظر' آخری قدم' آخر کار وہ ہنسنا سیکھ ہی جائے گی' آخر کار' آخر کار)

یا پھر (تم نے جھوٹ بولا تھا تم نے نمک سے بنی صراحی کو بارش میں نہیں رکھا تھا)

(اسے دولت' طاقت اور شہرت نے چھوا تک نہیں تھا پھر بھی وہ ایک عروج کی زد میں آ گئی تھی) اور جی ایسا عروج مجھے بھی ملا تھا۔ مجھے بدرا میں بھی سونی نظر آئی تھی۔

2۔ میں کبھی بھی ارادے نہیں باندھتی ہوں ہاں کچھ خواب اور آرزو کہہ سکتے ہیں میری آرزو ہے کہ اس سال میں بہت سارا لکھوں' سکوں' کاش میں بالکل ٹھیک ہو جاؤں' مجھے سے حال کوئی دورہ نہ پڑے اور دعا ہے کہ اللہ میرے میاں کی کمائی میں برکت ڈالے۔ پیسے بچانا چاہتی ہوں۔ مجھے اپنے بچوں کا گھر بنانا ہے اور نئے سال سے اچھی توقعات ہیں کہ اب کچھ برا نہیں ہوگا۔

3۔ جی اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے جو دیا بہت اچھا دیا' اور جو نہ مل سکا اس میں بھی بہتری تھی اس لیے مطمئن ہوں اور زندگی میں کوئی کمی نہیں ہے مگر پھر بھی کبھی کبھار ماضی دل پہ دستک دیتا ہے تو بہت سارے چہرے نظر آتے ہیں جو دنیا کی بھیڑ میں کھو گئے۔ گزرے جواب کوئی کہاں تو کوئی کہاں جا بسا ہے۔

کبھی کبھار اپنا گاؤں بہت یاد آتا ہے پھر نائلہ لطیف بھی شدت سے یاد آتی ہے۔ (اس کے بعد مجھے ہمیشہ ایک دوست کی کمی محسوس ہوتی ہے) وہ نائلہ اقبال بن کر بہت بڑی ہو گئی ہے اور بہت کچھ فراموش بھی کر چکی ہے پرانے دوست بھی۔

بس کبھی کبھی کسی کندھے کی کمی محسوس ہوتی ہے

کہ وہ کند ھا مجھے کبھی مل نہ سکا جس پر سر رکھ کر دو چار آنسو بہا سکوں (ویسے جب لوکل سفر کے جہلم ڈاکٹرز کے پاس جاتی ہوں نا!) تب یٰسین صاحب بھی یاد آتے ہیں کمی کی محسوس ہوتی ہے اور جب بھی بازار میں اور سے کو اٹھا کر چلنا پڑتا ہے ناں تب بھی اس شخص کی کمی محسوس ہوتی ہے جو اشو کے پایا جی ہیں اور اب دبئی میں بیٹھے ہیں۔

جو ہوں جیسی ہوں اچھی ہوں اپنے لیے بھی اور سب کے لیے بھی۔ اب کوئی تبدیلی نہیں چاہتی ہوں اصل میں دس برس پہلے میں بالکل اچانک بدل گئی تھی اور یہ تبدیلی ایسی تھی میں سب کی ہو گئی۔ سب کے لیے بہت ہی اچھی، اچھی دوست، اچھی بیٹی، بہن، بیوی، بہو اور پھر ایک اچھی ماں بھی۔ جب محبت دل میں گھر کر لے ناں! پھر دل موم بن جاتا ہے سب کے لیے پھر بندہ ہر کسی کے لیے آسانیاں پیدا کرنے لگ جاتا ہے سو میں بہت اچھی ہوں اب تبدیل نہیں ہونا۔

ثریا یاسین موگلہ، ضلع تلہ گنگ

1۔ خواتین اور شعاع کے ساتھ رشتہ بہت پرانا ہے بے شمار ناول ناولٹ اور افسانے پڑھے ہر سنجیدہ شوخ و چنچل ہیروئن اور روتی بسورتی ہیروئن میں ہلکی ہلکی اپنی جھلک دکھائی دیتی ہے مگر ایک افسانہ "چاند میرے آنگن میں" کی ہیروئن "سعدیہ" میں اپنی جھلک تھی۔ جس کو دادی نے سلیقہ مند بنا دیا مگر مجھے حالات نے سلیقہ سکھا دیا۔ "حساب ابھی باقی ہے" کی ہیروئن کا نام یاد نہیں مگر اس کے صبر وتحمل نے مجھے صبر کی ایسی مثال سمجھائی کہ خود پہ حیرت ہوئی کہ کس طرح صبر کر پائی۔ سب سے زیادہ "تحمل" کی "فضیلت" کی طرح ہوں۔ کہ حاضر جواب بھی سست تو بھی مگر کبھی پھوہڑ تو کبھی ایسا سلیقہ کہ کوئی حد نہیں مذہب سے لگاؤ ہے۔

2۔ سب سے پہلے تو اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ملک عزیز پر اپنا خصوصی کرم فرمائے۔ میں ہر سال کی ابتدا کے ساتھ خود سے عہد کرتی ہوں کہ اپنی کسی بد عادت سے نجات حاصل کروں گی 2022 میں میرا ہدف جھوٹ سے نجات تھی۔ الحمد اللہ کامیاب رہی۔ اس سال دو باتوں کا ارادہ ہے ایک غیبت سے بچاؤ اور دوسرا نماز قضا نہیں کروں گی۔ ایک شدید ترین خواہش ہے کہ اللہ تعالیٰ حج یا عمرے کی سعادت نصیب کرے۔

3۔ الحمد للہ۔ میرے رب کریم نے ہر نعمت سے نواز رکھا ہے میں اپنی زندگی سے بہت مطمئن ہوں بس ماں کی کمی رلا دیتی ہے، امی کو جدا ہوئے 15 برس ہو گئے ہیں۔ دل کرتا ہے کبھی گلے لگ کے اپنی پیاس بجھا لوں 2022 نے مجھ سے میری بہت ہی عزیز دوست ارم چھین لی جس کی کمی قدم قدم پر محسوس ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے میرے اندر قناعت کا مادہ بہت رکھا ہے کہ میں تھوڑے پر بھی شاکر ہوں شاید اسی لیے میرا رب مجھے میری اوقات سے بڑھ کر نوازتا ہے میں صرف اپنے غصے پر قابو پانا چاہتی ہوں میرے غصے کی وجہ سے بچے بھی چیختے ہیں۔ میں یہ عادت ختم کرتی ہے ان شاء اللہ۔

ربیعہ نسرین، ماڈل ٹاؤن لاہور

میں "خواتین ڈائجسٹ" اور "شعاع" کی ابتدائی قارئین میں سے ہوں، چند شمارے جو کبھی کبھار ناغہ ہو گئے ہوں گے، وہ ہم نے بعد میں پڑھ لیے کبھی ایسا بھی ہوا کہ کہانی پڑھ کر احساس ہوا کہ یہ ہمارے ارد گرد کی تصویریں ہیں اور کبھی سوچا کہ کیوں نہ اپنی زندگی کو اس ڈگر پر چلنے سے روکا جائے۔

نمرہ احمد کے تقریباً تمام ناول میرے پاس رسالوں اور پھر کتابی شکل میں موجود ہیں مثلاً جنت کے پتے، "نمل"، "مصحف"، "حالم"، "قراقرم کا تاج محل" جب قسط وار چھپنا شروع ہوا تو بچیوں میں بہت مقبول ہوا سردیوں کے دن تھے لاہور کالج برائے خواتین (اب یونی ورسٹی) کے گھاس کے میدان میں دھوپ سینکتی طالبات میں گپ شپ چل رہی تھی کہ کسی لڑکی نے کہا۔

"ایسا بے کار ناول ہے حقیقت سے دور، بھلا کس کے ماں باپ کا دماغ خراب ہے کہ پندرہ سولہ ہزار خرچ کر کے بیٹی کو سیر سپاٹا کرنے بھیجیں ایسے نزدیں اور نادر خیالات صرف افسانوی دنیا میں ہی ممکن ہوتے ہیں کہ پیسے خرچ کے بغیر سیر و تفریح ہو سکے۔"

دوسرے نزدیکی گروپ میں بیٹھی ماریہ خان نے لمبا سا ہاتھ کھڑا کیا "میری بے وقوف اور شاید احمق اماں نے مجھے ٹرپ کروایا ہے۔"

"شور تھم گیا" چند لمحے خاموشی کے در آئے اور پھر سوالات کی بوچھاڑ۔ باقی سب تو وہی ہے جو ناول میں لکھا ہے بس مجھے بھی ایک ہی افسوس ہے کہ اصلی ٹرپ میں کوئی ہیرو نہیں ملا"

2۔ چند سال گزرے، ایک دن مال روڈ پر جانے کا اتفاق ہوا انارکلی جانے والی سڑک کے باہر ایک معمر کتب فروش اپنی کتابیں سجائے بیٹھا تھا۔ بیشتر کتب انگریزی کی تھیں لیکن سب سے اوپر قراقرم کا تاج محل چمکا رہا تھا۔ قراقرم کی تصویر اس قدر خوبصورت تھی کہ میں نے فوراً خرید لیا۔ گھر آئی تو ڈاکٹر زینب نے فرمایا ناحق خریدا۔ یہ تو ہم پڑھ چکے ہیں اور ناول میرے ہاتھ سے کھسوٹ کر دنیا سے بے خبر ہو کر اس میں غرق ہو گئیں۔ رات گئے جب ناول ختم کر کے فارغ ہوئیں تو فرمایا قسط وار پڑھنا الگ معاملہ ہے۔ کتاب کا صحیح لطف ایک نشست میں پڑھنے سے ہی آتا ہے سو یہ ہماری دوسری بے وقوفی شمار ہوئی۔

3۔ 2016ء میں سوات جانا ہوا تو سیر کے لیے ایک بوستان میں لے جایا گیا، گرمیوں کا اختتام تھا پھل چنے جا چکے تھے۔ خزاں کی آمد سے پہلے درخت پتے جھاڑ کر ٹنڈ منڈ کھڑے تھے ہر طرف ویرانی کا سماں تھا پھر نیچے زمین پر گرے پتوں کا فرش تھا اور کچھ معلوم نہ ہو پاتا تھا کہ اگلا قدم کہاں لے جائے گا اس لیے بطور احتیاط کسی بھی درخت کے تنے کو مضبوطی

معروف مصنفہ

شمائلہ ذوالعباد سے ملاقات

شاہین رشید

اس ماہ آپ کا تعارف شمائلہ ذوالعباد سے کرا رہے ہیں۔ شمائلہ کو لکھتے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا۔ اس کے باوجود انہوں نے اپنی کچھ تحریروں سے قارئین کے دل میں جگہ بنالی۔

"کیا حال ہیں؟"

"اللہ کا شکر ہے۔"

"آج کل کیا مصروفیات ہیں؟"

"بس لکھنے لکھانے کی ہی مصروفیات ہیں۔ آج کل ایک ناول لکھ رہی ہوں اور فرصت کے اوقات میں ہی لکھتی ہوں۔ اس کے علاوہ فی الحال کوئی مصروفیات نہیں ہیں۔ گھرداری تو چلتی ہی رہتی ہے..... اور ہاں ایک پبلیکیشن ہاؤس نے مجھ سے رابطہ کیا ہے ان سے بات چیت چل رہی ہے۔ وہ راضی بھی رہیں گے تو ان شاء اللہ ان کے ساتھ میرا کنٹریکٹ ہوجائے گا۔"

"آپ کا نام شمائلہ ذوالعباد* ہے۔ ذوالعباد آپ کا سرنیم ہے؟"

"جی میرا نام شمائلہ ذوالعباد ہے۔ عربی والا عباد ہے اور یہ میرے میاں صاحب کا نام ہے۔ ان کا پورا نام "رانا ذوالعباد احمد" اور "رانا" کاسٹ ہے۔ "راجپوت" بھی "رانا" کہلواتے ہیں اور ان کا نام ان کے "نانا ابو" نے رکھا تھا شادی کے بعد جب میں نے سلطنت عمانی میں آنا تھا تب میرا "آئی ڈی کارڈ" بنا تھا اور آئی ڈی کارڈ پر پھر میں نے ان کے قواعد استعمال کیے تھے جب میں "عمان" آئی تو میں نے دیکھا کہ خواتین شادی کے بعد بھی اپنے میاں کا نام نہیں لگاتیں تو مجھے تھوڑی حیرت بھی ہوئی تھی۔ خیر نام کی انفرادیت کی وجہ سے بھی مجھے ان کا نام پیارا لگتا تھا اور پھر کاغذات پر بھی لکھوانا تھا۔ میاں کا نام اپنے نام کے ساتھ لگانا کوئی مجبوری نہیں ہے اپنی پسند ہے، اور مجھے یہی اچھا لگا سو میں نے لگالیا۔ میرے میاں صاحب بتاتے ہیں کہ کالج یونیورسٹی میں صرف میں ہی تھا کہ جس کا یہ نام تھا اور مجھے میرے نام سے جانتے تھے..... اور آپ نے نام کی کنفیوژن کی بات کی ہے تو زیر زبر والی بات بھی درست ہے اور الف ع والی بات بھی درست ہے اور وہ شعر تو آپ نے سنا ہی ہوگا کہ

"ہم دعا لکھتے رہے وہ دغا پڑھتے رہے۔ ایک نقطے نے محرم سے مجرم بنادیا۔"

تو زیر زبر اور نقطے بڑے اہم ہوتے ہیں۔ نام کے حوالے سے ایک دلچسپ بات آپ کو بتاؤں کہ اتفاق سے خواتین ڈائجسٹ میں میری تحریر "ہجرزدہ" پر نام شمائلہ ذوالعباد کی بجائے عشرت العباد شائع کیا گیا تھا۔"

"فیملی بیک گراؤنڈ؟"

"میں کٹر راجپوت گھرانے سے تعلق ہے جو تقسیم کے وقت ضلع لدھیانہ سے ہجرت کرکے پاکستان پہنچے تھے۔ جنہوں نے پنجاب کے ضلع جلال پور میں ڈیرے اس لیے ڈالے تھے کہ روہی یعنی صحرائے چولستان سے انڈیا کا بارڈر قریب ترین ہے وہ حالات سنبھلتے ہی واپس راجپوت گھرانی زرخیز ترین زمینوں اور جائیداد کے درمیان ہوں گے انہیں یہ گمان تھا کہ کلیم میں انہیں جو زمین انہیں دی گئی ہے وہ لدھیانہ کی زمینوں وجائیداد کے عشر عشیر بھی نہیں ہیں۔

مخصوص راجپوتی نجابت اور روایت رکھنے والے گھرانے میں بہاولپور کے پسماندہ اور دور دراز گاؤں میں پیدا ہوئی، میری تاریخ پیدائش 30 اگست ہے والد صاحب پولیس میں ہونے کے باوجود فنون لطیفہ کا بہترین ذوق رکھتے تھے۔ موسیقی اور شاعری میں ان کا انتخاب بہت اعلا تھا۔ میں بھی ہوں فنون لطیفہ سے محبت مجھے ورثے میں ملی ہے لیکن ان کا اور میرا ساتھ بہت تھوڑا تھا۔ ابھی میں پنگھوڑے میں ہی تھی کہ ایک خطرناک روڈ ایکسیڈنٹ میں ان کا انتقال ہوگیا۔ یہ ایک ایسی قیامت تھی کہ جس سے میری والدہ جلدی سنبھل نہیں پائیں۔ ان کی بیماری میں میری ذمہ داری میری پھوپھو نے اٹھائی..... ان کی کوئی بیٹی نہیں تھی انہیں میری صورت میں بیٹی مل گئی۔ اور انہیں جوان بھائی کی موت کا صدمہ بھی کچھ قابل برداشت لگنے لگا۔

میں آج بھی پھوپھو کو پھوپھو کے بجائے امی ہی کہتی ہوں اور ان کے پانچوں بیٹوں کو کزنز کے بجائے سگے بھائیوں کی جگہ پر رکھتی ہوں۔

میری بحالی اور مستقبل کو سامنے رکھتے ہوئے خاندان کے بزرگوں نے میری والدہ اور چاچو کی شادی کردی، میں نے چونکہ اپنے سگے والد کو دیکھا ہوا نہیں تھا اس لیے میرے چاچو ہی میرے لیے "اباجی" ہیں اور رہیں گے۔

انہوں نے میرے لیے گاؤں اور راجپوتوں کی ہر روایت توڑ ڈالی۔ مجھے پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ گاؤں کی کسی لڑکی نے کبھی شہر جاکر نہیں پڑھا تھا۔ میٹرک سائنس کے ساتھ پاس کرنے والی میں پہلی لڑکی تھی۔ نمبرز بھی ایسے تھے کہ خاندان میں کسی نے پہلے اتنے نمبرز نہیں لیے تھے۔ حالانکہ میرے والد، تایا، چچا اور کزنز کے نام جس جس اسکول میں وہ پڑھے تھے وہاں کے دفتر میں لگی تختیوں پر آج بھی کندہ ہیں.....

اس کے باوجود میٹرک کے بعد راجپوتی پردہ نجابت کی پاسداری میں مجھے بھائیوں (کزنز) کی طرح شہر نہیں بھیجا گیا جس پر میں نے رو رو کر اور احتجاج کرکے سب کا ناطقہ بند کردیا تھا..... اور یوں اگلے سال میرے اباجی نے ساری روایتیں توڑ کر مجھے شہر کے کالج اور ہوسٹل میں داخل کرادیا۔ یوں تعلیم کا رکا ہوا سلسلہ بحال ہوگیا۔ تو میں نے ایم کام تک اس، ایم اے اسلامیات اور بی ایڈ بھی کرڈالا۔

امی، ابو (چاچو) کے گھر میں سب سے بڑی ہوں۔ میرے بعد دو بھائی اور ایک بہن ہے۔ بڑی امی یعنی پھوپھو کے گھر میں سب سے چھوٹی ہوں مجھ سے بڑے پانچ بھائی ہیں۔

میری شادی والدین اور خاص کر ابو کی (چاچو) کی پسند سے خاندان سے باہر کے کٹر راجپوتوں میں ہوئی۔ میاں کا نام جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا "رانا والعباد احمد" ہے جو پیشے کے اعتبار سے "الیکٹریکل انجینئر" ہیں۔ عرصہ دراز سے گلف میں مقیم ہیں اور کچھ ہی عرصے کے بعد انہوں نے مجھے بھی بلالیا..... اللہ کا کرم ہے..... بڑی اچھی انڈر اسٹینڈنگ ہے اور دوستی بھی ہے..... رانا صاحب عام راجپوت مردوں سے ہٹ کر بڑے کھلے دل و دماغ کے مالک ہیں اور عورت کو محکوم کے بجائے برابر کی مخلوق سمجھنے والے انسان ہیں چنانچہ بڑے مزے سے گزر رہی ہے۔ ماشاءاللہ۔

جناب پیدا تو میں مڈل کلاس گھرانے میں ہوئی تھی لیکن ہمارا گھرانہ گاؤں کے کافی طاقتور گھروں میں شمار ہوتا تھا۔ کیونکہ جوائنٹ فیملی تھی۔ گھر کے دو افراد پولیس میں باقی آرمی اور دوسری سرکاری ملازمتوں میں بھی کررہے تھے..... اور آج سے کئی، چالیس سال پہلے اب کے دور کی طرح ڈیجیٹل دور نہیں تھا تو پولیس کو آل ان ون قسم کی قوت سمجھا جاتا تھا اس لیے اپنے گھر کی بیٹھک میں اپنے گاؤں کے علاوہ دوسرے پنڈ سے مسئلے مسائل حل کروانے آتے لوگوں کو کثرت دیکھا ہے۔"

سکتی کہ میں نے ان کے موضوعات کو ٹچ کیا ہے۔ ہاں میں اپنے موضوعات کو مختلف زاویے سے اٹھانے کی کوشش ضرور کرتی ہوں۔ سچ تو یہ ہے کہ میرے کریڈٹ پر کوئی زیادہ کام بھی نہیں ہے۔ حقیقت ہے کہ عمر بڑھتی ہے تو چیزوں کو دیکھنے کا اینگل بھی بدل جاتا ہے۔ میری ابتدائی اور اب کی تحریروں میں واضح فرق ہے جو اسی بات کی دلیل ہے...... پہلا معاوضہ "چار ہزار" تھا جو کرن سے ملا تھا۔

"گزشتہ دنوں تمہاری تحریر" سسرال گیندا پھول" پڑھی۔ تو اندازہ ہوا کہ جوائنٹ فیملی میں بڑے مسائل ہوتے ہیں۔ تمہارا کیا تجربہ ہے؟"

"موجودہ ڈیجیٹل دور میں جوائنٹ فیملی میں واقعی کافی زیادہ مسائل ہیں۔ والدین بچوں کو لے کر حساس بھی ہیں۔ خاص طور پر مائیں اور اسے میں ایک صحت مند رویہ بھی سمجھتی ہوں کہ مائیں اپنے بچوں پر خود توجہ دینا چاہتی ہیں تاکہ وہ ایک کامیاب انسان بن سکیں۔ میں نے کچھ وقت جوائنٹ فیملی میں بھی گزارا لیکن تب جب میرے بچے نہیں تھے۔ بعد میں میاں کے پاکستان سے باہر شفٹ ہوئی تو نیوکلیئر فیملی کی بنیاد پڑ گئی۔ میرے بچوں نے جوائنٹ فیملی سسٹم نہیں دیکھا وہ پاکستان جا کر کزنز میں بہت انجوائے کرتے ہیں۔"

"ایک مثال دی جاتی ہے کہ اتنی تمہاری عمر نہیں جتنا میرا تجربہ ہے تو تمہارے لیے یہ کہوں گی کہ اتنی تمہاری عمر نہیں ہوگی جتنی تمہاری تحریریں ہیں۔ تو اب تک کتنے ناول اور افسانوں کی کتابیں آچکی ہیں؟"

"ہاہاہا..... اپنی عمر کے حساب سے تو کچھ نہیں لکھا۔ محمد بن قاسم نے سترہ سال کی عمر میں سندھ فتح کر لیا تھا۔ مجھ سے قسط وار کے لیے چند صفحات اب تک نہیں لکھے گئے۔ میں نے گنے نہیں لیکن شاید پچیس سے چالیس کے قریب ناولز، ناولٹ، افسانے وغیرہ ہوں گے۔ رہی کتاب کی بات تو اس لیے شائع نہیں کروائی کیونکہ رائلٹی کے بغیر چھپوانا مجھے اپنے لکھے کی توہین لگتا ہے۔ اگر پبلشر رائلٹی دے رہا ہے تو ان شاء اللہ جلد ہی کتاب مارکیٹ میں ہوگی۔"

"آپ کے لکھنے کا بہترین وقت؟ پلاٹ ذہن میں آتا ہے؟ کب پوائنٹس لکھتی ہیں یا میں محفوظ کر لیتی ہیں؟"

"لکھنے کا بہترین وقت وہ ہوتا ہے جب میں خاموشی ہو اور یہ خاموشی میاں صاحب اور بچوں کے اسکول جانے کے بعد میسر آتی ہے۔ یا پھر رات آدھا پون گھنٹہ لکھتی ہوں۔ اگر موڈ بھی ہو، ذہن کہانی کی طرف ہو تو کسی بھی ... لکھے جاتے ہیں۔ رات کے وقت صرف ایک ... لکھی تھی جو خواتین ڈائجسٹ میں شائع ہوئی جس کا نام "ہجر زدہ" ہے۔"

میرے زیادہ تر ناول کرداروں پر ہی ہیں۔ مجھے کردار کہیں نہ کہیں ٹکرا جاتے ہیں۔ کبھی ... مجھ پر جیسے اترنے لگتا ہے اس کی مثال ... ناول سے دوں گی۔ "خواب دریچے" اور ... مارشل آرٹسٹ لڑکی میرے بچوں کے اسکول میں ... تھی۔ میں نے پہلی بار اس کی موووز اور ... دیکھا تو میں نے بوتسوانا افریقی لڑکی کو پاکستان ... مڈل کلاس کی نازش اکرام بنا دیا۔

ہمارے روایتی معاشرے میں اتنی شان دار مارشل آرٹسٹ لڑکی کو کیسے رویے برداشت کرنے پڑتے ہیں۔ دکھانے کی کوشش کی.....

چائلڈ ابیوز کیسز میں وکٹم بچوں کے ساتھ ہمیں بہت ہمدردی ہوتی ہے۔ جب جنسی زیادتی کا شکار ہونے والی بچی مرتی ہے تو ہم طوفان بھی برپا اٹھاتے ہیں مگر اگر ایسی بچی بچ جائے تو سروائیول کتنا مشکل کر دیتے ہیں۔ سسرال اور ہر مرد چھوٹی لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ ایسی لڑکیوں کا مستقبل پاک و ہند جیسے معاشرے میں کتنا ہولناک ہوتا ہے دکھانے کی کوشش کی تھی۔ ان کا ذہنی کرب بتانا چاہا اور الحمدللہ میں کامیاب بھی ہوئی تھی۔

تو یوں کہنا چاہیے کہ مجھ سے کردار پلاٹ بنواتے ہیں۔ کبھی کبھی کوئی ایک جملہ بھی کہانی کی بنیاد بن جاتا ہے اور زیادہ تر آئیڈیاز سستی کے ہاتھوں ضائع کر دیتی ہوں۔

"ماضی اور حال میں بہت اچھی رائٹرز ہیں۔ کس کی تحریر یا انداز تحریر پسند ہے؟ کبھی کسی کے اسٹائل کو کاپی کرنے کو دل چاہا؟"

"ماضی و حال میں بہت سی رائٹرز پسندیدہ ہیں۔ خواتین ڈائجسٹ کی سب سینئر رائٹرز کا میں بہت احترام کرتی ہوں۔ لوگ اپنے ہم عصر رائٹرز کی تعریف نہیں کرتے جو کہ ایک غلط رجحان ہے۔ ہم عصر رائٹرز کی تعریف ان کا حوصلہ بڑھاتی ہے تو جناب مجھے فرزانہ کھرل کے جملوں پر رشک آتا ہے۔ نازیہ رزاق کے کرداروں کی "آنکھ" ماضی میں بادشاہوں سے ٹکر لیتے راجپوتوں کی یاد دلاتی ہے۔ یاد آیا نئی رائٹرز میں "ام اقصیٰ" نام کی نئی رائٹر کی کوئی تحریر پڑھی تو نام ذہن میں رہ گیا۔ ان میں دم ہے اور بھی بہت سے نام ہیں جو سر دست ذہن میں نہیں آ رہے۔ مرد لکھاریوں میں مجھے "سر طاہر جاوید مغل" پسند ہیں اور میں نے کبھی کسی پسندیدہ لکھاری کا اسٹائل کاپی کرنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ میرا اپنا اسٹائل ہے لکھنے کا۔"

"ٹی وی کی طرف نہ آنے کی کیا وجہ ہے؟"

"ہماری ڈائجسٹ رائٹرز نے ٹی وی کا نیا عہد شروع کرایا میں اس پر خوش ہوں کہ انہیں ان کی محنت کا صلہ مل رہا ہے کیونکہ لکھنا بہت "جوکھم" کا کام ہے۔ پرنٹ میڈیا میں لکھنے سے لگژری تو کیا لوئر مڈل کلاس کا گھر چلانا بھی ناممکن ہے۔ رہی میری بات کہ میں اس سے کیوں دور ہوں تو ایمان داری سے کہوں گی کہ میں نے ٹی وی پر جانے کے لیے جان توڑ کوشش بھی نہیں کی۔ مجھے لگتا ہے کہ بچے کچھ اور بڑے ہو جائیں، میں کچھ مزید بوڑھی ہو جاؤں، سستی و پوستی پن سے کمی ہو جائے کسی بھی طرح سے۔ (مسکراہٹ) تو پروفیشنلی لکھنا آسان ہو جائے گا۔

کافی وقت پہلے "ہم ٹی وی" والوں نے ایک ون لائنر لیا تھا جو پروڈیوس بھی ہے۔ اس کے بعد نہ انہوں نے کال کی نہ میں نے رابطے کی کوشش کی۔

میری موڈی اور بدحرام طبیعت یوں خوش ہے جیسے جان چھوٹی ہوئی ہو۔ میرے لیے بنا موڈ کے لکھنا بہت مشکل ہے۔ بعض اوقات مہینوں موڈ نہیں بنتا تو سمجھو کہانی کی ٹیل لپیٹے (ہنستے ہوئے) اور [illegible] پاؤں پسارے، نیٹ فلکس و انسٹاگرام ریلیز دیکھتی مطمئن، بدحرام و پوتی کی تعریف پر پوری اتر رہی ہوتی ہیں۔ ایسی شاہانہ شخصی خوبیوں کے ساتھ اچھی امید عبث ہے۔ پر میں نے رکھی ہوئی ہے۔ (ہنستے ہوئے)۔

اللہ کا کروڑہا شکر ہے کہ میاں صاحب کو کمپنی کی طرف سے لگژری گاڑی ملی ہوئی ہے۔ ان کی ذاتی گاڑی الگ ہے اور میرے بچوں اور میرے استعمال کے لیے الگ ہے۔

الحمدللہ میں بہت خوب صورت زندگی گزار رہی ہوں۔

جاری ہے

راحت جبیں

ثانیہ ایک ضدی لڑکی ہے وہ اپنے گھر کے ماحول سے تنگ ہے۔ اس کا بھائی وسیم دوسرے شہر میں نوکری کرتا ہے۔ بہن رابعہ کی شادی پھوپھی کے بیٹے سہیل سے ہوئی ہے۔ دادی اور پھوپھی نے اپنے زمانے میں اس کی ماں کی زندگی تنگ کیے رکھی اب بیٹی لے کر بھی پھوپھی ان پر احسان رکھتی ہے۔ ان کے گھر میں بہت افراتفری کا ماحول ہے۔

پڑوس میں رہنے والی ارم کے گھر کا ماحول بہت اچھا اور رکھ رکھاؤ والا ہے۔ ثانیہ اور ارم کا بھائی عبید ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔

پھوپھی چاہتی ہیں کہ ان کے دوسرے بیٹے فرخ کی شادی ثانیہ سے ہو جائے۔ لیکن رابعہ کا حشر دیکھ کر ثانیہ اور نادر اس کے حق میں نہیں ہیں۔

ارم ثانیہ کے گھر اپنے ناولس واپس لینے آتی ہے دادی بتاتی ہیں کہ ثانیہ نہیں ہے تم خود لے لو۔

دوسری قسط

سرخ دل کی شکل کا لاکٹ سنہری زنجیر میں مقید..... خوب صورت اور جب لائٹس پڑتیں تو جگمگا اٹھتا۔

"یہ کیسا ہے؟" عبید نے ارم کو تلاشا ..... ارم ایئررنگز دیکھ رہی تھی..... پاس آ گئی۔

"خوب صورت ہے نا۔" عبید کو کچھ زیادہ ہی پسند آ گیا تھا۔

"بہت......"

"تو بس پھر یہی لے لو۔" ارم کی بات سنتے ہی عبید نے کہا..... ارم کو پسند تو آیا تھا مگر اتنا نہیں کہ وہ اسے خرید ہی لیتی اور قیمت بھی کافی زیادہ تھی۔ یوں بھی اسے ایئررنگز خریدنا تھے۔

"نہیں، عبید مجھے کچھ اور خریدنا ہے۔" ارم نے انکار کیا اور دوسری طرف مڑ گئی۔ سامنے آئینے میں عبید کا عکس نظر آیا۔ وہ اب بھی وہیں کھڑا تھا۔ وہ شرارت سے مسکرا کر مڑی اور بھائی کے کان میں سرگوشی کی۔

"ویسے تم چاہو تو لے سکتے ہو۔ کسی کو گفٹ کر دینا۔"

"زندگی میں کوئی ایسا ہی نہیں جسے میں یہ گفٹ کر سکوں۔" عبید نے سادگی سے کندھے اچکائے۔

"محبت سے عاری ہو...... کس قدر خالی ہو......" اس نے جان بوجھ کر چڑایا۔

"جس کی زندگی میں محبت کرنے والی بہن ہو۔ وہ خالی کیوں ہونے لگا۔" عبید نے پیار سے اس کے سر پہ چپت لگائی۔

"کمال ہے" ارم سر جھٹک کر خیالوں سے باہر آئی اور لاکٹ کو واپس رکھا اپنے ناولس نکال کر ڈریسنگ پہ رکھے اور دراز بند کرنے لگی۔ تب ہی عقب میں وسیم ہلکے سے کھنکارا ارم پلٹی تو پوچھنے لگا۔

"کیا ہوا ملے نہیں؟"

"مل گئے ہیں اپس اپنی کتابیں لے رہی تھی۔"

اس نے سائیڈ ٹیبل سے اپنی کتاب اٹھائی۔

"اب بھی شاعری پڑھتی ہو؟"

"بس کبھی کبھار فائنل ایئر ہے تو زیادہ ٹائم نہیں ملتا۔" وہ ہلکا سا مسکرائی۔ وسیم کے اندر ننھی سی کلی چٹکی۔

"یہ تو ہے باقی گھر میں سب ٹھیک ہیں۔"

وسیم کیونکہ شروع سے ہی گھر سے باہر رہا تھا۔ کبھی پڑھائی تو کبھی جاب کے سلسلے میں تو ان کی کبھی بھی بے تکلفی نہیں رہی تھی۔

"سب ٹھیک ہیں وسیم بھائی، میں چلتی ہوں۔ امی انتظار کر رہی ہوں گی۔" وہ تیزی سے جانے لگی تب ہی وسیم کی نظر ڈریسنگ ٹیبل پر گئی۔

"ارم!" ارم دروازے میں رکی۔

وسیم ٹاپس اٹھا کر واپس آیا۔ "تم یہ یہیں بھول گئی ہو۔"

"اف......" ارم نے اپنے ماتھے پر ہاتھ مارا۔ "جو چیز لینے آئی تھی وہی بھول کر جا رہی ہوں۔ لائیں۔"

اس نے گلابی ہتھیلی سامنے پھیلا دی۔

(کون خوش نصیب ہوگا جس کا نام اس ہاتھ کی لکیروں میں لکھا جائے گا۔)

نجانے کس بے خودی میں دل میں اٹھتے سوال کو دباتے وسیم نے اپنا ہاتھ اس کی ہتھیلی کے نیچے کیا اور اس کے ٹاپس رکھ دیے۔

بس ایک لمحہ......

ایک عجیب سا لمحہ،

ارم نے بجلی کی سی تیزی سے مٹھی بند کر کے ہاتھ اٹھا لیا اور اتنی تیزی سے کمرے سے نکل گئی۔ وسیم نے بے یقینی سے اپنے آپ کو دیکھا۔

یہ بالکل غیر ارادی حرکت تھی۔

چھونے کی خواہش تو کبھی دل میں پیدا ہی نہ ہوئی تھی۔

وہ تو بس اسے دیکھتا تھا۔ تھوڑا سن لیتا تو روح تک سرشار ہو جاتی۔

"تو کیا یہ یک طرفہ محبت ایک قدم آگے بڑھ گئی ہے؟"

ایک بے نام، ادھورا، غیر محسوس سا رشتہ باقاعدہ نام چاہتا ہے۔ وسیم نے مسکرا کر مٹھی بند کر لی۔

محبت میں جب لمس کی خواہش جاگے تو مطلب اب دل زندگی بھر کا ساتھ چاہتا ہے۔

"اور کون ہے جو مجھے اور میرے گھر کو اپنے وجود کی رعنائیوں سے جگمگا دے۔ بس ارم...... بس ارم......"

دل نے ضدی بچے کی طرح تکرار شروع کر دی۔

☆☆☆

"ثانیہ! تم نے وہ لاکٹ کہاں سے لیا؟"

دونوں پیریڈ کر کے کالج کے عقبی گراؤنڈ میں سیڑھیوں پر بیٹھی باتیں کر رہی تھیں۔ سامنے کچھ لڑکیاں باسکٹ بال کی پریکٹس میں مصروف تھیں۔ سر پر چمکدار نیلا آسمان اور چند پرندوں کی اڑانیں۔

"کون سا لاکٹ؟" ثانیہ نے بظاہر بے توجہی سے پوچھا۔

"وہ سرخ دل والا لاکٹ۔"

ثانیہ کا پورا وجود ایک لمحے کو ساکت ہوا۔

"تم نے کہاں دیکھا۔" وہ ذرا سا کو سنبھلی۔

"تمہاری دراز میں۔"

"وہ دراز تو لاکڈ ہوتی ہے۔" ثانیہ متحیر تھی۔ ایسی بے احتیاطی کیوں کر ہو گئی۔

"کیوں کوئی راز چھپا کر رکھتی ہو۔" ارم نے شرارت سے پوچھا۔

"تم سے کون سا راز چھپ سکتا ہے۔"

(جو لاکڈ دراز کھول کر دیکھ لیتی ہے گھنی...... مسکی)

ثانیہ دل ہی دل میں جھنجلائی۔

"بس یونہی ایک دن مارکیٹ میں پسند آ گیا تو خرید لیا۔ ابھی تک پہننے کا موقع ہی نہیں ملا۔" لاپروا لہجے میں کہہ کر اس نے دوبارہ برگر کھانا شروع کر دیا۔

"عبید کو بھی بہت پسند آیا تھا۔" ارم نے پلیئرز کو دیکھتے ہوئے بتایا جس کا بال نیٹ میں جا ہی نہیں رہا تھا۔

نوالہ ثانیہ کے حلق میں پھنس گیا۔

"ع...... عبید۔"

"ہم نے بھی مارکیٹ میں دیکھا تھا۔ عبید کو بہت پسند آیا۔ وہ چاہتا تھا میں لے لوں۔ مگر مجھے اتنا اچھا نہیں لگا تھا۔" ارم سادگی میں بتاتی گئی۔

ثانیہ نے برگر رکھ دیا اور پانی کی بوتل منہ سے لگا لی۔

"بھئی بہت بدمزہ برگر ہے۔ میں نہیں کھا رہی۔"

"نہیں ٹھیک ہے۔"

"تم کھا لو پھر، میرا تو پیریڈ شروع ہونے والا ہے۔" ثانیہ اپنا بیگ اٹھا کر سیڑھیاں اتر گئی۔ ارم کی سمجھ میں نہیں آیا اس کا مزاج کس بات پر برہم ہوا ہے۔

☆☆☆

"نہیں یار، آج کا نہیں کل کا پروگرام رکھو۔ آج بالکل موڈ نہیں۔"

عبید ستون کے ساتھ لپٹی بیل کا پتا نوچتے کسی سے کہہ رہا تھا۔ ثانیہ بگولے کی طرح آ کر اس کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ عبید مسکرایا اور رکنے کا اشارہ کر کے دوست سے خدا حافظ کہنے لگا۔ مگر ثانیہ نے اس کا ہاتھ پکڑا۔ ہتھیلی پر لاکٹ پٹخا اور یہ جا وہ جا......

عبید بس اس کی تمتمائی شہابی رنگت...... آنکھوں میں غصے کی لپکیں ہی دیکھ پایا۔

"ثانیہ...... میری بات تو سنو......"

وہ پیچھے لپکا مگر وہ بیرونی دروازہ عبور کر گئی۔ اب وہ گلی میں تو اس کا پیچھا کرنے سے رہا۔ اس لیے دروازے میں ہی رک گیا۔

سرخ دل سے نظریں ہٹا کر ذرا سا آگے ہوتے پیچھے ساتھ والوں کے صحن میں جھانکا وہ امرود کے پیڑ کے پاس کرسی جھلا رہی تھی۔

عبید مسکرایا۔

وہی بچپن والی عادت۔ وہ جب بھی ارم اور عبید سے ناراض ہو کر اپنے گھر جاتی اسی کونے میں منہ چھپا کر بیٹھتی کیونکہ یہ کونا ان کی چھت سے نظر آتا تھا۔ وہ دونوں دیوار سے لٹکے اسے آوازیں دیتے رہتے۔

لیکن اب وہ بڑے ہو گئے تھے اسے آوازیں نہیں دے سکتا تھا تب ہی دونوں کہنیاں دیوار پر ٹکا کر میسج لکھنے لگا۔

ثانیہ نے چونک کر موبائل اٹھایا۔

کبھی شعلہ، کبھی شبنم

کبھی آگ...... کبھی ابر......

میرا محبوب بھی بس دھوپ چھاؤں جیسا ہے۔

ثانیہ نے غصے سے میسج ڈیلیٹ کر دیا۔

"اف اتنا غصہ، سزا سے پہلے قصور بھی بتا دو......"

اس نے اگلا میسج داغ دیا۔

ثانیہ غصے میں بپھری لہر کی طرح اٹھی اور دوسرے لمحے اس کے سر پر پہنچ گئی۔

"جانِ عبید......" وہ اسے دیکھتے ہی سراپا محبت اوڑھ لیتا تھا۔

وہ اسے غصے سے گھورتی رہی۔ کھنچی پیشانی پر تیوریاں ہی تیوریاں تھیں۔

"یہ ظلم کیوں؟" عبید نے سامنے ہتھیلی کی۔

ثانیہ نے دونوں ہاتھ سینے پر باندھے اور چبا چبا کر بولی۔

"تمہیں اچھا نہیں لگتا کہ میں تمہاری بہن کی کوئی بھی چیز استعمال کروں۔ مگر یہ اچھا لگتا ہے کہ ثانیہ ارم کی رجیکٹ کی چیز پہنے۔"

"اس بات کا کیا مطلب ہے۔" عبید الجھا۔

"یہ لاکٹ...... یہ ارم نے ناپسند کر دیا تھا اور تم اسے میرے لیے لے آئے۔ تمہیں ذرا بھی شرم نہیں آئی عبید۔ یہ تمہاری طرف سے تمہاری محبت کا پہلا اظہار تھا اور تم میرے لیے کسی کی رجیکٹڈ چیز لے کر آئے۔" وہ آگ بگولہ ہو رہی تھی۔ "تم سوچ سکتے ہو یہ کس قدر انسلٹنگ ہے۔"

"ثانیہ ایسا نہیں ہے۔ یہ مجھے بہت اچھا لگا تھا۔ تب تک ہمارے تمہارے درمیان کچھ بھی نہیں تھا۔ اور جب سوچا کہ تمہیں کچھ تحفہ دوں تو یہی دھیان میں آیا۔"

عبید پریشان ہو کر وضاحتیں دینے لگا۔ اس کے تو وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ ثانیہ اس طرح بھی سوچ سکتی ہے۔

"عبید! تمہیں میرے لیے کچھ الگ لانا چاہیے تھا۔ بہت یونیک، سب سے انوکھا...... جیسے تمہاری محبت ہے۔"

اس نے آخری لفظ دھیمے لہجے میں کہے اور ایسا کہتے ہوئے اس کی آنکھیں بھیگ سی گئیں۔ وہ تیزی سے مڑی اور سیڑھیاں اتر گئی۔

عبید کا دل تاسف سے بھر گیا۔

وہ جتنی منفرد تھی، اتنی ہی منفرد اس کی سوچ تھی۔

عبید کو اس کے غصے، ناراضی اور شکوے پر بھی پیار آ گیا۔ اس نے لاکٹ کو دیکھا اور جیب میں رکھ لیا۔

☆☆☆

کوئی روشن ستارہ آسمان پر مسکراتا ہے
سمندر گیت گاتا ہے
کمال عہد مستی ہے
جہاں پر موسم بھی بہت حیران لگتا ہے
کوئی چہرہ میرے دل کے بدن سے آن لگتا ہے
بہت چپکے سے کہتا ہے
مجھے تم سے محبت ہے
مجھے تم سے محبت ہے

[illegible] تم

اس کی سرگوشیوں میں ڈھلتی آواز، ثانیہ کے سارے شکوے، شکایتیں دم توڑنے لگے۔ وہ کن جتنوں کے بعد مانی تھی اور اس کے نخرے اٹھانا عبید کو اچھا لگتا۔

وہ کہتا...... "کال کرو۔"

"بیلنس نہیں ہے۔" وہ ہری جھنڈی دکھا دیتی۔

عبید اس کے موبائل میں ماہانہ پیکیج کروا دیتا۔

"آن لائن کیوں نہیں ہوتی ہو۔"

"نیٹ کام نہیں کر رہا ہے...... تمہارا پیکیج کسی کام کا نہیں......" وہ ناک چڑھاتی عبید نئی ڈیوائس لے آتا۔

"کیا مصیبت ہے تم مجھے تنہا نہیں چھوڑ سکتے۔" وہ اتراتی مگر بگڑتی بھی۔

"تمہیں تنہا چھوڑنے کا مطلب خود کو تنہا کر دوں۔"

عبید نے اسے منا کر ہی دم لیا۔

"مجھے دنیا کی کوئی بھی چیز تمہارے قابل نہیں لگتی۔ بتاؤ ثانیہ، کیا پسند ہے۔ تمہیں مجھ سے کیا چاہیے......" وہ بےتاب ہو کر پوچھنے لگا۔

"مجھے صرف تم چاہیے ہو عبید......" اس نے کھل کر کہہ دیا۔

"تو بات کروں؟"

"بس ڈر لگتا ہے۔ اگر گھر والوں نے کوئی اعتراض کھڑا کر دیا۔"

"ثانیہ! اس ڈر سے باہر آؤ۔ اس رشتے کو کوئی نام ملنا چاہیے۔ ہم کب تک اس طرح چھپ سکتے ہیں۔ مجھے اچھا نہیں لگتا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو چاہتے ہیں اس بات کی خبر سب کو ہونی چاہیے۔ جو ہوگا دیکھا جائے گا۔"

وہ اب اسٹینڈ لینے کو تیار تھا۔

"اچھا ذرا سا رک جاؤ، میں پہلے گھر میں امی سے بات کر لوں۔ تاکہ کوئی ہنگامہ کھڑا نہ ہو۔" پھر ذرا سے توقف کے بعد اسے آسیہ کی باتیں یاد آ گئیں۔

"تم نے اس دن اپنی امی اور ارم کی باتیں سنی تھیں۔ وہ کیسے میرے سامنے اپنی ہونے والی بہو کی خصوصیات گنوا رہی تھیں۔ جن میں سے ایک بھی مجھ میں نہیں۔"

"ایک تو ہے...... خوب صورت تو بہت ہو......" متبسم لہجہ۔

"تم سمجھ نہیں رہے...... میرے سامنے بھابھی تلاش کرنے کی باتیں مطلب یہ تھا کہ میرے دل میں تمہارا کوئی خیال بھی ہے تو میں نکال دوں۔" ثانیہ جھنجلا گئی۔

بہت دنوں کے بعد وہ محبت کے بجائے زمینی حقائق کی بات کر رہے تھے۔

"اور میرے دل سے تمہارا خیال کون نکالے گا۔"

وہ مطمئن تھا اور اسے بھی مطمئن کرنا چاہتا تھا۔

"ثانیہ! سارے وہم دل سے نکال دو۔ تم دیکھنا تمہارا نام سن کر ارم کتنا خوش ہوگی۔ وہ تمہیں بہت چاہتی ہے آخر تم اس کی دوست ہو اور رہے امی ابو تو انہیں، میری خوشی سے زیادہ کچھ بھی عزیز نہیں۔"

"عبید......" ارم کی آواز پر عبید ایک لمحے کو رکا۔ پھر خدا حافظ کہہ کر کال کاٹ دی۔

"تم اس وقت یہاں کیا کر رہی ہو؟"

"[illegible] ......" ارم نے شرارت سے بھنویں [illegible]

اچکا گیں۔

''دوست سے بات کر رہا تھا۔''

''دوست سے ایسی باتیں کرتے ہیں۔'' ارم نے ہنسی روکی۔

''کیسی......'' عبید نے چہرے پر سنجیدگی طاری کرلی۔

''امی ابو کی خوشی...... کس کو منا رہے تھے۔'' ارم کی سماعت سے بس آخری جملہ ٹکرایا تھا۔

''ارم چھوٹی ہو، چھوٹی بن کے رہو۔'' وہ کنی کترا کر جانے لگا ارم سامنے آگئی۔

''اس طرح جان چھڑا کر نہیں جا سکتے...... آئی پرامس امی سے خود بات کرلوں گی۔''

عبید نے طویل سانس بھری۔ دل چاہا ارم کو بتا دے مگر ثانیہ نے منع کیا تھا اور وہ اس کے لیے کوئی مسئلہ کھڑا نہیں کرنا چاہتا تھا۔

''دیکھو بھائی امی تمہارے لیے لڑکیاں دیکھ رہی ہیں۔ خوامخواہ پھنس جاؤ گے کہیں بات طے کر دی تو مسئلہ ہو جائے گا۔''

عبید کچھ چونکا۔

''پلیز صرف نام بتا دو۔''

''نام......'' عبید نے زیرلب دہرایا۔

''ہاں......'' ارم پرجوش ہوئی۔

''ٹھیک ہے نام بھی بتا دوں گا۔''

''کب۔''

''جب تمہارے لیے دولہا ڈھونڈ لوں گا۔'' وہ اس کی ناک کھینچ کر نیچے چلا گیا۔ ارم چپ سی ہوگئی۔ ہاتھ کی پشت پر کسی کا لمس جاگا۔ غیر محسوس اور اجنبی تھا اور ارم اب تک وسیم کی اس حرکت پر الجھی ہوئی تھی۔

☆☆☆

کھانے کی خوشبو اشتہا انگیز تھی۔ دادی کی ناک سونگھ سونگھ کر تھک گئی...... اور نادرہ کی کچن میں آنیاں جانیاں ہی ختم نہ ہوتیں۔

''خود گوشت بھون بھون کر کھا جائیں گی۔ یہ نہیں کہ سالے والی بوٹی میرے لیے بھی نکال دیں۔'' تھک ہار کر انہوں نے آسیہ سے شکوہ کیا۔ جو کچھ لمحے پہلے ہی ان کی خیریت معلوم کرنے آئی تھیں۔ ''پہلے شور بے پی پی کر طبیعت اوب گئی ہے۔''

''اس عمر میں بوٹیاں نگلی جاتی ہیں؟'' نادرہ چائے کا کپ اور بسکٹ لے کر آگئیں۔

''ہاں اس عمر میں تو ہر چیز ہی حرام ہو جاتی ہے۔ اب دیکھو ایک ہی کپ لائی ہے۔''

''اماں! آپ ہی پی لو۔ مہمان گھر جا کر پی لیں گے۔'' نادرہ کو تاؤ آگیا۔

''ہر آئے گئے کے سامنے شروع ہو جاتی ہیں۔ جیسے ہم کچھ کھانے کو نہیں دیتے۔ یہ عمر ہوگئی مگر دیدہ پن نہ گیا۔''

آسیہ بری طرح شرمندہ ہوگئیں۔

''کوئی بات نہیں خالہ، میں تو ابھی پی کر آئی تھی۔ آپ لے لیں۔''

''نہیں نہیں میں تو ویسے ہی کہہ گئی۔ میری چائے کا تو ابھی وقت ہی نہیں ہوا۔'' دادی کو احساس ہوا کہ کچھ زیادہ ہی...

''آہ اس عمر میں تو کھایا پیا بھی کہاں جاتا ہے۔'' انہوں نے لمبی سانس بھری اور بڑبڑائیں۔
''بکرے کا گوشت لگتا ہے۔''
''تھوڑا زیادہ گلا کر بھون دیا کرو نادرہ، ارم کی دادی جان بھی اسی طرح فرمائش کیا کرتی تھیں۔'' آسیہ نے ہلکے پھلکے لہجے میں احساس دلانا چاہا۔
''یہاں کون سا روز گوشت آتا ہے۔ وہ تو وسیم لایا تھا کہ اماں میرے لیے بھون دیں۔'' نادرہ نے لاپروائی سے بسکٹوں پر منڈلاتی مکھی اڑائی۔
آسیہ مزید بددل اور حیران ہو گئیں۔ ان کے گھر میں تو تیرے میرے کا رواج کبھی نہ تھا۔ زیادہ ہوتا یا کم سب مل کر ہی کھاتے۔
''ہاں میری دفعہ جنموں کی بھوک نکل آتی ہے۔ بچی کے اسکول میں فنکشن تھا تو کھڑے پیر آٹھ دس ہزار کی فراک لے دی۔''
''ہائے اللہ کیسے سمجھاؤں۔ وہ آٹھ دس ہزار کی فراک نہیں تھی اور میں نے نہیں...... ارم نے تحفہ دیا تھا کیوں آسیہ؟''
نادرہ نے ماتھا پیٹا اف۔'' آسیہ کے فرشتوں کو بھی خبر نہ تھی کہ ارم نے ایسا کوئی تحفہ ثانیہ کو دیا ہے اور یہ بھی ممکن نہ تھا کہ ارم ان سے پوچھے یا مشورے کے بغیر کوئی قدم اٹھائے۔
وہ خاموشی سے واپس آ گئیں۔
دادی نے دیکھا نادرہ کمرے میں گھس گئی ہیں۔ وہ جتنا ممکن تھا ایک جھپک کچن میں پہنچیں۔ اپنے پلو سے ہانڈی کا ڈھکن اٹھایا۔ ہانڈی شوربے سے بھری جس میں چند بوٹیاں اور آلو تیر رہے تھے۔ بھنا گوشت مال غنیمت سمجھ کر کمرے میں دبا لیا گیا تھا۔
انہوں نے غصے سے ڈھکن پٹخا۔ آواز کمرے تک گئی۔ بھنی مسالے دار بوٹی کھاتی نادرہ کو ہنسی آ گئی۔
کچھ نہیں بدلا تھا۔ وہی حالات...... وہی واقعات، بس کردار اور اختیار بدل گیا۔ جہاں کل آصفہ اور اس کی ماں تھیں۔ وہاں اب نادرہ تھیں۔

☆☆☆

دونوں لڑکیاں موبائل پر جھکی نجانے کیا دیکھتی پر جوش ہو رہی تھیں۔
دبی دبی سرگوشیاں، ہنسی۔
سامنے چیز پاستا اور برگر کے ڈبے کھلے تھے۔
آسیہ نے اپنا موبائل کھولا اور وہ تصویریں کھولیں جو ارم نے انہیں پارٹی کے دوران بھیجی تھیں۔ سفید اور سلور کنٹراسٹ کی خوب صورت فراک...... وہ کہہ سکتی تھیں دس بارہ ہزار کی ہی تھی۔
''ثانیہ......'' آسیہ کی آواز پر دونوں ان کی طرف متوجہ ہوئیں۔
''تم نے اپنا سفید ڈریس کہاں سے لیا تھا۔''
یہ پوچھتے ہوئے انہوں نے دونوں لڑکیوں کو بغور دیکھا۔
ارم کا انداز نارمل ہی تھا مگر ثانیہ کا رنگ بدل گیا۔
''ایک دوست نے گفٹ کیا تھا۔'' اس نے ہلکے توقف کے بعد جواب دیا۔
''ہیں کس دوست نے؟'' ارم کا انداز بے ساختہ تھا۔
آسیہ کو اپنے سوال کا جواب مل گیا۔

''تم نہیں جانتیں...... میں اب چلتی ہوں کافی دیر ہو گئی ہے۔'' ثانیہ نے موبائل ارم کو واپس کیا اور عجلت میں کھڑی ہو گئی۔
''تو پھر تم نے اپنے گھر میں یہ کیوں کہا کہ وہ ڈریس تمہیں ارم نے گفٹ کیا ہے۔''
آسیہ نے عام سے انداز میں پوچھا۔
ارم بری طرح چونکی۔ ثانیہ گم صم سی ہو گئی۔
''ثانیہ تم نے یہ کیوں کہا۔''
''وہ ڈریس مجھے نتاشا نے دلایا تھا۔ ارم پر تو کسی کو اعتراض نہ ہوتا مگر نتاشا کے نام پر سب نے برا ماننا تھا۔ اس لیے میں نے تمہارا نام لے دیا۔''
ثانیہ نے بغیر کسی کو دیکھے وضاحت دی اور تیزی سے چلی گئی۔
ارم نے افسوس اور محبت سے اپنی سہیلی کو دیکھا۔
جسے اپنی چھوٹی چھوٹی خواہشوں کو پورا کرنے کے لیے جھوٹ بولنا پڑتا تھا۔
لیکن آسیہ کو اس کی بات پر رتی بھر اعتبار نہیں آیا۔
''اپنی خواہشوں کی تکمیل کے لیے گھر والوں سے جھوٹ بولنا اچھی بات تو نہیں۔''
''لیکن وہ کیا کرتی امی، اس کے پاس کوئی ڈریس نہیں تھا۔''
''اب ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے۔ اسے سیکھنا ہوگا کہ چادر دیکھ کر پاؤں پھیلائے جاتے ہیں۔ یہ مانگ تانگ کر خواہشیں پوری کرنے کی عادت پڑ گئی تو اچھا نہیں ہوگا۔''
ماں کا لہجہ ناگواری لیے تھا۔ ارم خاموش ہو گئی۔

☆☆☆

''اگر انہیں یہ پتا چل جائے کہ مجھے یہ ڈریس عبید نے دلایا ہے تو ویسے ہی پاگل ہو جائیں۔'' ثانیہ نے الماری میں رکھے لباس کو دیکھ کر سوچا۔
تب ہی ارم کی کال آنے لگی۔
''اف، اب یہ سوال کر کر کے جان کھا لے گی۔'' ثانیہ نے کوفت سے سوچا۔ مگر بات کرنا ضروری تھا۔ اب نہ کرتی تو اس نے صبح کالج میں ذکر چھیڑ دینا تھا۔ پھر نتاشا کے سوالوں کا جواب کون دیتا۔
''ہیلو......'' اس کا لہجہ روکھا سا تھا۔
''سوری یار، تمہیں تو پتا ہے امی کو ایسی باتیں بالکل پسند نہیں۔'' ارم نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔
''انہیں ایسی باتیں اس لیے پسند نہیں کہ ان کی بیٹی کی ہر خواہش بن کہے پوری ہو جاتی ہے۔'' ثانیہ نے تیزی اور تلخی سے کہا۔
''ایسی بات نہیں ہے۔ مجھے بھی بہت سی باتوں پر کمپرومائز کرنا پڑتا ہے۔'' ارم نے سادگی سے اپنی صفائی دی۔
''بس رہنے دو، ساری باتیں، ساری نصیحتیں میرے لیے ہی ہیں۔'' ثانیہ نے غصے سے کال ہی کاٹ دی۔
ارم کو افسوس ہوا...... ایک معمولی سی بات پر اس کی سہیلی خفا ہو گئی تھی۔ حالانکہ وہ اچھی طرح جانتی تھی۔ ثانیہ کے مزاج کا ایک رنگ نخرہ ہے۔ اس نے تو یہ تحفہ بھی عبید کو سو نخرے دکھانے کے بعد لیا تھا۔
''مجھے ضرورت ہی نہیں ہے تم نے ارم کے سامنے میری بے عزتی کی۔''
[illegible]

لگے گا...... پرنس لگو گی۔"

"ہونہہ مجھے زمین پر ہی رہنے دو۔"

"تو ٹھیک ہے یہیں پڑا ہے۔ نہ اچھا لگا تو اٹھا کر باہر پھینک دینا۔" عبید ناراض ہو گیا اور ثانیہ اتنی بے وقوف نہیں تھی جو اتنے قیمتی اور خوب صورت ڈریس کو ضائع کرتی۔ اس لیے عبید پر ہزار احسان دھرتے اس نے تحفہ قبول کر لیا تھا۔

☆☆☆

صدیقہ نے دروازے میں آتے ہی زوردار سلام کیا۔

دادی نے ناگواری سے سر اٹھا کر دیکھا...... سیاہ چادر کی بکل مارے اپنا پرس بغل میں دبوچے وہ سر پہ آ کھڑی ہوئی۔

"بی بی! اسٹر نکالی ہوئی ہیں؟"

"نہیں اڈا کھڈا کھیل رہی ہوں......" دادی کو تاؤ آ گیا...... اندھی کانی کو سامنے پڑی مٹروں سے بھری ٹوکری نظر نہ آئی تھی...... صدیقہ کھل کر ہنسی...... نادرہ تڑپ کر باہر آ گئیں۔

"ہائے بی بی صدیقہ میں نے کہا تھا۔ میں خود چکر لگاؤں گی۔"

"ہاں پر مجھے تو۔ گوجرانوالہ کی بس پکڑنی تھی تو......"

نادرہ نے چیل کی طرح صدیقہ کی کلائی دبوچی اور کمرے میں کھینچ کر لے گئیں۔ صدیقہ نے بمشکل اپنا پرس گرنے سے بچایا۔ دادی کی ساری حسیات کام کرنے لگیں۔

صدیقہ محلے کی درزن تھی اور سارے محلے کی عورتوں کے ساتھ کمیٹی بھی ڈالتی تھی۔ یا تو کپڑے سلوانے تھے یا پھر کمیٹی کا معاملہ تھا۔

اب نئے کپڑے تو گھر میں آئے نہیں تھے۔ مطلب معاملہ کمیٹی کا تھا۔

("اماں دھیان رکھنا...... نادرہ نے بڑی کمیٹیاں ڈال رکھی ہیں۔ بڑا مال جمع کر رہی ہے جب جمع کر کے محل کھڑا کر لے گی تو تمہاری دعوت کر دوں گی۔")

آصفہ کی بات پہ وہ چڑ گئی تھیں۔

مگر اب اپنے کان کھڑے کر لیے تھے۔ غصہ اس بات پر بھی تھا کہ معاملہ ان سے بالا ہی بالا رازداری سے نمٹایا جا رہا ہے۔

"کیا ہو رہا ہے اماں......" بشیر صاحب کی انٹری پر انہیں تاؤ ہی آ گیا۔

"کھیتوں میں ہل چلا رہی ہوں۔ ڈھول پیٹ رہی ہوں...... نظر نہیں آتا...... جو بھی آئے ایک ہی سوال۔"

"میں نے تو یونہی...... نادرہ......" انہوں نے کھسیانا ہو کر آواز لگائی۔

"صدیقہ آئی ہے۔" انہوں نے گویا بڑی اطلاع دی تھی۔

بشیر سیدھا ہو بیٹھے۔

"کمیٹی نکلی ہے۔"

"دیکھا، میں نا کہتی تھی معاملہ کمیٹی کا ہے۔"

صدیقہ کو گوجرانوالہ کی بس پکڑنی تھی وہ عجلت میں نکل گئی۔ خود نادرہ کی حالت اب ایسی تھی کہ جیسے بس نکلی جا رہی ہو۔ پیسہ جمع ہونے کی خوشی سے زیادہ اسے چھپانے کی فکر حواسوں پر سوار تھی۔ ہزاروں منصوبے تھے جو پیسے کے منتظر تھے۔ اب پہلے کون سا کام کروایا جائے۔

ٹوٹے پھوٹے فرنیچر کی مرمت

رنگ و روغن

یا ثانیہ کا زیور بنوا کر رکھ لیں۔

"سوچ رہی ہوں وسیم اور ثانیہ کی شادی ایک ساتھ ہی کر دوں۔" شام تک الجھنے سلجھنے کے بعد سوچ کو زبان ملی تو بند کمرے میں شوہر کے ساتھ شیئر کر بیٹھی۔

"کمیٹی نکل آئی؟"

(ہائے کمیٹی نہ ہوئی حاملہ عورت کا پیٹ ہو گیا جو چھپائے نہ چھپتا)

"ہاں نکل آئی ہے۔ اب خدا کے لیے اعلان نہ کر دینا ثانیہ کے لیے کچھ بنا کر رکھوں گی۔"

"ہاں ہاں بتاؤ۔ میں نے کیا کرنے ہیں۔ ویسے ہی پوچھ لیا تھا۔" وہ لاپرواہ بن گئے۔

"جو تم بہن بھائی ویسے ہی پوچھتے ہو اس کے پیچھے سازشوں کی بو آتی ہے۔"

سابقہ تجربے ہی ایسے تھے کہ وہ بری طرح مشکوک ہو گئیں۔

"اب ہم اتنے بھی برے نہیں ہیں۔" شبیر احمد برا مان گئے۔

"ہونہہ یہ تو میرے دل سے پوچھو۔"

"السلام علیکم اماں!" آصفہ کی آواز پر نادرہ نے دل کر دل پر ہاتھ لیا۔

"جل تو جلال تو آئی بلا کو ٹال تو۔"

"کچھ شرم کرو تمہد کو بلا کہتی ہو۔ تم جیسی عورتیں ہی جہنم میں جاتی ہیں۔"

لہجہ بگڑ گیا...... آواز اونچی ہو گئی......

"ہاں سناؤ۔ سناؤ اپنی بہن کو کہ بیوی کے ساتھ یہ سلوک کرتا ہوں۔ وہ تو خوش ہی ہو گی۔"

"چپ کر جا کم بخت عورت...... وہ غصے سے کمرہ بدر ہوئے۔ جہاں آصفہ ماں کے پاس بڑے غصے سے بیٹھی شکوہ کر رہی تھی۔

"ایک ہی تو میرا بھتیجا ہے۔ مجال ہے کہ چھٹیوں میں گھر آئے تو مجھ سے بھی مل جائے سوچا کہ خود ہی جا کر مل آتی ہوں......"

"آ جائے گا حاضری دینے...... ابھی تو یہیں ہے......" نادرہ کو باہر تو آنا ہی تھا......

"تم رابعہ کو بھی لے آتیں......" نقص امن کے خدشے سے دادی نے موضوع بدلا......

"اسے گھر میں ہی ٹکنے دیں۔ اور روز روز یہاں بھاگی آئے گی تو سسرال میں دل کیا خاک لگے گا۔"

"تم بھی تو روز روز ہی آتی ہو......" پیاری پوتی کے خلاف کوئی بات دادی سے برداشت کہاں ہوتی تھی۔

"کیا بات ہے اماں؟ اب میرا یہاں آنا بھی کھلنے لگا......"

"جم جم آؤ۔ میں نے یہ تھوڑی کہا ہے۔ ہر بات کا الٹا مطلب لے لیتی ہو......"

"میں چائے بنا لوں......" نادرہ بیزار ہو کر کچن کی طرف مڑیں۔ تب ہی آصفہ نے بم دھماکا کر دیا۔

"شبیر...... کمیٹی کے پیسے آ گئے؟"

ایک لمحے کو نادرہ کو سانپ سونگھ گیا......

وہ پلٹیں تو آنکھوں میں تحیر اور صدمہ تھا۔

"ارے سانپ کیوں سونگھ گیا۔ میں نے پوچھا کمیٹی کے پیسے آ گئے......"

شبیر نے بیوی کی صدماتی نگاہ سے نظر چرائی اور مرے مرے لہجے میں اثبات میں گردن ہلا دی۔ نادرہ کا

دل اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب گیا۔
آصفہ نے اطمینان سے ہاتھ جھاڑ کر ٹانگیں اوپر رکھیں۔
"چلو اچھا ہو گیا..... بتایا تھا ناں فریج خراب ہے..... اب میری تو جیسے تیسے گزر گئی تمہاری بیٹی کو ہی لگنی ہے......"
دادی کا تکیے کے نیچے نجانے کیا گم ہو گیا تھا۔ خواہ مخواہ ادھر ادھر ہاتھ مارنے لگیں۔ ہاتھوں کو سانپ سونگھ گیا تھا۔
"اے بھیا! ادھار مانگ رہی ہوں، سہیل کے پاس آئیں گے تو واپس کر دوں گی......"
"آپا! میں نے وہ کمیٹی ثانیہ کے لیے ڈالی تھی کہ اس کے جہیز کی کوئی چیز بنوا لوں گی"
اندر اٹھتے غبار کو دباتے ہوئے نادرہ نے بے بسی سے کہا۔
"رابعہ کو جہیز دیا تھا جو ثانیہ کو دینے کی فکر پڑ گئی ہے..... اور ابھی کون سا اس کا رشتہ طے ہو گیا ہے....." آصفہ نے فوراً طعنہ کھینچ مارا..... اور بھائی کی کمائی پر بہنوں کا بھی حق ہوتا ہے۔"
"آپا! وہ میری کمیٹی ہے آپ کے بھائی کی نہیں......" نادرہ نے ہمت کی۔
"میکے سے لائی ہو؟ میرے بھائی اور بھتیجے کی کمائی سے ہی جوڑے ہیں..... میرا نہیں تو اپنی بیٹی کا ہی خیال کر لو۔ جسے دو کپڑوں میں بیاہ کر لے گئی تھی......"
دادی کو کھانسی شروع ہو گئی..... وہ ثانیہ کو پانی کے لیے آوازیں دینے لگیں۔
"دے دو۔ پھر چیخ ہو جائیں گے....." شبیر نے مدھم آواز میں کہا۔ مطلب اب دینے ہی دینے تھے۔
نادرہ کے اندر گرم ابال اٹھا......
"نہیں۔ وہ ثانیہ کے ہیں......"
سب حق دق رہ گئے۔ ایسا کھرا انکار......
نادرہ تیزی سے کمرے میں جا کر بند ہو گئیں..... بے بسی غصہ اشتعال..... ان کا دل چاہا ابھی گردن میں پھندا ڈال کر پنکھے سے لٹک جائیں۔
بہنوں کے حق ساری زندگی ختم نہیں ہوتے۔ مگر بیوی اور اولاد کے حق؟
"یا اللہ یہ میں کیا دیکھ رہی ہوں......" آصفہ نے سینہ ہی پیٹ لیا..... "اپنے شوہر کی بات کا بھی لحاظ نہیں۔ اتنا سر چڑھا لیا بیوی کو ثانیہ اس کی بیٹی ہے تو وہ کون ہے جو میرے گھر بیٹھی ہے......"
شبیر جذباتی ہو کر کھڑے ہوئے......
"اچھا کیوں شور مچا رہی ہو..... اس کے پیسے جا رہے ہیں وہ تو چلائے گی......"
دادی نے بیٹی کو گھرکا..... ساتھ ہی بیٹے کو پکارا......
"جاؤ اسے سمجھا بجھا کر پیسے لے آؤ..... بیٹیوں کے سکھ سے زیادہ تو کچھ نہیں۔ یہ میری بیٹی ہے تو رابعہ تمہاری ..ثانیہ کے نصیب ثانیہ کے ساتھ ہیں۔ پھر ادھار ہی تو مانگ رہی ہے......"
"اماں! ابھی لاتا ہوں۔ نادرہ کی کیا مجال کہ میری بات سے انکار کرے......"
"ہاں لے کر ہی آنا کیونکہ میں تو جا رہی ہوں۔" آصفہ نے پیر نیچے اور آنکھیں ماتھے پر رکھ لیں پاؤں میں جوتا پہنا۔
"اب تم کہاں چلیں۔" دادی کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔
آصفہ کے اتھرے مزاج سے اچھی طرح واقف تھیں۔

"اتنی بے عزتی کے بعد کون یہاں رکے گا، ادھار مانگا تو یہ حال ہے۔ ایسے مانگ لیتی تو میرا سر ہی پھاڑ دیتی..... کم بخت..... منحوس شکل والی......"
شبیر ٹھنڈی سانس بھر کے کمرے میں چلے گئے......
"اب بیٹھ جاؤ..... ذرا سی بات ہو تو غصے پر چڑھ جاتی ہو......" دادی نے گھرکا "وہ گیا ہے تو لے کر ہی آئے گا......"
"دیکھ لیتے ہیں......" آصفہ منہ بنا کر واپس بیٹھ گئی۔
کمرے میں داخل ہوتے ہی شبیر کا سارا غصہ بھاپ کی طرح اڑ گیا، نادرہ بلک بلک کر رو رہی تھیں۔ شبیر خاموشی سے پاس بیٹھ گئے۔
"اب ضد چھوڑ دو نادرہ......" ان کا اپنا لہجہ بھی تھکا تھکا سا تھا۔
"ساری زندگی میرے بچوں کا حق اس کو کھلایا ہے اب بس کر دیں..... میری بوٹیاں بھی نوچ کر کھلا دیں گے۔" وہ پھٹ پڑیں......
"رابعہ کا سوچو۔"
"رابعہ کے نام پر ساری زندگی جرمانہ بھریں گے؟ دو جوان بیٹوں کی ماں ہیں۔ کھاتے کماتے ہیں..... پھر بھی بھائی کے سامنے ہاتھ پھیلاتی ہے..... اللہ کرے ان کے ہاتھ ٹوٹ جائیں۔ بھکاری عورت۔"
"خدا کے لیے بس کرو......" شبیر نے گھبرا کر نادرہ کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے۔ نادرہ کتنا بھی روتی چلاتی...... اب ہونا تو یہی تھا..... اس نے غصے سے بٹوا نکال کر پلنگ پر پھینکا..... شبیر احمد نے بٹوا اٹھایا اور بنا کچھ کہے باہر نکل گئے..... نادرہ دوبارہ پلنگ پر گر گئیں۔
"یہ عورت مر ہی جائے۔"
"لوٹ آیا ہے..... اب زبان بند کر......" دادی کے کہنے پر آصفہ ایک دم چپ کر گئیں۔ آنکھوں میں فاتحانہ چمک ابھر آئی..... یہ تو کبھی ہوا نہ تھا کہ آصفہ نے کچھ ٹھان لیا ہو اور وہ پورا نہ ہوا ہو۔
"ثانیہ کی شادی پر واپس کر دوں گی۔ بیوی کو تسلی دے دینا۔ کہیں دل کا دورہ نہ پڑ جائے......"
شبیر خاموشی سے بیٹھ کر پیسے گننے لگے......
"میری قربانیوں کو سب بھول گئے..... میں نے کیسے سارے بہن بھائیوں کا خیال رکھا تھا..... بڑی بہن نہیں ماں بن کے پالا تھا......" انہوں نے بھائی کو تھوڑا اور جذباتی کرنا چاہا...... دادی تڑپ کر سیدھی ہو گئیں......
"کیوں؟ ان کی ماں مر گئی تھی......؟"
"اماں! آپ تو بیمار رہتی تھیں......" آصفہ نے کھسیانی ہو کر بھائی کے ساتھ نوٹ گننے کی کوشش کی جو بار بار بھول جاتا تھا۔
"بس کرو بی بی..... اور کچھ پکا کر بھیجتی رہنا..... وہ جو ٹھنڈی تتی روٹی ملتی تھی..... کچھ دنوں تک وہ بھی نہیں ملے گی......"
"یا اللہ! اماں! آپ کے گھر میں آپ کے ساتھ یہ سلوک ہوتا ہے......"
"آپا! یہ لیں......" شبیر نے رقم آگے بڑھائی..... آصفہ نے بسم اللہ کہہ کر پکڑنا چاہا مگر درمیان میں ہی کسی نے رقم جھپٹ لی۔
"جس رقم پر ہمارا حق ہے وہ کسی دوسرے تیسرے کے پاس نہیں جائے گی......"
تنی ہوئی گردن..... آنکھوں میں بغاوت..... چہرے پر تناؤ......

وہ ثانیہ شبیر تھی......
جس نے ماں اور رابعہ کی زندگی سے یہی سیکھا تھا کہ جو حق کے لیے بول نہیں پاتا اس کا حق کھا لیا جاتا ہے۔ مال غنیمت کی طرح بانٹ دیا جاتا ہے......
''ہائے مرگئی۔ اب میں دوسری تیسری ہوگئی...... اماں! اب تمہارے گھر میں میرے ساتھ یہ سلوک ہوگا......''
''ثانیہ اپنے پھوپھو کو دو۔ یہ کیا بدتمیزی ہے......'' شبیر نے ڈانٹا......
''نہیں ابا! کمیٹی کوئی الہ دین کا چراغ نہیں ہے رگڑا اور من پسند رقم لے لی۔ میری ماں نے ایک ایک روپیا بچایا ہے۔ تب جاکر یہ رقم جمع ہوئی ہے۔ سو خواہشیں ماری ہیں...... یہ چار پیسے جوڑنے کے لیے...... یہ رقم میری ماں کی ہے اور اس کا جہاں دل کرے گا خرچ کرے گی......''
کمرے سے نادرہ لپک کر باہر آئیں......
''چل ثانیہ...... اندر چل کن بے حسوں کو سبق پڑھا رہی ہے......''
''بے حس یہ نہیں...... آپ ہوگئی ہیں جو اپنی مرضی اور حق کے لیے آواز بھی نہیں اٹھا سکتیں......'' وہ مزید بھڑ گئی۔
اندر آتے وسیم نے بے حد حیرت سے اس منظر کو دیکھا......
''یہ کیا ہو رہا ہے؟......''
''ہم سے کیا پوچھتے ہو'' ہکا بکا بیٹھی آصفہ کو ہوش آیا...... وہ تو ثانیہ کے انداز و اطوار پر ورطہ حیرت میں تھیں...... تیوری چڑھا کر کھڑی ہوگئیں......
''اپنی ماں سے پوچھو جس کی سکھائی پڑھائی میں بھتیجی پھوپھو کو گالیاں نکال رہی ہے''
''کسی نے نہیں سکھایا۔ ہمیں خود بھی نظر آتا ہے'' ثانیہ چلائی......
''اس کو میری نظروں سے دور لے جاؤ ورنہ گلا دبا دوں گا......'' شبیر احمد غصے سے کانپ گئے......
اولاد منہ زور ہوگئی تھی...... بدتمیزی کر رہی تھی اس کا ادراک ہوا......
''وہ یہ سب کیوں کر رہی تھی؟...... ذہن ابھی وہاں تک نہیں پہنچا تھا......''
''گالا اپنی بہن کا دبائیں جن کی فرمائشیں ہی ختم نہیں ہوتیں...... اس سے تو اچھا تھا ایک ہی بار رابعہ کا جہیز لے لیتیں تو ہماری بچی جان......''
شبیر احمد کا تھپڑ ثانیہ کے گال پر پڑا۔
وہ لڑکھڑا کر حواس باختہ وسیم سے ٹکرائی۔
نادرہ اور دادی نے دہل کر دل پر ہاتھ رکھا۔
''اسے میری نظروں سے دور لے جاؤ۔ ورنہ جان نکال لوں گا۔''
وسیم نے ثانیہ کا بازو پکڑا اور کھینچتا ہوا کمرے میں لے گیا۔
''اب اگر باہر آئی تو میں تمہارا حشر کر دوں گا......''
''میں نے کچھ بھی غلط نہیں کہا......'' وہ چلائی۔
''چپ......'' وسیم نے انگلی اٹھا کر تنبیہ کی...... اور باہر نکلتے ہوئے دروازہ بند کیا۔
''میں لعنت بھیجتی ہوں ایسے ہر رشتے پر جو جونک کی طرح ہمیں چمٹ گئے ہیں......''
وہ مٹھیاں بھینچ کر حلق کے بل چلائی اور بیڈ پر گر گئی......

یہ آج کا تماشا نہیں تھا۔ وہ بچپن سے یہی سب دیکھتی آرہی تھی......
باہر آگ پوری بھڑک گئی تھی جس کی لپیٹ میں ہر رشتہ آرہا تھا۔
''یہ سارے تماشے اس لیے ہو رہے ہیں کہ میں اس گھر میں نظر نہ آؤں...... لیکن بتا دوں اگر میں نہ آئی تو تمہاری بیٹی بھی یہاں قدم نہ رکھے گی......''
''کیا ہوگیا آصفہ اب ختم بھی کرو......'' دادی بوکھلائی ہولائی بیٹی کو ٹھنڈا کرنے لگیں۔
''آپا...... شبیر نے زبردستی رقم انہیں تھمانا چاہی......
''یہ رکھیں...... اس کم بخت کو تو میں دیکھ لوں گا۔''
''میں تو تھوکوں نہ ان پیسوں پر......'' آصفہ نے ہاتھ مار کر پیچھے کیا ''رکھو'' میں جا رہی ہوں اور آج کے بعد اس دہلیز پر قدم نہ رکھوں گی اور تم......''
''انہوں نے کینہ توز نظروں سے نادرہ کو دیکھا...... جو معاملے کو اتنا بڑھتا دیکھ کر ہاتھ پیر چھوڑ بیٹھی تھیں۔
''ان پیسوں کا تعویذ بنا کر گلے میں لٹکا لو۔ تم سب کے لیے میں مرگئی۔ پیسے پیارے ہیں۔ قبر میں ساتھ لے کر جانا اور بھول جانا کہ اس دنیا میں کوئی آصفہ کوئی رابعہ رہتی ہے۔''
آصفہ...... آپا...... پھوپھو......
وہ اپنا ڈیرا اٹھا کر دہلیز پار کر گئیں۔
پیچھے صرف آوازیں رہ گئی تھیں......

☆☆☆

''میں ابھی جا کے اس لڑکی کا منہ توڑتا ہوں'' وہ غصے میں آگ بگولہ تن فن کرتا پھر رہا تھا...... ''اس کی جرات کیسے ہوئی کہ ہماری ماں کی بے عزتی کرے......'' آصفہ منہ پر پلو رکھے پھپھک پھپھک رونے لگی۔
ان کا کام ختم ہوگیا تھا ان کے دو تھیا اور دہائیاں دے رہے تھے۔
جن کی دہشت سے اندر بیٹھی رابعہ تھر تھر کانپ رہی تھی۔
''سب وہیں موجود تھے کسی نے کیا کرلیا...... میرا بھائی، بھتیجا، میری سگی ماں سب تماشا دیکھتے رہے...... وہ میری بھاوج بیٹی کو سامنے کرکے خود معصوم بن گئی۔ ہائے کیا کیا نہ کہہ دیا...... ہم بھیک منگے ہیں۔ اس کے باپ کے ٹکڑوں پر پل رہے ہیں۔ ثانیہ لکھ نہ دے۔''
رابعہ نے بمشکل نمبر ملایا۔
''ثانیہ! تم میرا گھر بسنے نہیں دوگی......''
فون کی بیل پر ثانیہ کی ساکت وجود میں جنبش ہوئی، رابعہ کا نمبر دیکھ کر اسے رابعہ پر ترس آگیا...... یہ سارے چکر میں سب سے زیادہ رابعہ نے ہی پسنا تھا......
پھر بھی اس نے کال لے لی......
''کچھ بھی بولتے ہوئے ایک بار تو میرے بارے میں سوچ لیا کرو......'' وہ بے بسی سے رو پڑی جو کچھ رابعہ نے بتایا وہ ثانیہ کے لیے نیا نہیں تھا۔
''رابعہ میں نے یہ سب نہیں کہا تھا......''
''اب کون بیٹھ کر چھانے گا کہ تم نے کیا کہا اور انہوں نے کیا سنا...... ایک کی دس لگائیں گی۔ عذاب میں تو میری جان آئے گی......''
''تم سہیل بھائی سے بات کرو...... اس سب میں تمہارا کیا قصور؟ اور میں نے جو بھی کہا اس کے مجھے کسی لفظ

پر شرمندگی نہیں۔

اب اس کے بعد رابعہ کیا کہتی اس نے غصے میں کال کاٹ دی۔

ثانیہ گہری سانس لے کر لیٹ گئی......

اس کے کانوں میں دادی کی دہائیاں...... نادرہ کی سسکیاں اور شبیر کی غصے والی آواز گونجنے لگیں۔

''اور ماموں انہوں نے کچھ نہیں کہا......'' وہاں اب بھی پنچائیت جاری تھی۔

''ماموں کی وہاں سنتا کون ہے وہاں تو ان ماں بیٹی کا راج ہے۔ یا اللہ اس عمر میں کتنی بے عزتی، وہ بھی چند ہزار کے لیے...... باپ کیا مرا میرے سارے حق ہی ختم ہو گئے......'' ماتھا پیٹتے پیٹتے وہ سہیل پر برس گئیں۔

''یہاں کھڑے میرا منہ کیا دیکھ رہے ہو، جا کر اپنی بیوی سے پوچھو...... کیا کیا بتاتی رہتی ہے جو وہ لوگ ہماری عزت ہی نہیں کرتے......''

سہیل ناک کان سے دھواں نکالتا کمرے کی طرف لپکا......

''اب آپا کی خیر نہیں''

''اچھی بات ہے اس کی لگامیں کھینچے گا تب ہی وہ لوگ قابو میں آئیں گے......''

آصفہ نے اپنے نام نہاد آنسو صاف کیے......

''لیکن اماں! آپ نے یہ سب سن کیسے لیا؟...... فرخ نے ماں کے پاس بیٹھ کر بغور ان کا چہرہ دیکھا تو آصفہ مسکرا دیں۔

''تو نہیں سمجھے گا...... صبح کباڑیے کو بلا کر پرانا فریج اٹھوا دے۔''

''اور نیا کہاں سے آئے گا......''

''بے وقوف میرا بھائی لے کر آئے گا......'' آصفہ نے ہنستے ہوئے فرخ کے کندھے پر چپت لگائی۔

''سہیل'' سہیل نے رابعہ کا بازو پکڑا اور دھکیل کر کمرے سے باہر کر دیا۔

نہ کچھ پوچھا نہ بتایا کہ اس پورے معاملے میں رابعہ کا قصور ہی کیا تھا۔

جب تک تمہارے گھر والے آ کر معافی نہیں مانگتے تم اس کمرے میں نہیں آؤ گی۔

پشت پر شوہر کی خشونت بھری آواز پر وہ ٹھہری تھی۔

''سہیل! میرا کیا قصور ہے؟''

''رابعہ بی بی اہم کوئی منگتے نہیں ہیں۔ تمہارے گھر والے زیادہ ہواؤں میں اڑے تو مکان میں سے اپنی ماں کا حصہ مانگ لوں گا۔ بلکہ اب تو میری بیوی کا حصہ بھی بنتا ہے۔''

رابعہ حیران پریشان سہیل کا منہ ہی دیکھتی رہ گئی۔

معاملہ بگڑ گیا تھا...... کچھ زیادہ ہی بگڑ گیا تھا۔

رابعہ کو شدت سے احساس ہوا۔

☆☆☆

وہ ذہنی طور پر اتنا پریشان ہوئی کہ ارم کے پاس آ گئی...... دونوں بہن بھائی مل کر روف گارڈن کی صفائی میں مصروف تھے۔

''یہاں کوئی فارغ کھڑا نہیں ہوگا......'' عبید نے اسے دیکھتے ہی اعلان کر دیا......

''ارم! تمہارے پاس کوئی پین کلر ہے میرے سر میں بہت درد ہے......'' اس کا ستا ستا لہجہ...... عبید کا ہاتھ رک گیا...... ثانیہ کا رویا رویا چہرہ دل کو تڑپا گیا...... خود ارم بھی تشویش سے قریب آئی...... ماتھا چھو کر دیکھا۔

''تمہیں تو بخار لگ رہا ہے......''

''اللہ کرے مر ہی جاؤں......'' وہ رو ہی پڑی۔

عبید بے چینی سے کھڑا ہو گیا۔

''ثانیہ میری جان......'' ارم نے اسے گلے لگایا...... ''آؤ میرے ساتھ نیچے چلیں......''

''مجھے نیچے نہیں جانا۔'' وہ خود کو چھڑا کر کچھ دور کرسی پر جا بیٹھی۔

''ٹھیک ہے مت جاؤ۔ مگر بتاؤ تو سہی ہوا کیا ہے؟''

''ارم! ثانیہ کے لیے چائے اور میڈیسن لے آؤ......'' عبید نے نرمی سے ٹوکا...... ارم نے کچھ کہنا چاہا عبید نے اشارے سے منع کر دیا کہ وہ ابھی اس سے کچھ نہ پوچھے۔

''ٹھیک ہے میں کچھ کھانے کو لاتی ہوں......'' ارم بات سمجھ کر چلی گئی......

عبید نے مڑ کر ثانیہ کو دیکھا......

وہ آنکھیں بند کیے کرسی کی پشت سے سر ٹکا چکی تھی......

نوک مژگاں پر چمکتا ننھا آنسو...... سوچے ہوئے بچے نے۔

''مت رویا کرو ثانیہ......'' وہ اس کے سامنے آ کھڑا ہوا ثانیہ نے آنکھیں کھول کر عبید کو دیکھا۔

''مجھے اس گھر میں نہیں رہنا۔ وہاں کوئی بھی میرا نہیں ہے۔''

''میں بہت جلد تمہیں یہاں لے آؤں گا......''

''وہ چاہتے ہیں......'' ثانیہ سیدھی ہوئی ''میں پھوپھو سے معافی مانگ لوں......'' ایسا کہتے ہوئے اس کے لہجے میں نفرت در آئی۔

''مانگ لو......'' وہ کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔

''کیوں؟......'' ثانیہ نے یقین ہوئی۔

رابعہ کی خاطر......'' وہ اس قصے سے لاعلم نہیں تھا۔

''مرد اتنا کمزور کیوں ہوتا ہے سہیل بھائی اچھی طرح جانتے ہیں رابعہ بے قصور ہے اسے کیوں سزا دے رہے ہیں ہمت ہے تو میرے سامنے آئیں مجھ سے جواب طلبی کریں میں انہیں بتاؤں گی کہ......''

عبید نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

''کبھی کبھی انسان خود سے وابستہ رشتوں کی وجہ سے مجبور ہو جاتا ہے۔''

ثانیہ چپ کی چپ اپنے ہاتھ پر دھرے اس کے ہاتھ کو دیکھتی رہی۔ پھر اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔

''تم بھی مجبور ہو جایا کرو گے عبید''

☆☆☆

''ارم! کس کے لیے چائے بنا رہی ہو؟'' آسیہ عصر کی نماز پڑھ کر آئی تھیں ارم نے سینڈوچز بنا لیے تھے اب چائے رکھی تھی ارم نے بتایا۔

''ہاں کل آصفہ کی آوازیں یہاں تک آ رہی تھیں بیچاری ثانیہ جب سے ہوش سنبھالا ہے گھر میں یہی سب دیکھ رہی ہے...... اچھا جاؤ تم عبید کے کمرے سے کپڑے لا کر واشنگ مشین میں ڈالو میں نے تو صبح مشین لگائی تھی مگر عبید کہہ رہا ہے...... اس کے کپڑے آج ہی دھونے ہیں......''

''آپ چائے دیکھیں میں کر کے آتی ہوں۔'' ارم خوش ہو گئی۔ ماں دل میں کدورت نہیں رکھتی تھی۔ اس نے ثانیہ کو اس کی غلطی کے لیے معاف کر دیا تھا۔

مشین آٹو میٹک تھی اسے بس کپڑے ڈال کر چلانی ہی تھی اس سے پہلے جیبیں کھنگالتے ہوئے جو اس کے ہاتھ لگا، اسے دیکھ کر وہ ششدر سی رہ گئی۔

☆☆☆

"تم تو میری زندگی کا روشن ستارہ ہو ثانی۔"

"ستارے ڈوب جاتے ہیں۔" ثانیہ کے لہجے میں تلخی تھی۔

"نہیں، صرف نظروں سے اوجھل ہوتے ہیں۔" وہ اسے نگاہوں میں بھر کے زخموں پر تسلی کے پھاہے رکھنے لگا۔

"اب تو کسی بھی چیز پر اعتبار نہیں آتا۔ سب کچھ بدل جاتا ہے۔"

"اللہ کی بندی لکھ کر دے دوں...... عبید نہیں بدلے گا نہیں بدلے گا۔"

"کس کے لیے نہیں بدلے گا۔"

ارم کی بات، پر تیزی سے پیچھے ہٹا۔ ثانیہ کے لبوں پر طنزیہ مسکراہٹ بکھر گئی۔ بہن کے ڈر سے پیچھے ہٹنے والا مرد بھی نہ بدلنے کے دعوے کر رہا تھا۔

ارم نے ٹرے میز پر رکھی...... اور باری باری دونوں کو دیکھا۔

"ثانیہ کہہ رہی تھی۔ دنیا کا ہر مرد بدل جاتا ہے۔ میں اسے بتا رہا تھا۔ عبید کبھی نہیں بدلے گا۔ اپنے سے وابستہ ہر رشتے کے لیے اسی طرح مخلص رہے گا۔" عبید نے اطمینان سے کہا۔

"اور ثانیہ کو اس بات کا یقین دلانے کی ضرورت کیوں پیش آ گئی۔"

"بے اعتبار لوگوں کا اعتبار اسی طرح بحال کیا جاتا ہے بچی۔" وہ کھڑا ہوا۔

"تو تم اپنی تسلی کو چھٹی دو۔ میں کام ختم کر لوں۔"

ارم نے اس کی جگہ بیٹھ کر ثانیہ کو بغور دیکھا اور اپنا کپ اٹھا لیا۔ ارم ذہنی طور پر اتنا الجھ گئی تھی کہ ثانیہ کو نہ چائے کا کہا نہ بسکٹ کے لیے اصرار کیا۔ اپنی سوچوں میں الجھی ثانیہ نے خود ہی دوا کھا کر چائے پی لی تھی۔

"اب اس گھر میں کسی کو کھانا دانا ملے گا یا سب بھوکے مر جائیں۔"

دادی کی دہائیاں عروج پر تھیں۔ نادرہ اٹواٹی کھٹواٹی لیے سر پر دوپٹہ باندھے کمرے میں سسکتی رہتیں۔ وسیم باہر سے کھا آتا۔ شبیر اور دادی اپنا بمشکل انتظام کرتے...... ثانیہ نے تو اس دن سے کسی کو شکل نہیں دکھائی تھی۔

"یہ گھر ہے یا عذاب، دو چار چھٹیاں گزارنا مصیبت ہو جاتی ہیں۔ اس سے تو اچھا ہے میں آیا ہی نہ کروں۔"

وسیم گھر کے کسی کونے سے دھاڑتا...... پھر رابعہ کا روتا دھوتا فون آ جاتا...... وہ اپنے ہی گھر میں قید تنہائی کاٹ رہی تھی۔ پھوپھو کسی کام کو ہاتھ نہ لگانے دیتیں۔ سہیل کمرے میں نہ گھسنے دیتے۔

"تم چھوڑ آؤ۔" ان حالات میں ثانیہ یہ مشورہ دیتی تو سب نے مل کر اسے ہی قتل کر دینا تھا۔

"یا اللہ تو مجھے اٹھا لے...... اب اور مجھ سے کیا کام لینا ہے۔ بوجھ ہوں ان لوگوں پر...... بیٹی کو بھی خود سے مطلب ہے۔ مڑ کر دیکھا بھی نہیں کہ ماں کا کیا حشر ہے۔" دادی خود ہی اٹھیں دیوار کا سہارا لے کر باورچی خانے میں جانے لگی۔

وسیم نے غصے سے جا کر ثانیہ کے کمرے کا دروازہ کھولا۔ ماں سے تو کچھ کہہ نہیں سکتا تھا۔ اسی پر برس پڑا۔

ثانیہ نے خاموشی سے اٹھ کر دادی کے ہاتھ سے ساس پین لیا۔ جیسا تیسا دلیہ پکایا اور پیالہ دادی کے پاس رکھ

آئی۔

کمرے میں نادرہ سوجی ہوئی ناک اور بیٹھی ہوئی آواز میں بڑبڑانے لگیں۔

"چار پیسے ہی تھے پھر چڑ جاتے بیٹی کی جان عذاب میں ڈال دی۔"

"ارے پھوپھی سے دشمن نہیں ہے۔ یہ جا کر کچھ معافی تلافی کرے تو میری رابعہ کی بھی جان چھوٹ جائے۔" دادی نے گرم دلیے میں چمچ لیا۔

ثانیہ کو لگا وہ اس سے زیادہ ہاتھ پیر نہیں مار سکتی۔

اس نے خود کو ہارتا ہوا محسوس کیا۔

وہ بھی خود سے وابستہ رشتوں کے لیے ہار گئی تھی۔

اپنی انا کو کچل کر معافی مانگنے کو تیار تھی۔

"آپا! اب بس کریں۔ غصہ تھوک دیں۔"

آصفہ غصے کیسے تھوک دیتیں یہ تو ان کی جیت کا دن تھا۔ سو خشونت سے منہ پھیرے گردن اکڑائے بیٹھی رہیں...... ان کے عقب میں کھڑی ثانیہ کو لگ رہا تھا، وہ جل جل کر راکھ ہو گئی۔ اور سامنے بیٹھے فرخ کی مسکراہٹ وہی راکھ اس کے چہرے پر مل رہی تھی۔

"ماموں، میں سب کچھ برداشت کر سکتا ہوں مگر اپنی ماں کی بے عزتی برداشت نہیں کر سکتا۔"

(میری ماں...... میرا باپ)

ثانیہ کا دل کرلایا۔ وہ کب سے اس کے باپ کی بے عزتی کر رہا تھا۔

"لڑکیوں کو اتنا سر چڑھا رکھا ہے کہ جو چاہے بول دیں۔"

"اچھا بس کرو سہیل! یہ میرا اور میرے بھائی کا معاملہ ہے۔" آخر کار آصفہ کو بھائی پر ترس آ ہی گیا۔

"معافی مانگ تو رہا ہوں آپا۔"

"تم کیوں مانگو...... معافی وہ مانگیں جن کی غلطی ہے۔" انہوں نے خشمگیں نگاہوں سے ثانیہ کو گھورا...... اور ثانیہ نے رابعہ کی زرد رنگت کو دیکھا...... گہری سانس بھری۔

"آئی ایم سوری پھوپھو......"

"تو یہ معافی ہے۔ نہ چہرے پر شرمندگی...... نہ آنکھوں میں شرم۔"

"یہ تو بے وقوف، بے ہدایت ہے۔" شبیر احمد نے فوراً کھڑے ہو کر جگہ خالی کی اور بیٹی کو بہن کے قدموں میں کھینچ کر بٹھا دیا۔

"تم کیا کرو بھیا! میری بھاوج کی تربیت ہی ایسی ہے۔ یہ کھڑے ہیں میرے شیر جوان بچے کسی کی مجال ہے جو اپنے ماموں کے سامنے ایک لفظ بھی بول دیں۔ یہ ہوتی ہے تربیت۔" تربیت وہ جو پچھلے ایک گھنٹے سے بول رہی تھی۔

"چل مانگ معافی۔" باپ نے سر کو ٹہوکا دیا۔

ثانیہ نے جھنجلا کر سر اٹھایا۔ اب کیا کرے ہاتھ جوڑے، پاؤں پکڑے۔

"رہنے دو، اس کو پھوپھی اچھی ہی نہیں لگتی۔ ماں کی سکھائی پڑھائی ہے اور اس سے بھی پوچھ لو" آصفہ نے رابعہ کی طرف اشارہ کیا۔

"ساس اچھی نہیں لگتی تو میاں کو لے کر الگ ہو جائے۔"

"تین حرف نہ تھما دوں جو ایسی بات بھی منہ سے نکالے" رابعہ ہلدی ہو گئی۔

شبیر تھرا کر رہ گئے۔

"پکڑ لو پیر...... کیا پتا...... میری ماں کو ترس ہی آجائے۔" فرخ تو زہریلا سانپ تھا بولے گویا ڈنک مارے۔

وہ جو ہارنے والی تھی...... سرتاپا سلگ گئی۔

☆☆☆

ارم نے چائے درمیان میں رکھی اور ماں کے ہاتھ سے تصویر لے کر دیکھی۔ لڑکی خوب صورت تھی اور ساتھ میں خاندانی بیک گراؤنڈ...... پھر دور پار کے عزیز بھی تھے۔ سب بہترین تھا۔

"اچھی ہے نا؟" آسیہ نے چائے کا گھونٹ بھر کے پوچھا۔

"بہت اچھی ہے مگر......" وہ ایک لمحے کو ہچکچائی۔

"آپ عبید سے تو پوچھ لیں۔"

"ظاہر ہے۔ اس سے پوچھے بغیر تو کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ لیکن مجھے اور تمہارے ابو کو نازیہ اور اس کی فیملی بہت پسند ہے۔ مجھے یقین ہے عبید کو بھی اچھے لگیں گے۔"

"اور اگر اسے اعتراض ہوا۔" ارم سرخ لاکٹ پر اٹکی تھی۔

وہی لاکٹ جو عبید کی جیب سے نکلا تھا۔

وہی لاکٹ جو اس نے ثانیہ کے پاس دیکھا تھا۔

"نہیں ہوگا۔ مجھے پورا یقین ہے۔ میں اس کی پسند سے اچھی طرح واقف ہوں۔"

"خدا کرے ایسا ہی ہو۔" اس نے دل سے دعا مانگی۔

☆☆☆

"نہ بھئی...... شہزادی ثانیہ کی انا بہت اونچی ہے۔" فرخ کی تمسخرانہ ہنسی۔

"ثانیہ...... میں تم سے کیا کہہ رہا ہوں۔" شبیر کا بس نہ چلتا تھا کہ ہاتھ میں تلوار ہو اور ثانیہ کی گردن پر رکھ دیں۔ رابعہ کی خاموش نگاہیں بھکارن بن گئی۔ (میرا گھر بچالو)

(کبھی کبھی ہماری انا سے زیادہ اہم ہم سے وابستہ رشتے ہوتے ہیں۔ جن کے لیے ہم کچھ بھی کر گزرتے ہیں۔" عبید نے کہا تھا)

"مجھے معاف کر دیں پھوپھو۔" ثانیہ نے دونوں ہاتھ پھوپھو کے گھٹنوں پر رکھے۔ وہ جانتی تھی آصفہ اس سے کم پر راضی نہیں ہوں گی بلکہ ثانیہ شبیر کو اپنی گستاخی کی پاداش میں ان کے پیر پکڑ لینے چاہیے تھے۔

"میں نے آپ سے بہت بدتمیزی کی۔ آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔ مجھے احساس ہو گیا ہے۔ ہمارے ابا اور اس گھر پر آپ کا حق ہم سے کہیں زیادہ ہے۔"

اس کی معافی میں بھی طنز پوشیدہ تھا۔

"کیوں نہ ہو۔ تمہارا باپ بننے سے پہلے یہ میرا بھائی ہے اور وہ گھر...... وہ گھر میرے باپ کی کمائی سے بنا ہے۔ جس پر تم اور تمہاری ماں عیش کر رہے ہیں۔"

فرخ کو نجانے کس بات پر ہنسی آئی تھی۔

ثانیہ نے لب بھینچ لیے۔

"چلو خیر...... میری بھتیجی ہو جان سے زیادہ عزیز...... تم بھلے مجھے کچھ بھی نہ سمجھو۔" بالآخر معافی نامہ قبول ہو گیا تھا۔

سب کی اٹکی ہوئی سانسیں بحال ہوئیں۔

مگر رابعہ کی رنگت زرد ہی رہی۔

"فرخ جاؤ ماموں کے لیے ٹھنڈا شربت لاؤ...... پہلے بازار سے برف لے آؤ۔"

ثانیہ آہستگی سے کھڑی ہوئی۔ تو نگاہ زیرلب مسکراتے فرخ پر گئی۔ اس کی نگاہ موبائل پر جمی تھی۔ ثانیہ کو لگا وہ اسے کیمرے کی آنکھ سے دیکھ رہا ہے۔

(اللہ کرے اس کا موبائل ٹوٹ جائے یا آنکھ اندھی ہو جائے)

"نہیں آپا۔ برف کی ضرورت نہیں ہے۔ فل سائز میں نیا فریج آ رہا ہے۔"

شبیر نے آہستہ سے بتایا تو آصفہ نے بے تحاشا تعجب کا اظہار کیا۔ جیسے انہیں اندازہ ہی نہ تھا۔

"چلو...... مرضی ہے اپنی بیٹی کے لیے لائے ہو۔ اس کا دل چاہے رکھے...... دل چاہے نہ رکھے۔ میں تو پیسے چھوڑ آئی تھی۔"

واہ...... کیا تجاہل عارفانہ انداز تھا۔

رابعہ نے بوجھل پلکیں اٹھا کر شوہر کو دیکھا۔ وہ خوش ہو رہا تھا۔ فریج آ رہا تھا۔ مطلب اب سب ٹھیک تھا۔ وہ تیزی سے وہاں سے چلی گئی۔

"آپا ہم چلتے ہیں۔ سہیل بیٹا فریج دھیان سے اتروا لینا۔ میں کرایہ دے آیا ہوں۔" شبیر کھڑے ہو گئے۔

"جاؤ بھابھی سے مل آؤ۔" انہوں نے ثانیہ سے کہا مطلب بہن کو تسلی دے آؤ۔ حالانکہ اس وقت تسلی کی ضرورت خود ثانیہ کو تھی۔

(میں ایک کٹھ پتلی ہوں جس کی ڈور دوسروں کے ہاتھ میں ہے)

"ساری زندگی تمہارے باپ کی ڈور ان کے ہاتھوں میں رہی۔"

نادرہ بیٹے کے سامنے بلک رہی تھیں۔

دادی نے پلو منہ پر ڈال کر دم سادھ لیا۔

اب بولنا بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈالنے کے مترادف تھا۔

"میں یہاں چھینک بھی ماروں تو خبر تمہاری پھوپھی کو ہوتی ہے۔"

"تو بندہ آہستہ چھینک لے۔" دادی بڑبڑائیں۔

"ابا ساری زندگی نہیں سدھرے تو اب کیا سدھریں گے۔" وسیم جھنجلا کر بولا۔

"ہمیں تو بیٹی کا منہ مارتا ہے۔ میں اسی لیے رشتہ کرنا ہی نہیں چاہتی تھی۔"

"یہاں کون سا رشتوں کی لائن لگی تھی۔" دادی کی زبان میں کھجلی ہو رہی تھی۔ مگر پوتے کا لحاظ کر گئیں۔

"تم بھی ساتھ چلے جاتے۔ شاید با جماعت معافی سے تمہاری پھوپھی کا دل موم ہو جاتا۔"

"ان کا دل کا تو نیا فریج دیکھ کر ہی موم ہو جائے گا۔" وسیم کو خود بھی افسوس ہو رہا تھا۔

"میں نے فیصلہ کر لیا ہے اماں، ثانیہ کو بغیر جہیز کے نہیں بیاہوں گا۔"

"جہیز بناؤ گے کہاں سے۔ یہاں تو ڈاکے پڑتے ہیں ڈاکے۔" وہ تڑپ اٹھیں۔

"دادی اجان دیں پھوپھی کو یہ آخری بار تھا۔ آج کے بعد یہ تماشا ہوا تو رابعہ کو گھر بٹھا لوں گا۔"

دادی نے اگلی سانس بھی آہستہ لی کہیں پوتے کو خبر نہ ہو جائے کہ وہ جاگ رہی ہیں۔

☆☆☆

"شہزادی ثانیہ۔" وہ کالا بلا تھا جو ہمیشہ اس کا رستہ کاٹ جاتا تھا۔ ثانیہ رک گئی۔

"چہ...... چہ...... کتنی مجبور اور بے بس لگ رہی ہو۔"

اس کے ہاتھ میں موبائل تھا جس میں سے ثانیہ کی آواز ابھر رہی تھی۔

"مجھے معاف کر دیں پھوپھو" ثانیہ کے اعصاب جھنجنا گئے۔

فرخ نے موبائل کا رخ اس کی طرف کر دیا۔

"کیا یادگار ویڈیو ہے۔"

کاش وہ اس کا منہ نوچ سکتی...... کاش...... کاش۔

"بائی دا وے......" اس نے موبائل بند کر کے جیب میں ڈالا اور اس کی حالت سے حظ اٹھاتے دوستانہ انداز میں پوچھنے لگا۔

"تم ایسے کام کرتی ہی کیوں ہو، جس کے بعد پاؤں پکڑ کر معافی مانگنی پڑے۔"

ثانیہ نے اپنی سلگتی آنکھیں فرخ کے چہرے پر گاڑ دیں۔

"اس دن تم مجھے میری اوقات یاد دلا رہی تھیں۔" فرخ اس کی طرف جھکا۔

"تو دیکھو شہزادی ثانیہ یہ ہے تمہاری اوقات۔"

ثانیہ نے لب بھینچ لیے...... وہ چلا گیا۔ فضا میں بس اس کی سیٹی کی بازگشت رہ گئی۔

(تم دیکھنا فرخ میں تمہارے ساتھ کیا کرتی ہوں...... وہاں ماروں گی جہاں پانی بھی نہ ملے)

☆☆☆

"تو یہ ہوتی ہے ایک لڑکی کی شادی شدہ زندگی۔" وہ چھت پر کھڑی ادھورے چاند سے پوچھ رہی تھیں۔ ان کی چھت کا بلب فیوز ہو گیا تھا جبکہ عبید کے گھر کی چھت روشن تھی۔

اسے یاد آ رہا تھا اور رابعہ کی منگنی کے بعد کا وہ وقت...... جب سہیل بھائی بہانے بہانے سے کبھی ڈھیروں فروٹ...... کبھی مٹھائی تو کبھی مربعوں کے جار اٹھا لاتے...... رابعہ چھپ جاتی...... وہ دادی کے پاس بیٹھے پہلو پر پہلو بدلتے اس کی ایک جھلک کے لیے تڑپتے، ثانیہ کو اکساتے۔

"اپنی آپا سے بولو سہیل بھائی اس کے ہاتھ کی چائے پئیں گے۔"

ثانیہ چائے لے کر جاتی تو ناراض ہو جاتے۔

"یہ کیسی سہیل بھائی! آپا نے بنائی ہے۔"

"چائے کے بھوکے نہیں ہیں ہم۔" وہ غصے سے کپ کو چھوئے بغیر چلے جاتے اور پیچھے آپا بیٹھ کر رونے لگتیں۔

"اس سے تو اچھا تھا ہماری منگنی ہی نہ ہوتی۔"

اسی چھپن چھپائی میں رابعہ کی شادی ہو گئی۔ مہندی کے ساتھ ساتھ محبت کا رنگ بھی پھیکا پڑتا گیا۔ جہاں ہتھیلیاں بے رنگ ہوئیں۔ وہیں محبت کا چولا اتار بس روایتی سے شوہر بن کر رہ گئے۔

"کیسی محبت تھی رابعہ؟"

ثانیہ کی اپنی ذات میں محبت کا تصور ایسا خوش کن تھا کہ اس کا یہ انجام دل و دماغ تسلیم ہی نہ کرتا تھا۔

"سب شادی سے پہلے کے چونچلے ہیں۔" رابعہ کا آنچل آنسوؤں سے بھیگ چکا تھا۔ اب تو نکاح کے بعد مفت کی نوکرانی ہوں جس سے اپنی کم اور گھر والوں کی خدمت زیادہ کروائی جاتی ہے۔ انہی کے کانوں سے سنا اور انہی کی آنکھوں سے دیکھا جاتا ہے۔ محبت وحبت سب فضول کہانیاں ہیں کوئی مجھ سے پوچھو تو میں صاف کہوں گی۔ شادی محبت کی موت ہے۔"

"ثانیہ......" وہ حقیقت اور خواب کے بیچ ڈول رہی تھی۔ جب وہ آ گیا۔

"کیا سوچ رہی ہو؟" وہ پورے کا پورا روشنی میں نہایا تھا۔

ثانیہ نیم تاریکی میں کھڑی تھی۔

"میں بہت بدنصیب ہوں عبید۔"

"میں ہوں تمہارا نصیب، مجھے برا نہ کہو۔"

"میری محبت اور میرے ساتھ میں سے کسی ایک کو چننا پڑا تو کیا کرو گے؟"

"یہ کیسا سوال ہے؟"

ثانیہ نے رخ بدلا...... اب وہ عین اس کی نظروں کے سامنے تھا۔ دیوار پر کہنی ٹکائے اس کو دیکھ رہا تھا۔

"جواب نہیں ہے نا۔ میرے پاس بھی نہیں تھا۔"

"تم کسی الجھن میں ہو؟"

"بہت بڑی الجھن ہے۔"

"آج مجھ سے بھی نہیں کہو گی۔"

ثانیہ نے نفی میں گردن ہلا دی۔

"تو ٹھیک ہے آج تمہاری ساری الجھنیں دور کر دیتا ہوں۔"

عبید نے جیب سے کچھ نکالا اور بند مٹھی اس کے سامنے کر دی۔

"تم چاہتی تھی نا کہ میں تمہارے لیے کچھ الگ لے کر آؤں۔ جو رسم و رواج کے تحفوں سے مختلف ہو۔"

ثانیہ نے کچھ الجھن کے ساتھ اس کا ہاتھ چھو لیا۔

عبید نے مٹھی کھولی۔

"یہ کیا ہے؟" اس کی چوڑی ہتھیلی پر رکھی انگوٹھی کا نگینہ روشنی میں جگمگا رہا تھا۔

"آؤ، اس مقدس رشتے کو باقاعدہ نام دے دیں تاکہ آج کے بعد ہمیں اس طرح چھپ کر ملنا نہ پڑے۔"

وہ منتظر تھا۔

وہ متذبذب۔

اور درمیان دونوں کے درمیان کھڑی کہہ رہی تھی۔

"شادی محبت کی موت ہے۔"

"میں کل ہی امی...... ابو کو تمہارے رشتے کے لیے بھیجتا ہوں۔"

ثانیہ نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا پھر واپس کھینچ لیا۔

"نہیں......"

"کیا نہیں؟"

"میں عبید کو نہیں کھو سکتی...... میں تم سے شادی نہیں کر سکتی۔"

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

اور قسمت کہاں لے آئی

سونیا بانی

کبھی کبھی عمر بیت جاتی ہے اور ہم سمجھ نہیں پاتے کہ آخر ہم سے کیا غلطی ہوئی ہے۔ ہم نے ایسا کیا کر دیا ہے کہ ہم سامنے والے کا دل نہیں بدل سکتے ہیں۔ مجھے سب سے بہت زیادہ پیار ملا تھا آنکھ کھولی تو اپنے لیے الگ دنیا پائی، جہاں سب میری پسند سے ہوتا تھا۔ میں رانی تھی اس دنیا کی شروع سے سب کچھ میری خواہش اور مرضی کا ہوتا رہا تھا۔ گھر میں سب کی آنکھوں کا تارا تھی کہ میری کوئی پھوپھو نہ تھیں اور نہ ہی کوئی کزن نہ بہن۔

یوں اللہ جانے کتنے زمانے بعد دادا کے آنگن میں ایک پری اتری اور سب نے مجھے سچ مچ پری اور شہزادی بنا لیا۔ مجھے نانا کے آنگن بھی وہی پیار ملتا تھا کہ میں اکلوتی نواسی تھی۔

لیکن وہاں دو آنکھیں ایسی تھیں۔ جن کی پہلے تو سمجھ میں نہ آئی تھی۔ مگر زندگی کی نئی بہاریں گزار کر مجھے احساس ہو گیا کہ ان آنکھوں میں میرے لیے نفرت ہوتی ہے، باتوں میں غصہ اور دل میں زہر بھرا ہے ممانی اور ماموں تو جان دیتے تھے مجھ پہ۔

مگر ان کی عقل مند بیٹی تھی وہ مجھے سخت ناپسند کرتی تھی۔ وہ اپنے پورے گھر کو چلا رہی تھی، اسکول میں پڑھاتی تھی ہر بات میں اس کا مشورہ ضروری ہوتا تھا لیکن جب میں جاتی تو ماموں کہتے۔

"آج کھانا سیماب کی پسند کا بنے گا بلکہ سیماب ہی آج کھانا بنائے گی۔"

اس کا بس نہیں چلتا تھا۔ کہ مجھے اٹھا کر باہر پھینک دے۔

میں اسے بہت بری لگتی تھی۔ مگر اس کے دل میں اتنی نفرت ہوگی مجھے یہ معلوم نہ تھا۔ اس نے اس نفرت میں بہت کچھ جلا ڈالا۔ بہت کچھ ختم کر ڈالا صرف اس وجہ سے کہ وہ میری شکل نہیں دیکھنا چاہتی تھی اس نے عمیر بھائی سے شادی سے انکار کر دیا جبکہ عمیر بھائی اسے بہت پسند کرتے تھے اور وہ اچھی طرح جانتی بھی تھی مگر وہ نہ مانی۔

وجہ کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ مگر میں اچھی طرح جانتی تھی۔ اس کے انکار کی وجہ سے عمیر بھائی چلتا کاروبار چھوڑ کر دبئی چلے گئے مگر اسے فرق نہ پڑا۔

اور پھر اس نے مزے سے میرے رشتے کے بارے میں سب سے کہا کہ بڑے تایا نے کب کا مجھے مانگ رکھا ہے جبکہ سارے خاندان والے ابھی مجھے بچی ہی سمجھتے تھے لیکن وہاں اس نے میرا رشتہ بھی پکا کر دیا تھا۔

اب سوچتی ہوں تو حیرت ہوتی ہے کہ اگر میں اکلوتی بیٹی اور اکلوتی نواسی تھی تو اس میں میرا کیا قصور تھا۔ سب کو اپنے نصیب کی محبتیں ملتی ہیں اس کے حصے میں کم آئی میرے زیادہ، یہ کوئی قصور تو نہ ہوا ناں۔

ہاں انسان کے حصے میں نفرت بھی تو آتی ہے ہاں اپنے نصیب کی تو اس کے حصے میں نہ آئی اور میرے مقدر میں لکھی گئی اس کی بے پناہ نفرت۔

آج کوئی چھ سال بعد وہ مجھے شدت سے یاد آئی تھی۔

اور وجہ یہ تھی کہ اپنی ساس کے منہ سے میں نے نیلم کا نام سنا تھا۔ وہ کہہ رہی تھیں۔

"مجھے تو نیلم بہت اچھی لگی ہے۔ بہت سادہ اور سمجھدار لڑکی ہے مجھے تو پسند آ گئی ہے شکر ہے کہ اسلم کو عقل آئی، تیاری کرو سیماب! جلد ہی تمہارا ہاتھ بٹانے والی آ رہی ہے۔ اللہ نصیب اچھا کرے اس کا کیا نام تھا۔" ان کو یاد نہ رہا تو مجھ سے بولیں۔

"اماں! نیلم بتایا تھا آپ نے۔" میں نے یاد کروایا۔

☆☆☆

اسلم بھائی میرے جیٹھ تھے اور ایک بیٹے کے باپ بھی تھے۔ میری شادی سے پہلے ہی ان کی بیوی اس دنیا سے منہ موڑ گئی تھیں اور پیچھے صرف چار مہینے کا بچہ چھوڑ گئی تھیں۔ اسلم بھائی نے دوبارہ شادی کا نام بھی نہ لیا اور نہ اماں بی کو لینے دیا۔

پہلے اس نے کو میری نند رمشا نے سینے سے لگا کر رکھا اور جب وہ دو سال کا تھا تو رمشا کی شادی کر دی گئی مگر ساتھ ہی رمشا کے بھائی کی دلہن نے بھی آنگن میں قدم رکھا تھا اور پہلے دن ہی اماں بی نے چھوٹا عاشر میری گود میں ڈال دیا۔

مجھے بھی وہ بہت پیارا لگا تھا اور میں اپنے بچوں سے پہلے اس بچے کی ماں بن گئی۔ جس کی ماں نے پیدا کر کے اس کی صورت بھی نہ دیکھی تھی۔ اور ہمیشہ کی نیند سو گئی تھی۔ جلد ہی وہ مجھے ماما کہنے لگا اور کچھ عرصے بعد اسے ماہ نور کی صورت میں ایک گڑیا مل گئی اماں بی کی بڑی آرزو تھی کہ اسلم بھائی شادی کر لیں مگر وہ نہیں مانتے تھے۔

ایک ہفتہ پہلے انہوں نے حیران کر دیا کہ ان کے ساتھ کوئی خاتون پڑھاتی ہیں۔ کچھ ماہ پہلے آئی ہیں۔ بہت لگن سے کام کرتی ہیں۔ بہت اچھا بولتی ہیں اور بچوں سے بہت پیار کرتی ہیں۔ اس، باپ بھی نہیں ہیں۔ بھائی ہیں مگر سب شادی شدہ ہیں اور ان کو ان خاتون کی ذات میں ذرہ برابر دلچسپی نہیں ہے۔ سرکاری نوکری ہے۔ ہوسٹل میں رہتی ہیں۔ میں نے ان سے شادی کا فیصلہ کر لیا ہے۔

اور اماں بی پہ گویا خوشیوں کی برسات ہو گئی تھی۔

دوسرے دن ہی وہ صبح صبح اسلم بھائی کے ساتھ چلی گئی تھیں تاکہ خود ان سے مل سکیں۔ یہ سب میرے بغیر نہ ممکن تھا مگر میری حالت ایسی تھی کہ میں چاہ کر نہ جا سکی کیونکہ میں امید سے تھی اور آخری ماہ چل رہا تھا۔

خیر اماں ہل کر او کے کر کے آ گئیں۔ اماں نے تو کہا تھا کہ وہ گھر میں مشورہ کر کے جواب دیں گی۔ مگر اس کی طرف سے شام کو ہی کال آ گئی۔

"ٹھیک ہے آپ لوگ دو ہفتے بعد بارات لے آئیں اور بارات میرے گھر آئے گی۔ صرف میں لوگ ہوں گے۔ میں اپنے گھر سے رخصت ہو کر آؤں گی۔ یوں رمشا بھی سسرال سے آ گئی کیونکہ میں کوئی کام نہیں کر سکتی تھی رمشا نے بہت ہمت کی۔

عاشر بھی خوش تھا نور کی طرح وہ بھی سمجھ رہا تھا کہ اس کی تائی آ رہی ہیں۔

سادہ سی شادی تھی مگر پھر بھی کئی چکر لگ گئے اماں بی اور رمشا کے بازار کے۔ مہندی تو نہ تھی ہاں اسلم بھائی نے شادی والی رات کو ولیمہ ضرور رکھا تھا چھوٹا سا۔

بارات کو گاؤں جانا تھا اس لیے سفر لمبا تھا میری مرضی بھی نہ تھی اور اماں بی نے بھی کہہ دیا کہ تم گھر پہ ہی رہنا مسرت جان تمہارا خیال رکھے گی۔ مسرت جان میرے شوہر کی پھوپھی تھیں۔

یوں صبح گیارہ کے قریب بارات چلی گئی تو میں نے اور مسرت پھوپھو نے مل کر گھر کی صفائی کی۔ اسلم بھائی کی نئی دلہن کے لیے ہم نے بڑا کمرہ خالی کیا تھا کیونکہ اسلم بھائی کے کمرے میں جگہ نہ تھی، وہاں تو ثوبیہ بھابھی کا سامان رکھا تھا خیر مسرت پھوپھو بڑی تعریف کر رہی تھیں کہ اتنا سامان ہے اعلا سے اعلا ہر چیز۔ تو میں نے بھی اندر جھانک کر دیکھا۔ سچ مچ ہر چیز اپنی قیمت خود بتا رہی تھی اور دنیا جہاں کا سامان تھا آدھا باہر برآمدے میں پڑا تھا میں نے ابھی دیکھا تھا۔ یعنی سب ویسے ہی تعریف نہیں کر رہے تھے۔ سب دلہن نے خود خریدا تھا۔

"چلو اللہ نصیب اچھے کرے اور یہ سب سامان ان کو استعمال کرنا نصیب ہو۔" میں نے پورے دل سے دعا دی۔

جو بھی ہو میری جگہ کوئی نہیں لے سکتا ہے میری ساس تو کپڑے بھی میری پسند کے لیتی تھیں عاشر کی وجہ سے جو عزت اور جگہ مجھے مل چکی تھی۔ وہ اب میری ہی تھی کیونکہ وہ آنے والی خاتون عاشر کی تائی اماں ہوں گی۔ وہ اسلم کو تایا ہی کہتا تھا جبکہ اسے معلوم تھا اس کے ابا کا نام اسلم ہے مگر وہ ہمارے ساتھ رہتا تھا۔

☆☆☆

رات آٹھ بجے کے قریب دلہن آ گئی۔

اماں بی پہلے میرے پاس آئیں میری خیریت پوچھی پھر مجھے دلہن کے کمرے میں ساتھ لے آئیں۔

کچھ رشتے دار عورتیں بچے کمرے میں موجود
کچھ عورتیں ثوبیہ بھابھی کو یاد کر رہی تھیں انہوں
میرے لیے بیڈ پہ جگہ بنائی اور مجھے بیٹھنے کو کہا
میرے سامنے سے ہٹتے ہوئے بولیں۔

"نیلم! یہ سیماب ہے میرے گھر کی رو
میرے گھر کی رانی، میرے بچوں کی ماں بے شک
بڑی بہو ہو۔ مگر میرے لیے سیماب بڑی بہو کا در
رکھتی ہے۔"

اس کے ہونٹ بے آواز ہلے تھے اس نے
نام لیا تھا شاید زلزلہ تو مجھ پہ بھی آیا تھا۔ میرے سا
دلہن بنی نیلی بیٹھی تھی مجھے اپنی آنکھوں پہ یقین نہیں
رہا تھا وہ میری شکل دیکھنا پسند نہیں کرتی تھی اور ا
نے ہماری قسمت ایک گھر میں لکھ رکھی تھی۔

اگر عمیر بھائی سے رشتہ ختم کرنے کے
ماموں ہر رابطہ ختم نہ کرتے تو آج وہ یہاں نہ ہوتی
ماموں کے گھر والے میری شادی میں آئے نہ کوئی
جلنا رکھا اور میں تو ممانی کے مرنے پہ بھی نہ جا سکی
کہ میری ساس اسپتال میں داخل تھیں۔ ماموں
مرنے پہ اماں کے ساتھ گئی تھی یوں وہ میرے
سسرال کو نہیں جانتی تھی۔

نہ اس میں کچھ کہنے کی ہمت تھی اور نہ مجھ میں۔
وہ بس مجھے دیکھ رہی تھی۔ غور سے دیکھ رہی تھی خال
نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

ہاں خالی نظریں۔ ان میں وہ نفرت نہیں تھی۔

مگر اماں بی اسے بتا چکی تھیں کہ میں ان کے گھر کی رونق ہوں اور اب بتا رہی تھیں۔ کہ ہمارے گھر میں سب سیماب کی مرضی سے ہوتا ہے۔ اس کی پسند بہت اچھی ہے۔ تمہارا کمرہ اسی کی مرضی سے سیٹ ہوا ہے جبکہ ایسا نہیں تھا اسلم بھائی نے کمرہ سیٹ کیا تھا نیلی کو دیکھ کر لگ رہا تھا ابھی رونا شروع کر دے گی کیونکہ اور کچھ کرنا اب ممکن نہیں رہا تھا۔

☆☆

ناولٹ
شازیہ الطاف ہاشمی
زرد رُتوں کا چاند

وہ پورے چاند کی رات تھی ہر طرف روشنی پھیلی ہوئی تھی ایسے میں چھوٹے چچا کی فیملی خوش گپیوں اور کھانے پینے میں مشغول تھی۔

چھوٹے چچا ایسے امیر کبیر بھی نہیں تھے مگر ان سب کے چہروں پر رعب اور اعتماد ضرور تھا۔ ایسا اعتماد حور جہاں کو میسر نہیں تھا۔ چچا کی ساری بیٹیوں کے درمیان صرف اسی نے سر پر دوپٹہ اوڑھا ہوا تھا ورنہ باقی سب کزنز، دوپٹہ اتار کر سائیڈ پہ کر کے یا پھر گلے میں لٹکا کر ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں آ جا رہی تھیں۔ ان کے چلنے پھرنے کھانے پینے سب میں اک خاص ادا تھی دل کو لگتی ہوئی سی۔ رانیہ اور سحر اسی کی ہم عمر تھیں مگر نصیب ایک جیسے نہیں تھے اس لیے بات چیت بھی نہ ہوئی، وہ ڈری سہمی اس سارے ماحول سے الگ دکھائی دینے والی سب سے الگ ہی بیٹھی ہوئی تھی موسم اچھا خاصا خوش گوار تھا۔

رعب داب والے چچا مصطفیٰ کرسی پر بیٹھے ٹیبل پر دھرے کھانے سے خوب لطف اندوز ہو رہے تھے پھر برتن اٹھانے کی باری آئی تو چچی شائنہ کے بجائے وہ خود ہی اٹھ کر برتن سمیٹنے لگی تھی اور کسی نے منع بھی نہیں کیا۔ کچھ نہ کچھ اعتماد بحال ہوا تھا۔ اس گھر میں اس کا کوئی درجہ تھا بھلے کچن میں برتن رکھے جانے کا ہی۔ کسی اسد، معاذ، رانیہ اور سحر سارے مل کر لڈو کھیل رہے تھے۔ خوب شور ہو رہا تھا...... بس اسی شور اپنے پن محبت کی اسے بھی ضرورت تھی۔

نظر انداز کی گئی اولاد میں ایک خانہ ہمیشہ خالی رہ جاتا ہے محبت کے اس خانے کو اسے بھی بھرنا تھا مگر نہ ماں نے کوئی توجہ دی نہ باپ نے۔ جب سے ابا نے دوسری شادی کی تھی وہ اس سے جان چھڑاتے پھر رہے تھے، کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر مارتے رہتے یا پھر کوسنے کا سلسلہ شروع رہتا بڑی سے ہی تعلیمی سلسلہ ختم ہو گیا تھا۔

ماں خود تو مر گئی جاتے جاتے اسے بھی زندہ درگور کر گئی تھی۔

ٹیچر نے کتنا کہا تھا حور جہاں بہت ذہین ہے بہت آگے جائے گی مگر ابا نے کسی کی نہیں سنی حور جہاں کو بہت پیچھے دھکیل دیا تھا۔

نئی امی سے اس کا ایک بھائی بھی پیدا ہو گیا تھا۔ امی اور ابا دن رات اسی کے مستقبل کے منصوبے بناتے رہتے۔ اس کے لیے یہ خریدیں گے۔ ایسے والا میں گے ایسے کپڑوں میں ایسا لگے گا تو وہ کپڑوں میں سب سے الگ، اسی کے لیے چیزیں جوڑتے اور اسی کے لیے خواب دیکھتے۔

وہ نہ کسی کے خواب میں آئی نہ کسی نے اس کے لیے خواب دیکھے، ایسے بے خوابی بے بسی کے دنوں میں جب ابا اپنے چھوٹے بھائی مصطفیٰ سے ملنے جانے لگے تو ساتھ وہ بھی تیار ہو گئی تھی۔ آئے دن کے جھگڑوں سے تنگ تھکے تھکے سے ابا نے اسے دیکھا اور شاید شکر ادا کیا۔

"کیا میں بھی چلوں۔" امی نے اسے جس نظر سے دیکھا تھا۔ مطلب صاف تھا کہ چند روز کے لیے ہی سہی اس کام بگاڑنے والی منحوس سے چھٹکارا ملے تو سہی انہیں تنہائی کی ضرورت تھی بھلے چار چھ دن کی ہی کیوں نہ ہو۔ ابا اور امی نے نہ اس کے کپڑے دیکھے نہ جوتوں پر نگاہ کی۔ ایک میلے سے دوپٹے میں لپٹا اس کا کمزور سا وجود ان کے ساتھ بس میں سوار ہو گیا تھا۔

امی بھائی کو چومنے سے چمٹانے اندر چلی گئی تھیں۔ رواں رواں بس میں اس کے کانوں سارے الجھے خیال سلجھ گئے تھے۔

"دنیا کتنی بڑی ہے اس میں ایک ذرا سی جگہ میرے لیے ہی نہیں ہے۔"

ابا نے جاتے وقت دس روپے بھی اسے نہیں دیے تھے۔ انہیں بس اپنی محبوب بیوی کے پاس جانے کی جلدی تھی اور بیٹے کو پیار کرنے کی شدید تمنا تھی کاش امی کے ساتھ میں بھی مر جاتی۔ اس نے وہاں کچھ دن رہنے کی بات کی تو ابا نے چچا کے جواب کا بھی انتظار نہیں کیا تھا۔ بس ہامی بھر کر چلے گئے تھے۔

چچا مصطفیٰ نے اپنے گھر کے آنگن میں کھڑی ملازمہ نما بھتیجی کا کوئی خاص نوٹس نہیں لیا تھا۔ ایسے جیسے کوئی گھر میں آیا ہی نہ ہو بھلا وہ بھی کوئی مہمان تھی۔ ویسے بھی وہ دونوں بھائی کم اور دور پرے کے انجان رشتہ دار زیادہ لگتے تھے۔ سالوں سے مصطفیٰ چچا کو اس نے نہیں دیکھا، نہ آنا نہ جانا۔ اب بھی ابا جائیداد میں سے اپنا رہ جانے والا حصہ لینے ہی آئے تھے یہ مسئلہ حل ہوا کہ نہیں، اسے نہیں معلوم ہو سکا۔

چچی نے کھانا اس نے خود ہی جا کر کچن میں لے لیا تھا۔ وہ اسے دیکھ کر خوش نہ ہوئی تھیں تو بے نیاز بھی نہ تھیں۔ اتنا ہی بہت تھا۔ شائنہ چچی نے جب شام میں ہوم ورک کے بعد بچوں کو ٹی وی دیکھنے کی اجازت دی تب وہ بھی ایک کونے میں نیچے صوفے کے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی تھی۔ بہت ہی مزے دار انگلش مووی تھی جو دنیا سے بے خبر کر دیتی تھی۔ ایک الگ ہی رنگین دنیا کی کہانی وہ اس انہماک سے پہلی بار دیکھ رہی تھی، ورنہ گھر میں تو امی کا بس چلتا تو اس سے ہمسایوں کے گھر کا کام بھی کروانے لگتیں۔

"یہ فارغ بیٹھی رہتی ہے، مصروفیت رہے گی چلو۔"

یہاں شیطان کی آنت کی طرح کے کام نہیں تھے ٹی وی دیکھنے کے بعد سب نے کتابیں نکال لی تھیں، کوئی فرسٹ ایئر میں تھا کوئی لاسٹ ایئر میں سب ہی کاغذ قلم کتابوں میں مصروف ہو گئے تھے۔

وہ چپ چاپ بس انہیں دیکھ رہی تھی۔ کتابوں کی خوشبو تو اسے بھی بہت پسند تھی مگر کچھ چیزیں ہماری قسمت میں نہیں ہوا کرتیں۔ ہم چاہ کر بھی نصیب سے زیادہ نہیں لے سکتے۔ اس نے اتنی سی عمر میں زمانے کی ٹھوکریں کھائی تھیں جتنی ان میں سے کسی کو تکلیف نہیں پہنچی تھی جتنی اسے پہنچی تھی۔

صبح اچار کے ساتھ پراٹھا تھا۔ دوپہر چاولوں کے ساتھ رائتہ عجیب بے فکرے سے دن تھے نہ لعنت نہ پھٹکار۔

وہ آتے جاتے سب کو دیکھتی رہتی۔ چچی نے خود ہی رانیہ کا پرانا سوٹ اسے نکال کر نہانے کا کہہ دیا تھا۔ اتنے کھلے پانی میں صابن کے ساتھ نہاتے ہوئے یہ پہلا دن تھا، ورنہ وہ بھیگ بھیگ کر بسائند زدہ کپڑے ہی پہنے پھرتی اور پھر ابا کہتے کہ یہ پاگل ہے اسے بو محسوس ہی نہیں ہوتی۔

نہا دھو کر اسے کافی حوصلہ ملا تھا۔ پرانا سوٹ بھی اس نے سرف سے دھو لیا تھا۔ جوتے رانیہ کے پہن لیے تھے۔ کاش میرے والدین بھی میرا ایسا ہی خیال کرتے۔ میں نے کون سا شہزادی بننے کے خواب دیکھے تھے بال بنا کر وہ سب سے ذرا دور ہو کر بیٹھی تھی۔

اسے چچا مصطفیٰ سے کوئی اپنائیت محسوس نہ ہوتی تھی نہ چچا والے لاڈ انہوں نے کیے نہ وہ بھتیجی بن کر ان سے لپٹی۔ وہ اسے ایک حد میں رکھ رہے تھے۔

شام کی محفل اپنے عروج پر تھی۔ چاند کی روشنی میں سب کے چہرے کچھ کچھ واضح ہو رہے تھے۔ بجلی گئی ہوئی تھی۔ لیکن موسم خوش گوار تھا۔

"رانیہ، سعدیہ لو بھئی سنو، میں حور جہاں سے کچھ پوچھ رہا ہوں۔"

حور جہاں کا ڈرا ہوا دل اس ذرا سی ہنسی میں بھی دھڑک اٹھا تھا۔ کوئی اس کے لیے مسکرا بھی سکتا ہے۔ چچا مصطفیٰ کے لبوں کے کناروں میں ہلکی ہنسی دبی تھی۔ سب اسی کی طرف متوجہ تھے چچی شائنہ بھی اسے دلچسپی سے دیکھ رہی تھیں۔

"حور جہاں ہمیں نماز سنائے گی۔" ہر طرف قہقہے گونج اٹھے تھے۔

وہ سولہ سترہ سال کی تھی اور اس سے نماز سنی جا رہی تھی۔ چچا جان اس کا مذاق اڑانے کی کوشش کر رہے تھے۔ اور پوری توجہ سے اپنے اندازے درست ہونے کا انتظار کر رہے تھے کہ حور جہاں کو نماز بھی نہیں آتی سب کی بھرپور توجہ اس پر تھی۔ وہ سمجھے تھے کہ حور جہاں کو نماز بھی نہیں آتی ہوگی وہ بھی کہ چچا اسے اپنے بچوں کی طرح آئس کریم کا چھوٹا کپ دلوائیں گے یا پھر کوئی پیار بھری بات۔ انہوں نے اسے بیچ مجمع کے ذلیل کرنے کی کوشش کی تھی۔

اس نے ڈرتے ڈرتے سارے سوالوں کے جواب دیے۔ اور نماز بھی پوری سنا دی تھی۔ چچا کو مایوسی ہوئی تھی۔ وہ جس طرح کا مزاح پیدا کرنا چاہ رہے تھے ایسا نہیں ہوا تھا۔

البتہ پاس بیٹھا اسد بول پڑا تھا۔

''پاپا! یہ بہت ذہین ہے، اسے کافی کچھ آتا ہے۔'' مگر چچا نے نوٹس نہیں لیا۔ بلکہ اس کا امتحان لینا جاری رکھا اور ہر مقام پر اس لاوارث بھتیجی کو نیچا دکھانا چاہا تھا مگر ناکام ٹھہرے تھے۔ اسے ابا کا انتظار تھا ابا نے مڑ کر اس کی خبر نہ لی تھی ادھر بھی اس نے اپنی مرضی سے برتن مانجھے اور دیگر چھوٹے موٹے کام کیے تھے مگر دوبارہ چچا کی جھوٹی ہنسی کا دھوکا نہیں کھایا تھا ان کی مسکراہٹ سچی نہیں تھی اس نے جان لیا تھا۔ کبھی کبھی کچھ ایسے رشتے بھی ہوتے ہیں اور ان میں نہ محبت نہ احساس کچھ بھی نہیں ہوتا۔

☆☆☆

وقت کافی گزر گیا تھا اس کا بھی گزر گیا تھا۔

ایک دن جب وہ کچن اچھی طرح چمکا کر نکلی تھی تو دوپٹے سے اپنے ہاتھ صاف کرتے اس نے چچی شائستہ کو آتے دیکھا تھا لیکن ان کے ساتھ ان کی بہو شیزا معاذ کی بیوی نہیں تھی۔ وہ کھاتے پیتے کی لڑکی تھی اسے کسی کی پروا نہیں تھی وہ چچا کے بھی ہوش ٹھکانے لے آئی تھی اور معاذ وہ بیوی کی سائیڈ لیتا تھا اور اس کے ہاتھوں میں کھیلتا تھا یہ صورت حال دیکھ کر اسد نے صاف انکار کر دیا تھا کہ وہ کسی اونچے خاندان کا داماد نہیں بنے گا۔ شائستہ چپ ہو گئی تھیں۔

معاذ کی بیوی شیزا نے ان کا بہت ہی برا حال کیا تھا۔ کتنے ارمانوں سے گڈے گڈی کا کھیل سجایا تھا مگر اس میں آگ لگ گئی تھی۔

چچا مصطفیٰ نے آج وہ سنا تھا جو انہوں نے کبھی خواب میں بھی نہ سوچا تھا۔

''اگر حور جہاں دل کو لگے تو ٹھیک ہے۔'' اسد اپنا مطالبہ پیش کر کے چلا گیا تھا۔ چچا مصطفیٰ کی حقارت کی کوئی حد نہیں تھی۔

اس ننگے پیروں والی غریب لڑکی سے بہتر تھا کہ اسد شادی ہی نہ کرے مگر شاید آخر میں ہار گئی تھیں، "یہ کوئی شدید قسم کا عشق نہیں تھا بس خدمت گزار طلب تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کی بیوی شیزا جیسی مغرور نہ ہو اور حور جہاں نے غرور کرنا کس بات پہ تھا؟ اس کے پاس کیا تھا، بھلا ایک اپنا وجود اور اس کے لیے بھی کہیں کوئی جگہ نہیں تھی۔ امی نے فوراً ہاں کر دی تھی۔ ابا سے پوچھے بغیر۔

ابا بھی اسے دانت پیس پیس کر دیکھ کر تھک گئے تھے جیسے محبت گھر میں گھس آئی ہو۔ وہ ساری عمر پیاسا رہتا ہے۔

حور جہاں نے اسد کی ہر بات سچ کر دکھائی تھی۔ وہ واقعی خدمت گزار تھی نہ کوئی نخرہ نہ چالاکی بس دو وقت کی روٹی میں ہی راضی، سونے کے لیے بستر میسر تھا تو گویا ساری دنیا کی نعمتیں قدموں تلے تھیں، جو چاہا تھا وہ پایا تھا اور گھر میں کسی کے دل میں اس کے لیے جگہ ہو نہ ہو چچا مصطفیٰ اسے آج بھی وہی سمجھتے تھے حقیر اور غریب۔

البتہ اسد آہستہ آہستہ اس سے متاثر ہوتے ہوئے محبت کرنے لگا تھا وہ اس محبت کی حق دار بھی تھی۔ شائستہ سب سے شیزا کا تعارف فخر سے کرواتیں اور حور جہاں کی باری چپ ہی ہو جاتیں وہ ذرا بھی گریس فل نہیں تھی۔ سادی سادی اور سادی۔

پھر آہستہ آہستہ لانے والوں نے خود ہی اسے قبول کرنا شروع کر دیا تھا۔

☆☆☆

زندگی آگے بڑھ گئی تھی۔ سعدیہ رانیہ بھی اپنے گھر کی ہو گئی تھیں کبھی کبھی چکر لگا لیتیں انہیں حور جہاں سے کوئی شکایت نہیں تھی۔ حتیٰ کہ شیزا جیسی غرور سے بھری ماڈل نے بھی اسے کچھ بھی غلط نہیں کہنا چھوڑ دیا تھا۔ وہ بھی آہستہ آہستہ زندگی کے ستم بھول رہی تھی۔ امی ابا نے اس کی خبر نہ لی تھی وہ اپنا مستقبل بنانے میں مگن تھے۔ اب انہیں ارسلان کی پہلے سے بھی بڑھ کر پروا ہونے لگی تھی۔ اتنا وقت کہاں تھا کہ پلٹ کر حور

کی خیر خبر لینے میں وقت ضائع کرتا۔ اس نے بھی جان لیا تھا پیچھے مڑ کر دیکھنا چھوڑ دیا تھا۔

پتا نہیں اس کے گھر میں کیا ہو رہا ہوگا وہ پیپل کا درخت کیسا ہوگا اور اس کی ٹھنڈی چھاؤں کیسی ہوگی۔ اتنے سارے پیارے سوال تھے جو اس چوکھٹ سے جڑے تھے مگر اس کے لیے وہاں جگہ نہیں تھی تو وہ جا کر انہیں تنگ کیوں کرے۔ کیوں جا کر انہیں یاد دلائے کہ میں ابھی زندہ ہوں شاید امی کو اس کا وہاں چلے آنا اچھا نہ لگے۔ وہ تو یوں بھی اس کو دیکھتے ہی موڈ خراب کر لیتی تھیں اور ابا رات دن انہیں منانے میں لگے رہتے۔ مڑ کر بھی اس سے پوچھا ہی نہیں کہ ''حور تم ناراض تو نہیں ہو گئیں؟''

چچا مصطفیٰ کی بے کلی کبھی ختم نہیں ہوئی تھی۔ آج بھی وہ کسی کی کسی کوتاہی کی تلاش میں تھے مگر کچھ ہاتھ نہیں لگا تھا۔ ساس کے فرائض وہ بخوبی سرانجام دے رہے تھے مگر اس بات سے مکمل بے خبر تھے کہ ان کے پرہیزی کھانے اور چائے وغیرہ وہ ہی بنا کر دیتی ہے، شیزا صرف اپنا ناشتہ بناتی ہے۔ کسی کو پوچھتی بھی نہیں۔ معاذ اور شیزا کے کمرے سے زور زور سے بولنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

شائستہ چچی رو رو کے کرسوئی تھیں۔ اس میڈیسن کا اثر کافی عجیب تھا۔ وہ نیم غنودگی میں چلی جاتیں۔ اٹھنے کی کوشش میں چکرا کر رہ جاتیں۔ ان میں وہ بات نہیں رہی تھی ان کا لمبے بالوں کا جوڑا اور رنگ برنگے لباسوں سے بھرا زمانہ حور جہاں کو اچھی طرح یاد تھا مگر وقت چپکے چپکے گزرتا رہتا ہے ہمیں بہت پیچھے چھوڑتے ہوئے۔ وہ چچا مصطفیٰ سے اچھی تھیں کم از کم خواہ مخواہ کسی کے لیے دل میں میل نہ رکھتی تھیں۔

وہ کچن میں کھڑی برتن دھو رہی تھی۔ اتنے سارے برتنوں کا ڈھیر تھا پر اس کے چہرے پر کوئی شکن نہ تھی۔ اسد نے کہا تھا کہ وہ جلد ملازمہ کا بندوبست کر دے گا۔ اسے خوشی سی محسوس ہوئی تھی کہ کوئی تھا جسے اس کا بھی خیال تھا۔ اس کی تھکن کا احساس تھا جو اس کا خیال رکھتے ہے۔

اسد کا اس کے لیے خیال بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ مجھ سے محبت کرتا ہے۔'' یہ خیال خوش کن تھا۔ بہت پیارا۔

☆☆☆

شیزا بپھرے ہوئے شیر کی طرح دھاڑ رہی تھی۔ اس نے پیزا آرڈر کیا تھا وہ اپنے کمرے میں تھی، جب شائستہ چچی نے اسے وصول کیا تھا۔ اب وہ پڑے پڑے ٹھنڈا ہو گیا تھا جس پر شیزا کا غصہ آسمانوں کو چھونے لگا تھا بلیک کرتی اور گرین چھوٹے سے دوپٹے میں اس کا رنگ غصے سے دہک رہا تھا۔

''ذرا تمیز نہیں ہے۔ یہاں کسی کو پروا ہی نہیں ہے۔ گھر ہے کہ جنگل۔''

اس کی چیخ پکار بند ہونے میں نہیں آ رہی تھی حور اپنے کام کاج میں لگی ہوئی تھی۔ اس طرح کے خود پسند لوگوں کو سمجھانا بے وقوفی کے سوا کچھ نہیں۔ کل ہی شیزا کی امی لدی پھندی آئی تھیں اور اس کے پاپا بھی کافی کیش وغیرہ دے کر گئے تھے۔ اس نے خود اسے سارے نوٹ گنتے ہوئے دیکھا تھا۔ شاید ان ہی کا خمار تھا جو محترمہ نیند سے بیدار ہی نہ ہو رہی تھیں اور تو اور انہوں نے شائستہ چچی کی اچھی خاصی بے عزتی بھی کی تھی کہ وہ لوگ ان کی بیٹی کو آرام سے رہنے نہیں دے رہیں۔ شائستہ چچی بے چاری نے کیا تنگ کرنا تھا۔ فالج کے دو اٹیک ہو چکے تھے ہارٹ پیشنٹ علیحدہ تھیں۔ مصطفیٰ چچا نے بھی اسے تو کبھی کچھ نہیں کہا البتہ معاذ کو اونچی آواز میں ضرور سمجھاتے تھے کہ تمہیں اپنی بیوی کو سیدھا رکھنا چاہیے مگر وہ ذرا سی ٹیڑھی نہیں تھی۔ ساری کی ساری ہی الٹی تھی۔ الٹی لگا کو سیدھا کرنا ممکن نہیں تھا اور اسی پر اعتراض ہو رہا تھا۔

☆☆☆

رانیہ اور سحر ملنے آئی ہوئی تھیں۔ دونوں اپنے گھروں میں خوش آباد تھیں مگر چھوٹے موٹے گلے شکوے ماں باپ سے کرنے کو تو دل چاہتا تھا۔ جی چاہتا کہ آرام سے منہ سر لپیٹ کر لیٹ جائیں۔ کچھ تو سکون ملے زندگی تھکا دیتی ہے خوشحالوں کو بھی اور

بدحالوں کو بھی، حور جہاں کے لیے زندگی نہ پہلے آسان تھی نہ اب مگر اب اسد کا ساتھ تسلی دیتا تھا۔

سحر کی ساس کا مزاج اتنا تلخ تھا کہ زندگی زہریلی ہو کر رہ گئی تھی۔ انہوں نے کبھی کسی کی بھی پروا نہیں کی تھی۔ ان کا مزاج ہی ایسا تھا سحر کے شوہر عباس بھائی بھی اپنی امی کی وجہ سے تنگ تھے مگر اس مسئلے کا کوئی حل نہیں تھا۔ سحر ماں کی گود میں سر رکھے دل ہلکا کر رہی تھی اس نے دل کہاں ہلکا کرنا تھا۔ اس کے دل میں کچھ بھی نہیں تھا بالکل خالی کنواں، سحر نے بھی شیزا کے سخت رویے اور لیے دیے انداز کو صاف محسوس کر لیا تھا اب شائستہ چچی کے پچھتاوے تھے اور وہ تھیں بیٹی سے کیا بحث کرتیں۔

حور جہاں نے چائے کے کپ ٹرے میں رکھے اور لا کر ان کے سامنے رکھ دیے۔

گوشت چولہے پر چڑھا چکی تھی مسالہ پیسنا باقی تھا فرش اس نے صبح سویرے ہی پائپ لگا کر دھو لیا تھا۔ ہر کوئی چمکتے فرش میں با آسانی اپنا منہ دیکھ سکتا تھا مصطفیٰ چچا کے لیے کھچڑی دم پر رکھی۔

"چچی تایا نہیں آئے ابھی؟" اچانک سحر نے ماں سے پوچھا تھا۔ اس کا لہجہ بے حد عام سا تھا۔

"اس نے تو مڑ کر خبر ہی نہیں لی اولاد کی، جب سے سلمٰی سے نکاح کیا ہے، بالکل ہی بے خبر ہو گیا وہ تو۔"

انہیں شیزا کے والدین یاد آ گئے تھے۔ ان کا غرور نظروں میں گھوم گیا تھا۔

"معاذ کے سسرال والے اللہ ایسی سسرال کسی کو نہ دے، معاذ پتا نہیں اتنا مجبور کیوں ہو گیا ہے میں تو اس کی بے بسی سے ڈرتی ہوں۔ نجانے میرے بیٹے کو کیا ہو گیا ہے ایسا تو نہیں تھا اور معاذ کا وہ اکلوتا سالا اکلوتی سالی دکھائی دیتا ہے مجھے تو کانوں میں بالیاں رنگ برنگے لباس انگوٹھیاں، پتا ہی نہیں چلتا کہ مرد ہے کہ عورت، کیسے لوگوں سے واسطہ پڑا ہے۔ کبھی آنٹی کہتی ہے یا اللہ تو ہی اس قہر سے نکال لے میں سارا سارا دن دوا لے کے سوئی رہتی ہوں جب بھی دیکھا ہے اس لڑکی کو چلاتے ہوئے ہی دیکھا اور تو اور اس پر بھی رعب ڈالتی ہے بن ماں باپ کی بچی ہے۔ پلٹ کے جواب نہیں دیتی مگر اس میں خدا کا کوئی خوف نہیں ہے۔"

رانیہ اور سحر فکرمند ماں کی شکل دیکھ رہی تھیں۔

"ایسے تو یہ گھر نہیں تھا وقت نے ہمارے سنہرے رنگ اڑا ڈالے تھے خوشیوں کے پنچھی اڑ گئے۔ باقی خاک رہ گئی تھی بس۔"

☆☆☆

اسد نے ملازمہ کے بندوبست والا وعدہ سچ کر دکھایا تھا۔ غریب سی عورت تھی مگر تھی اعتبار کی۔ اسد نے اس سے کہا تھا کہ وہ ملازمہ کو سارا کام سمجھا دے اسے بہت عجیب لگ رہا تھا۔ وہ بھاگ کر ملازمہ کے لیے بھی چائے بنا لائی تھی۔ وہ چھوٹے چھوٹے گھونٹ بھر رہی تھی۔ صبح کا ساڑھے سات آنے کا ٹائم دیا تھا۔ اسے وہ کام میں بھی کافی پھرتیلی لگی تھی۔ ہاتھ کے ہاتھ ہی کام نمٹا دیتی وہ بھی سلیقے سے، اب حور جہاں صرف کھانا پکاتی تھی جو دل چاہتا وہ پکا لیتی کوئی اعتراض نہ کرتا تھا۔ اس کی دنیا اس کے کمرے تک محدود تھی جہاں وہ دل سے خوش ہو لیتی اپنی پسند کا ڈرامہ دیکھ لیتی 'والدین والے سین' سے حیرت میں مبتلا کر دیتے۔ ایسی محبت کہاں ملتی ہے کون سا دیس ہے وہ شاید پریوں کا۔

آج موسم بہت خوشگوار تھا اس نے لان کا نیا سوٹ پہنا تھا اسد کی پسند اب اس کی زندگی میں کوئی نیا شامل ہونے والا تھا۔ چاہے وہ بیٹی ہوتی یا بیٹا اسے دل سے قبول تھا۔ دل خوشی سے بھرا ہوا تھا ہر شے اچھی لگ رہی تھی۔ اسد بھی یہ خبر سن کر پھولے نہیں سمایا۔ شائستہ چچی نے بھی یہ خبر سن کر اللہ کا شکر ادا کیا تھا۔

"چلو کہیں سے تو خوشی کی خبر بھی سنی۔"

شیزا تو جو بس ابھی ہی دکھائی دیتی تھی اور معاذ الگ پریشان، پتا نہیں کیا چل رہا تھا ان کے بیچ کہ خوشی کی کوئی کرن بھی نظر ہی نہ تھی، وہ تشویش سے سوچ کر رہ گئی تھیں۔

معاذ بیوی کے کانوں سے سنتا اور بیوی کی آنکھوں سے دیکھتا تھا اسے کچھ بھی سمجھانا بے کار تھا۔

☆☆☆

ادھر حور جہاں نور جہاں کی ماں بنی اور ادھر معاذ کے اکلوتے سالے صائم کی شادی کا شور اٹھا تھا۔ پیسے والے لوگ تھے۔ شیزا کا ڈیزائنر بہت قیمتی سوٹ بنوایا تھا انہوں نے اور معاذ کو بھی کافی مہنگا سوٹ دلوایا تھا۔

حور جہاں نور جہاں کو پا کر دو جہانوں کی خوشی لے کر بیٹھی تھی۔ زندگی بدلی تھی اور کیا خوب صورت بدلی تھی۔ البتہ شیزا کا بس چلتا تو حور جہاں کا گلا دبا دیتی۔ اتنی نفرت ہو گئی تھی اسے۔

"تم مڈل کلاس لوگوں کو بچے پیدا کرکے فکر خراب کرنے کے علاوہ آتا ہی کیا ہے۔"

یہ اس کی جلن تھی جو وہ نکال کر چلی گئی تھی۔

البتہ معاذ نور جہاں کو اٹھا کر دیکھ رہا تھا۔

"نور جہاں بھابھی جیسی ہے بالکل۔"

مصطفیٰ چچا شاید بوڑھے ہو گئے تھے اس وجہ سے ان کا ذہن آج بھی اسی نقطے پر اڑا تھا کہ وہ حقیر ہے مگر کیا کہیں کہ جس کے مقدر حقیر نہ ہوں اسے ساری دنیا چاہے حقیر کہتی رہے اسے کوئی فرق نہیں پڑتا اس کی زندگی مکمل تھی تو سب ٹھیک تھا سب کچھ۔

ایک صبح اچانک ہی شور اٹھا تھا پہلے کمرے میں پھر کمرے سے باہر سیلاب کی طرح۔

"میں نے اپنے فلیٹ میں شفٹ ہونا ہے۔" شیزا نے اپنا بیگ تیار کر رکھا تھا۔ "میں یہاں نہیں رہ سکتی۔"

معاذ سمجھا سمجھا کر تھک چکا تھا جو طوفان وہ اندر چھپا کر بیٹھا تھا۔ اب وہ لاوا سب کے سامنے آتش فشاں بن کر پھٹ چکا تھا۔ اس کے پاپا کا فلیٹ تھا وہ وہاں شفٹ ہونے کا کہہ رہی تھی۔ "سب اسی میسنی سے پیار کرتے ہیں۔ میری کسی کو پروا نہیں۔" شیزا جاتے جاتے بھی اس پر وار کرنا نہیں بھولی تھی۔

"جاؤ بیٹا! تم اپنا گھر بچاؤ ہم اکیلے نہیں ہیں، ہے نا اسد ہمارا خیال رکھنے کے لیے۔ تم اداس مت ہو۔ کوئی نہیں۔ یہ بھی تو میری بیٹی ہے۔ ضد کر رہی ہے تو مسئلہ نہیں ہے۔"

پھر شائستہ چچی نے ہی معاذ کو پریشانی سے نکالا تھا بیٹے کو کب تک پریشان دیکھتیں آخر!

"اسد! میں ایک دو دن آپا سے مل آؤں۔"

شائستہ چچی لاہور اپنی بہن سے ملنے گئی ہوئی تھیں اور چچا مصطفیٰ بھی انہی کے ساتھ گئے تھے اسد نے ہامی بھر لی تھی۔

"تم اسے بھی ساتھ لے جاؤ گی۔" وہ نور جہاں کو گدگدا کر بولا تھا۔ سال بھر بعد ہی کی۔ "چلو وہ جانا چاہتی ہے تو چلی جائے ورنہ تو تایا جان نے تو اپنی بچی کو یاد نہیں کیا۔ ایک بار بھی ملنے نہیں آئے ماں تو چلو سوتیلی تھی پر باپ تو سگا تھا۔ اچھی خاصی سمجھدار لڑکی اور بے کار سمجھ کر پھینک گئے۔

جو بھی ہوا اچھا ہی ہوا۔ کم از کم میرے حق میں تو اچھا ہوا۔" اسد نے سوچا تھا حور جہاں نے چھوٹا سا بیگ تیار کر لیا تھا اور نجانے کیا سوچ رہی تھی اس نے ریموٹ اٹھایا اور چینل بدل دیا۔

"تو جو نہیں ہے تو کچھ بھی نہیں ہے یہ مانا کہ محفل جواں ہے حسین ہے۔"

"اللہ کرے وہ جلد ہی واپس آ جائے۔" اس نے دل سے دعا کی تھی۔

☆☆☆

گلی تو بالکل وہی تھی راستے بھی وہیں موجود تھے ایسا لگتا تھا جیسے در و دیوار اسے دیکھ کر مسکرائے ہوں۔ وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی گویا ایک ایک دیوار روڑے اور مٹی سے گلے مل رہی تھی۔ یادیں چاہے تلخ ہی سہی یہ گھر اسے بھولا نہیں تھا گیٹ کھلا ہی تھا۔

اس نے آہستہ سے قدم اندر رکھ دیا تھا وہ سلمٰی تھیں اپنی عمر سے کئی سال بڑی نظر آ رہی تھیں۔ ہر وقت لپ اسٹک لگا کر رکھنے والی سلمٰی کے بال بھی اجڑے اجڑے تھے۔

اسے لگا تھا کہ سلمٰی اس کا استقبال نہیں کریں گی۔ اسے فوراً چلے جانے کا کہیں گی وہ بار بار اسے

اپنے طنطنے بھرے چہرے سے یاد آتی تھیں۔ دل و دماغ سے ان کی نفرت چپکی ہوئی تھی مگر وہ آگے بڑھ کر اسے گلے لگا رہی تھیں۔ ان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ اس سے مل کر خوش ہو رہی تھیں۔ اسے سکتہ سا ہو رہا تھا اسے لگتا تھا جیسے کوئی خواب دیکھ رہی ہو۔ خوابوں میں چل رہی ہو اور چلتے چلتے اپنے باپ کے گھر آ گئی ہو۔

باورچی خانہ بھی اسے دیکھ کر پرانی یادیں تازہ کر رہا تھا پتا نہیں ابا کہاں تھے۔

"تمہارے ابا آتے ہی ہوں گے۔" انہیں تو ہمیشہ سے ابا کو اپنا شوہر صرف اپنا ہی بنا لینے کا ہی جنون تھا۔ اب وہ اسے تمہارا باپ کہہ رہی تھیں انہوں نے تو نور جہاں کو گود میں بھر رکھا تھا۔

کون کہتا ہے وقت بدلتا نہیں ہے بدل جاتا ہے منظر بدل جاتے ہیں۔ بس ذرا سا انتظار اس نے اکلوتی بیٹیوں کے لاڈ سنے تھے۔ ان کی محبت چاہت کے قصے سنے تھے مگر یہاں سارا جھگڑا ہی اس کے ہونے پر تھا خواہ مخواہ کا خرچا۔ پرایا دھن اس پر خرچ کرنا گناہ کبیرہ تھا۔ امی اٹھ کر کچن میں چلی گئی تھیں۔

اندر بیٹھ کر کچھ کھول رہی تھیں پتا نہیں کیا، وہ اس وقت صرف اسی خواب کو محسوس کرنا چاہتی تھی۔ وہ باہر آئی تھیں۔ ان کے ہاتھوں میں شربت کا جگ تھا جو انہوں نے بڑے پیار سے پہلے نور جہاں کو دیا تھا پھر حور جہاں کو پلایا تھا۔ "میں کھانا پکاتی ہوں۔ تم تھوڑا آرام کرلو۔ تھکی ہوئی آئی ہو۔"

وہ اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر اٹھنے ہی والی تھیں کہ اس کی نظر آنے والے پر پڑی تھی۔

"ارسلان؟" وہ اس کا چھوٹا سا بھائی اب کافی قد کاٹھ نکال چکا تھا اسے فخر سا ہوا تھا۔

"اچھا تو یہ ہے جس کی یاد میں دن رات آنسو بہائے جاتے ہیں اب آ گئی ہے تو کلیجہ ٹھنڈا ہو گیا ہوگا میں تو ہوا کتے کا بچہ، نالی کا کیڑا میری کیا ضرورت۔"

اس کے ہونٹوں کے کناروں میں سرف کی طرح کی جھاگ چھپی ہوئی تھی سلمیٰ کی آنکھوں میں خوف پھیل گیا تھا۔ گہری رات کی طرح وہ صاف کی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔

"تم بیٹھو تو سہی۔ تمہارے لیے بھی شربت رکھا ہے۔ میں لے کر آتی ہوں۔" سلمیٰ کے اٹھنے سے پہلے ہی وہ اندر جا کر بچا ہوا شربت پی گیا تھا۔

"بھی میرے آنے پر تو شربت نہیں بنایا تو نے جیسے ہی گھر میں قدم رکھوں ڈرامے شروع کر دیتی ہو بیماریوں کے۔ تو بیمار و بیمار کچھ نہیں ہے۔ بہت بڑی اداکارہ ہے بس۔" وہ بس ہی ہو کر رہ گئی تھی۔

"تم امی کے ساتھ کس طرح بات کر رہے ہو؟" حور جہاں نے لہجہ پوری کوشش سے نارمل رکھا تھا۔

"تم اسے جانتی نہیں ہو ناں۔ اسی لیے اس طرح کہہ رہی ہو، اس کے قصے اس کے جو اتنے ڈرامے ہیں ناں وہ میں تمہیں سناتا ہوں۔"

ارسلان کے رویے میں کہیں بھی لچک نہیں تھی۔ محبت کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا اس دوران سلمیٰ نے سوائے چپ رہنے کے اور کچھ نہیں کیا۔ کانپتے ہاتھوں سے پیاز کاٹی تھی۔ وہ بھی بے ترتیب۔

"میں گوشت لے آئی مگر طبیعت ٹھیک نہیں، چلا نہیں جاتا مجھ سے۔"

"کوئی بات نہیں امی میں لے آتی ہوں آپ یہاں بیٹھ جائیں۔"

امی کو نجانے کب شوگر ہو گئی تھی ہر وقت نقاہت اور بے چینی مقدر ہو گئی تھی۔ دوا وغیرہ کا بھی کوئی بندوبست نہیں تھا۔ جب وہ دونوں گوشت لینے جانے لگی تھیں۔ تب اچانک ارسلان آ گیا تھا۔

"میں مر گیا تھا۔ موت آ گئی تھی مجھے۔ فتنی بڑھیا جہاں کے سامنے مظلوم بن کر کھڑی ہو گئیں۔"

ارسلان نے اس شدت سے سلمیٰ سے پیسے چھینے تھے کہ وہ گرتے گرتے بچی تھیں۔

"میں نے سوچا کہ تم ٹی وی دیکھ رہے ہو۔" وہ منمنائی تھیں۔

"ہاں ٹی وی دیکھتا تھا کہ [illegible] تھا۔ جو تم کبھی ہی نہیں سکیں۔"

وہ پیسے لے کر نکل گیا تھا۔ امی کے چہرے پر کچھ بھی نہیں تھا صاف چہرے پر بس اور کچھ لکھا ہی نہیں جا سکتا تھا۔

نور جہاں وہیں چارپائی پر سو گئی تھی اس نے اسے اٹھا کر اندر بیڈ پر لیٹا دیا تھا۔ اس دیوار کا کونا ایک بار اس کی کنپٹی میں گھس گیا تھا جب ایک دن اس نے ہمسائی ناہید خالہ کے کہنے پر سلمیٰ سے کہا تھا کہ وہ سارے گھر کا کام اکیلے نہیں کر سکتی۔ وہ بھی ہاتھ بٹایا کریں۔ تب سلمیٰ کھڑے کھڑے بے ہوش ہو گئیں اور واپسی پر ابا نے اسے مار مار کر تقریباً ختم ہی کر دیا تھا کہ ناہید خالہ نے اسے چھڑایا تھا جب سلمیٰ نے آہستہ آہستہ خود ہی اپنی آنکھیں کھول دی تھیں۔

"مگر میں نے تو معاف کر دیا تھا امی کو، ابا کو۔" اس نے ماضی کی گرد جھٹک دی تھی۔ وقت گزر گیا تھا۔ اس نے خود ہی کھانا بنا دیا تھا۔ ایسے جیسے وہ کبھی یہاں سے گئی ہی نہ ہو۔

اس نے روٹیاں رومال میں لپیٹ کر ابا کے سامنے رکھیں اور پھر خود بھی ان کے ساتھ ہی بیٹھ کر کھانا کھانے لگی تھی۔ امی کتنے پیار سے ارسلان کے لیے دیسی گھی میں ڈوبا چینی والا پراٹھا بناتی تھیں۔ اسے یاد آیا تھا۔

سلمیٰ نے ارسلان کے سامنے سالن رکھا تھا جسے اس نے فوراً پرے کر دیا تھا۔

"ہاتھ تو دھو لیا کرو، صابن کو ہاتھ تو لگانا نہیں دیکھو کتنی مکھیاں ہیں اس کے گرد۔" وہ حقارت سے دیکھتے ہوئے ان کے ہاتھ سے سالن بھی نہ لے رہا تھا۔ اس نے دوسری کٹوری میں سالن دے دیا تھا۔ ابا اس چھوٹے سے پراٹھے کے کئی نوالے انہی گندے ہاتھوں سے اس کے منہ میں ڈالتے تھے۔ کچھ نہیں بولے، بولے بھی تو بس اتنا سا۔

"تو اپنے لیے سالن خود ڈال لیتا اس کے ہاتھ سے مت لیتا۔"

یہ وہی ارسلان تھا جسے ماں چومتے چومتے بھی تھکتی ہی نہ تھیں اٹھا اٹھا کر ناز کر کر کے خود کو خوش نصیب خیال کیا کرتی تھیں وہ تو بیٹے کی ماں ہیں اور نازیہ تو بیٹی چھوڑ کر مری ہے وہ بھی منحوس۔ سلمیٰ اٹھ کر ہاتھ دھو آئیں اور کافی دور بیٹھ کر روٹی کھانے لگیں ایسے جیسے اچھوت ہوں۔

اس نے معذرت کرنے یا شرمندہ ہونے کی بھی ضرورت محسوس نہ کی تھی۔

ارسلان ابا کے سامنے بیٹھا ان سے پیسے مانگ رہا تھا۔

"دے رہا ہوں دیکھو ذرا دھیان سے پیسے خرچ کیا کرو اب حالات وہ نہیں رہے۔"

"مر جانا مگر خرچ نہ کرنا تم لوگ، نہ یہ سارا پیسہ قبر میں لے کے جاؤ گے تم دونوں، اس پر تو بڑے پیسے خرچ کرتے ہو۔" اس کا اشارہ سلمیٰ کی طرف تھا۔

"دھیان نہیں رہتا کہ دکان میں سودا کم ہے۔ آمدن کم رہ گئی ہے۔ دیکھ رہا تھا میں رات کو گلاب جامن کھلا رہے تھے اپنی بیوی کو، اس کے واسطے باہر نکل رہے تھے۔" کل ابا نے سلمیٰ بیگم کو میڈیسن لے کر دی تھیں ان کی حالت کافی خراب ہو گئی تھی واپسی پر وہ ان کے لیے جامن لائے تھے۔

"یار وہ تیری ماں بھی تو ہے۔" ابا پھیکا سا ہنس کر بولے تھے۔

"ماں نہیں ہے بیوی ہے تمہاری ابو یہ نہ کہا کرو مجھے۔" ابا کی مسکراہٹ جان دار نہیں تھی مردہ سی جس میں بھرم ٹوٹ جانے کا دکھ ہوتا ہے۔

"دکان پر بیٹھ جاؤ۔ دکان پر بیٹھ جاؤ... سارا دن ایک ہی رٹ لگا رکھی ہے میں دکان پر بیٹھ جاؤں تم گھر بیٹھ جاؤ لوگوں کے بیٹے ہیں عیش کرتے پھرتے ہیں پتا ہے کل ہی نئی بائیک لی ہے مظہر نے اور مجھے ہزار روپے بھی نہیں ملتے۔" ذرا سی اس کی آنکھوں میں شرارت چمکی تھی ابا نے ہزار روپے کا نوٹ اسے تھما دیا تھا اور نوٹ ملتے ہی وہ نظروں کے سامنے سے غائب ہو گیا تھا۔

"میں دکان پہ جا رہا ہوں اور حور جہاں تم تو

بالکل بولتی ہی نہیں ہو۔ کیا پکانا ہے آج؟" ابا لہجے میں بشاشت بھر کر بولے تھے۔

"کچھ نہیں ابا! اس مونگ کی دال وہ بھی تڑکے والی۔" رات ارسلان نے سلمٰی کو اتنا بے عزت کیا تھا کہ وہ روح تک کانپ گئی تھی۔

"یہ جتنی سانسیں بچی ہیں ناں! ذرا سا گلا گھونٹنے سے وہ بھی نکل جائیں گی اور کسی کو پتا بھی نہیں چلے گا۔"

"اس پر پیسہ زیادہ لگ رہا ہے چچا مصطفیٰ کے گھر عیش کر رہی ہے تم کس خوشی میں اس کی دعوتیں کر رہی ہو خود جا کے اپنے گھر جو مرضی کھائی رہے۔ یہاں لاڈ کروانے کی ضرورت نہیں ہے۔" سلمٰی کمرے میں دوڑتے گھسا تھا اب رگڑ رگڑ کر منہ ہاتھ دھو رہا تھا۔

آج یہاں تیسرا دن تھا اس نے باقی دال ڈھک کر فریج میں رکھ دی تھی۔ کل اسد اس سے ملنے آ رہا تھا اس نے اپنا بیگ تیار کر لیا تھا۔ سلمٰی اداس ہو گئی تھیں۔

"تم آئی ہو تو دل لگ گیا تھا میرا۔ کتنی بار تمہارے باپ سے کہا بھی کہ ہم چل کر حور سے مل آئیں مگر وہ کہتا تھا کہ ہم کس منہ سے اسے ملنے جائیں تم آ جایا کرو حور! تم ایک ہی تو میری بیٹی ہو بیٹیاں تو گھر کی رونق ہوتی ہیں، مجھے افسوس کہ میں نے سمجھا ہی نہیں۔"

سلمٰی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے جو حور نے سمیٹ لیے تھے۔

"ایسی کوئی بات نہیں ہے امی! آپ مجھ سے ملنے آنا میں انتظار کروں گی، ماں بیٹیوں کے درمیان کیسی ناراضی بس آپ بھول جائیں سب کچھ۔"

جاتے جاتے امی نے پانچ سو کا مڑا تڑا نوٹ نور جہاں کی مٹھی میں دینا چاہا تھا جسے اگلے ہی لمحے اچک لیا گیا تھا جیسے کنزا ارسلان ٹھیک موقع پر چوری پکڑ چکا تھا۔

"یہ مجھے دے کر جاؤ۔"

"لے لو ارسلان اس کی بوتل پی لینا۔"

"ہائے بیچ باجی تم تو بڑی سمجھدار ہو ان کو بھی کچھ سمجھا جاؤ کچھ تو سیدھے ہو جائیں میری تو بڑھاپا بھی ماننے نہیں ہیں۔" وہ اداس ہو کر بولا تھا اس کے پاس اس مسئلے کا حل نہیں تھا۔ ہائے اولاد کی محبت ایسے ہی تو اسے آزمائش نہیں کہا گیا۔

☆☆☆

واپسی خاصی ہنگامہ خیز تھی شائنہ چچی لوٹ آئی تھیں اور شیزا اور معاذ نے گھر بیچ کر اپنا حصہ مانگ لیا تھا۔ شائنہ معاذ سے اس بے دردی کی توقع نہیں رکھ رہی تھیں مگر وہ بیوی کے پیچھے بضد تھا مکان بک جانا چاہیے۔ اس گھر میں شائنہ بیاہ کر آئی تھیں تو یہاں کچھ بھی نہیں تھا انہوں نے اس کھنڈر نما عمارت کو گھر بنایا تھا اس میں صوفے سجائے تھے۔ قالین بچھائے پینٹنگز لگائیں۔ باورچی خانہ بنایا اسے آباد کیا تھا اک شے کا اک اک کونہ گویا ان کے دل کا ٹکڑا تھا اور دل کا ٹکڑا ایسے تن کر سامنے کھڑا ہو تو دل ریزہ ریزہ ہو جایا کرتا ہے۔

یہ بڑا سا گھر مصطفیٰ چچا کے نام تھا بات شائنہ چچی نے مدعا بیان کیا تو وہ کمرے سے ہی باہر نکل آئے تھے۔

"تم اسے لے کر جہاں رہنا چاہتے ہو جاؤ، میں اپنا گھر نہیں بیچ سکتا۔" ان کا صاف انکار سننے کے بعد شیزا اور معاذ شائنہ چچی سے ملے بغیر ہی چلے گئے تھے۔ اس اعلان کے ساتھ وہ بھی نہیں لوٹیں گے۔

شائنہ کی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو بھر گئے تھے۔ "کیا کمی تھی اپنا کھا پکا لیتی۔ میں نے تو کوئی ناانصافی نہیں کی تھی مگر کسی کی بگڑی ہوئی اولاد کو ٹھیک کون کر سکتا ہے۔"

شیزا کی جیسی لڑکی تھی غرور سے بھری ہوئی جس طرح جاتے ہوئے اس نے گیٹ کو ٹھوکر ماری تھی شائنہ کا دل دہل گیا تھا وہ کیسی پتھر دل عورت تھی۔

دل پریشان ہو رہے تھے۔

☆☆☆

سلمٰی اور ابا کو سامنے دیکھ کر اسے یقین ہی نہیں آیا تھا کہ کوئی اس سے بھی ملنے آ سکتا ہے۔ شائنہ چچی بھی سلمٰی کو دیکھ کر حیران تھیں شاید کچھ کہہ بھی دیتیں مگر اس وقت بیٹے کی جدائی کا غم تازہ تھا۔ اس لیے کسی پر طنز چاہتے ہوئے بھی کر نہ سکیں۔

سلمٰی امی اس کے کمرے میں بیٹھی تھیں۔ ابا باہر ہاتھ منہ دھو رہے تھے۔

"سچ ہے ہمیں وہی ملتا ہے جو ہمارے نصیب میں لکھا ہو۔ ہم قدرت سے بڑھ کر منصوبہ ساز نہیں ہو سکتے۔ کوئی آگے پیچھے نہ بھی ہو تو جسے چاہے اللہ نواز دیا کرتا ہے۔" ابا نادم تھے پر دل ہی دل میں شکر ادا کر رہے تھے کہ ان کی بچی خوش ہے۔

سلمٰی امی کھانا کھا رہی تھیں۔ کھیر اٹھا کر بریانی کے ساتھ چاہتے وہ پورے کمرے کا جائزہ لے چکی تھیں۔

"یہاں صرف تم ہی رہتی ہو حور! اسد کا بڑا بھائی الگ رہتا ہے؟"

"وہ تھوڑے دن پہلے علیحدہ ہوئے ہیں سحر اور رانیہ کی شادی ہو گئی، پھر چچا مصطفیٰ شائنہ چچی اور میں ہی رہ گئے۔" ابا ابھی تک مصطفیٰ چچا سے نہیں ملے تھے۔

"مصطفیٰ بے حد مغرور انسان ہے کوئی فرق بھی پڑا ہے کہ ویسے کا ویسا ہی ہے۔" ابا چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے بولے تھے۔

"بہت اچھے ہیں۔" وہ بھی رات دیر تک امی کے ساتھ بیٹھی ان سے باتیں کرتی رہی تھی ماضی کا ایک ورق تھا جو اچانک چمک کر سامنے آ گیا تھا اور یقین ہی نہ آتا تھا۔

امی ابا اس کے نصیب پر رشک کرتے ہوئے دعائیں دیتے ہوئے رخصت ہو گئے تھے۔ جاتے جاتے حور جہاں نے پانچ ہزار کا نوٹ سلمٰی کی مٹھی میں منتقل کر دیا تھا جس کا ابا کو بھی پتا نہیں چلا تھا۔ "کوئی مسئلہ ہو تو بتانا امی۔" ابا تاکید کر رہے تھے اور سلمٰی کا ... بہت کچھ کہنا چاہتی تھیں مگر حور نے ان سے لپٹ کر انہیں چپ کروا دیا تھا۔

وقت اپنی مخصوص ڈگر پر رواں دواں تھا شیزا کی کوئی خیر خبر نہیں تھی ایک دن معاذ گیٹ کھول کر اندر آ رہا تھا۔

شائنہ چچی نے چیخ کر حور کو آواز دی تھی۔

"یہ معاذ ہے ناں خواب تو نہیں ہے سچ سچ بتانا حور!"

"دن میں کئی بار وہ ایسے ہی ہر آنے والے کو معاذ کہہ دیا کرتی تھیں۔ اب وہ نظر آیا تھا تو خود پر یقین ہی نہ کر رہی تھیں، میلے سے کپڑوں میں ملبوس وہ معاذ ہی تھا جو ہر وقت تیار رہا کرتا تھا اب نجانے کیوں، کیا پتا شیزا نے فلیٹ سے نکال دیا ہو اسے تو کسی کی بھی پروا نہیں تھی۔

معاذ وہیں شائنہ چچی کے پاس ہی بیٹھ گیا تھا۔ قدموں کے پاس یہاں جیسی ٹھنڈی چھاؤں کہاں نصیب ہوتی ہے ہر کسی کو۔ لوگ تو کیکر کے سوکھے کانٹوں کی طرح جسم ہی نہیں روح میں بھی چھید کر دیتے ہیں۔

جب بھی کوئی اپنی ماں کے پاس بیٹھتا تھا۔ اسے اپنی بے وقعتی یاد آ جاتی تھی وہ لمحے جو کانٹوں پر گزارے تھے، وہ باتیں جو نازک دل پر لگی تھیں۔ وہ زندہ ہو کر رلاتی تھیں مگر عقلوں کی طرح ہر جگہ اپنے دردیدہ دل کا ماتم نہیں کرتی تھی۔ اس کی روح پر کیسے زخم لگے تھے اس کے پیروں میں کیسے کانٹے چبھے تھے۔ کوئی نہیں جانتا تھا اپنا زخم یا تو سنور سکتا ہے یا بگڑ جاتا ہے وہ خود ہی سنور گئی تھی۔

"امی وہ ماں نہیں بن سکتی کبھی، میں ہر جگہ ٹیسٹ کروا چکا ہوں۔"

معاذ کے دل سے آہ نکلی تھی جسے شائنہ چچی نے سمیٹ لیا تھا وہ بلکتا ہوا بچہ لگ رہا تھا۔ سچ سن کر اس کے بھی پیروں تلے سے زمین کھسک گئی تھی۔

کیا غرور کرنے والوں کا انجام اتنی جلدی دکھا دیتا ہے اللہ ہاں یہ سچ ہے۔ معاذ کو شیزا نے بے عزت کر کے فلیٹ سے نکال دیا تھا وہ۔ جس طرح ماں باپ کو ٹھوکر

مار کر گیا تھا اس نے معاذ کو ٹھوکر مارتے سوچا تک نہیں، ایسا لگتا تھا کہ جنگ کافی دن اس نے لڑی تھی اور پھر ہار کر لوٹا تھا۔ وہ اپنے بھائی والدین کے ساتھ مست تھی اسے معاذ کی کیا ضرورت۔

اس نے ایک فون کال تک نہیں کی معاذ اس کی طرف سے مکمل مایوس ہو چکا تھا۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ وہ جھک جاتی اپنی کی مان لیتی مگر افسردگی یا اداسی نے اسے چھوا تک نہیں تھا۔ مصطفیٰ چچا کی اکڑ بھی ختم ہو گئی تھی جوان بیٹے کی جدائی نے انہیں نڈھال کر دیا تھا۔ معاذ واپس لوٹا تھا تو انہیں لگتا تھا کہ وہ کھل کر سانس لے رہے ہیں۔

☆☆☆

آج سارے گھر میں ڈھیروں ڈھیر پھول آئے ہوئے تھے سارے گھر کو پھولوں سے سجایا جا رہا تھا خاص طور پر معاذ کے کمرے کو، معاذ نکاح کر رہا تھا۔ اسد کے بیسٹ فرینڈ سعید کی بہن فرح سے۔ فرح کا پہلا شوہر روڈ ایکسیڈنٹ میں شدید زخمی ہو کر چل بسا تھا۔ فرح اس وجہ سے بے حد افسردہ رہتی تھی مگر اس کی زندگی ایک بار پھر اس طرح ایک نئی راہ پر چل نکلے گی۔ یہ اسے معلوم نہیں تھا۔ شاید اسے ہی قسمت کا لکھا کہتے ہیں۔ فرح اور معاذ کے رشتے کا بھی کسی نے خواب میں بھی نہ سوچا تھا۔

کئی بار حور جہاں ان کے گھر افسوس کے لیے گئی تھی اور پھر معاذ کا رشتہ لے کر وہ بے حد خوش تھی کہ اس نے دو ٹوٹے ہوئے دل جوڑنے کی کوشش کی تھی۔ دنیا کی سب سے بڑی نیکی، معاذ کے چہرے پر سکون تھا شیزا کی کال آئی تھی۔ وہ طلاق لینے کا کہہ رہی تھی معاذ نے سیٹ گھر کا ہر فرد چاہتا اسے اپنی زندگی سے نکال دینا چاہتا تھا۔ اس کی خواہش کا ہر کوئی احترام کرنے کے لیے تیار تھا۔

معاذ پر سکون نظر آ رہا تھا۔ سلمیٰ اور ابا بھی آئے ہوئے تھے۔ شیزا نے ان سب کو حقیقتاً دن میں تارے دکھا دیے تھے اور اب شوہر کو بھی چھوڑ دی تھی۔

کھانا وغیرہ کھانے کے بعد سلمیٰ، ابا، چچا مصطفیٰ کی موجودگی میں ہی معاذ کا نکاح پڑھوا دیا گیا تھا۔ سلمیٰ کے پاس ہی حور جہاں بھی بیٹھی تھی اور جہاں کھیل رہی تھی۔

"شیزا کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا؟"

سلمیٰ حیرانی سے اس کے متعلق دریافت کر رہی تھیں۔ جس بے وقوف کو گھر اور گھر داری سے کوئی لینا دینا ہی نہیں تھا ان کی حور جہاں نے تو بہت اچھے طریقے سے گھر بسالیا تھا۔

"امی! اگر اسے کوئی دکھ ہوتا تو وہ روکتی نہیں معاذ بھائی کو۔" حور جہاں کے بولنے میں بھی اعتماد تھا وہ خود پر اعتبار کرنے لگی تھی۔

چہرے پر آسودگی، محبت صاف نظر آتی تھی یوں بھی سلمیٰ اب ارسلان کی طرح اس سے پیار کرنے لگی تھیں وہی گلے سے لگانا اور ماتھا چومنا۔

☆☆☆

معاذ اور فرح ناشتہ کر رہے تھے معاذ کا موڈ بہت اچھا تھا وہ بہت خوش نظر آ رہے تھے۔ فرح دھیمے مزاج کی پیاری سی لڑکی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ معاذ کی ایک اور بھی بیوی ہے۔ جس سے جھگڑا چل رہا تھا۔ فرح کے اپنے میکے میں چار چار بھابیاں موجود تھیں، وہ ان میں کسی کو بھی تنگ نہیں کرنا چاہتی تھی اس سے پہلے کہ کوئی پریشان ہو کر خود اسے شادی کرنے کا کہتا اس نے خود ہی معاذ کے لیے ہاں کر دی تھی۔ زندگی رو رو کر نہیں گزاری جا سکتی پیچھے زندہ رہ جانے والوں کو زندہ رہنا پڑتا ہے۔

☆☆☆

حور جہاں نے گیٹ پر چھوٹے سے بیگ کے ساتھ کسی کو کھڑے دیکھا تھا۔ سادہ سے شلوار قمیص میں ملبوس اور گلاسز بھی غائب تھے۔ وہ شیزا تھی جس کی آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی تھیں اور بال پونی میں قید کیے خود بھی قید میں لگ رہی تھی۔ شائستہ چچی حور جہاں کے ساتھ ساتھ ایک پوتے کی بھی دادی بن چکی تھیں۔ اندر کمرے میں وہ سال بھر کے گل کو تخت پر [illegible] کھلا رہی [illegible] آباد

ہو گیا تھا معاذ اور فرح بھی گلزار کے آنے سے مکمل ہو گئے تھے۔ انہیں کبھی شیزا یاد بھی نہ آئی تھی۔

وقت بے پاؤں گزر بھی جاتا ہے اور ہمیں پتا بھی نہیں چلتا۔ زمین قدموں تلے سے کھینچ لی جاتی ہے۔ راتیں اور دن تیزی سے گزرتے گئے تھے۔ شیزا کے اسراف آنسو لگ رہی تھی وہ اپنی زندگی میں مگن ہوگی ایسا نہیں تھا۔ وہ ہارے ہوئے جواری کی طرح بالکل خالی ہاتھ تھی۔ روپے پیسے اور مصنوعی محبت نے معاذ کو بھی اس سے متنفر کر دیا تھا اب وہ یہاں کھڑی تھی اور حور جہاں اس کے پیر دیکھ رہی تھی۔ گھر، قدم، بے وقت انسان کیا وہ اسے پہچانتی تھی وہ اس کے غم میں اپنا ماضی ڈھونڈ رہی تھی۔

شیزا شائستہ چچی کو دیکھ کر زار و قطار رونے لگی تھی وہی اب اسے پناہ دے سکتی تھیں۔ وہ خاموشی سے بس دیکھ رہی تھیں۔ گلزار کی موٹی آنکھیں حیرانی سے بھری ہوئی تھیں اور شیزا اس میں صاف معاذ کا عکس محسوس کر سکتی تھی۔ اسے اس کے بھائی نے نینا سے شادی کے بعد نظر انداز کرنا شروع کر دیا تھا پھر یک دم ہی نینا شیزا کے سائے سے بھی نفرت کرنے لگی تھی۔

شیزا اور نینا میں جھگڑے شروع ہو گئے تھے صائم نے شیزا کو بہتیرا منع کیا تھا پھر ایک دن اسے دھکے مار کر گھر سے ہی نکال دیا تھا۔ وہ فلیٹ جس میں معاذ اور وہ رہتے تھے وہ بھی صائم نے دھوکے سے اپنے نام کروا لیا تھا۔ اس کا پرسنل اکاؤنٹ تک خالی پڑا تھا وہ ٹکے ٹکے کی محتاج ہو کر رہ گئی تھی پھر اس نے اپنے تھوڑے سے کپڑے اٹھائے اور بے بسی کی [illegible] کو چھوڑ کر یہاں آ گئی۔

کچھ بھی تھا معاذ اس سے محبت کرتا تھا۔ اس کی محبت پر اسے یقین تھا بے یقینی کہیں نہ تھی صرف بے سروسامانی ہی تو تھی، معاذ سے مل کر سارے غموں سے چھٹکارے کی توقع تھی مگر وہ منہ پھیر کر کھڑا تھا [illegible] کے گھر میں اس کے لیے جگہ تھی نہ معاذ کے دل میں اس کے لیے کچھ تھا۔ اسے فرح سے محبت تھی وہ اس کے بچے کی ماں جو تھی۔

پھر چچا مصطفیٰ نے ہی بیچ میں پڑ کر مسئلہ حل کرنے کی کوشش کی تھی انہیں شیزا پر ترس آ گیا تھا مگر معاذ کی بے رخی نے شیزا کو اندر سے توڑ کر رکھ دیا تھا۔ شائستہ چچی نے اپنے کمرے میں ہی اس کا بستر رکھوا لیا تھا وہ کہاں جاتی اس کا اس دنیا میں کوئی نہیں تھا اور باہر کتنا اندھیرا ہے۔ اس کی آنکھیں بتاتی تھیں کہ اس کی بے قدری حد سے زیادہ ہوگئی تھی۔

حور جہاں نے سوچا اور اسے دیکھنے لگی جو بھوکی لگ رہی تھی۔ وہ اس کے لیے کھانا لینے چلی گئی تھی اب وہ کھانے میں کسی طرح کا نقص نہیں نکال سکتی تھی۔ معاذ اور فرح نے اب کھانا نہیں کھانا تھا اسے معلوم تھا اس لیے اس نے بہت سارا سالن، روٹیاں، رائتہ اور چاول کی بڑی پلیٹ اچھی طرح بھر کر اس کے سامنے لا رکھی تھی اور وہ بے خبر ہو کر جلدی جلدی کھانے لگی تھی۔ یہ شیزا ہے مگر بھوک سب سے بڑی حقیقت ہے، شیزا کی ہائی فائی سوسائٹی سے بھی بڑی۔

اس مسئلے کا حل جو بھی نکلے شیزا کی بھابی نے اسے حقیقتاً بھوکوں مارا تھا۔ شیزا کے والدین کو تو شیزا سے بے انتہا محبت تھی، اب کیا ہوا شاید وقت کے ساتھ ترجیحات کے ساتھ محبتیں بھی اپنا رخ بدل لیتی ہیں۔

حقیقت بہت تلخ ہے زہر سے بھی تلخ۔ کوئی اسے لینے نہیں آیا تھا۔ کسی نے اس کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ وہ یہ بات اچھی طرح سمجھ کر آئی تھی اسی لیے ایسی ہو گئی تھی۔

☆☆☆

سلمیٰ نے جو بویا تھا وہی کاٹنے کا وقت آ چکا تھا ان کی آنکھوں میں اندھیرا ابھر چکا تھا۔ ایک غلط بیج بویا تھا وہ تناور درخت بن گیا تھا اور پھر اس کے ثمرات سمیٹتے جتنا درد ہو رہا تھا ایسے تو زخم

ادھورے کا بھی نہ ہوتا ہوگا۔ "یا اللہ میں نے غلطی کر دی، مجھے معاف فرمادے۔"

سلمٰی جب توفیق اللہ سے معافی تلافی میں لگی رہتیں۔ یا پھر حور جہاں کا انتظار کیا کرتیں وہ بھول گئی تھیں کہ وہ ان کی سوتن کی اولاد ہے اپنا کیا ہر سلوک بھی۔

"شکر ہے کہ تم آگئیں اور ڈاکٹر کے پاس لے گئیں، میرے کل سے سینے میں شدید درد تھا۔"
وہ بار بار شکر ادا کر رہی تھیں۔ حور جہاں سے بے حد محبت سے پیش آتیں اور وہ ان کی کبھی کوئی بات ٹالتی نہیں تھی مگر جب ارسلان انہیں ایسا کرتے دیکھ لیتا تب ان کا رنگ زرد ہو جاتا اور وہ چپ رہ جاتیں۔

"تمہارے ڈرامے ختم نہیں ہوتے۔"
وہ دانت پر دانت جما کر کہتا اور وہ کانپنے لگ جاتیں پھر حور جہاں ہی اسے ٹوک دیتی اور وہ مان بھی لیتا۔ جاتے جاتے حور جہاں اسے بھی کچھ نہ کچھ تھماتا اور تسلی دینا نہ بھولتی تھی۔ جیسے جیسے سلمٰی حور جہاں سے پچھلے پرانے حساب چکتا کرنے میں لگی تھیں ویسے ویسے سزا بھی کم ہو رہی تھی۔ وہ سلمٰی کو بھی تسلی دیتی تھی کہ وقتی طور پر وہ ایسا رویہ رکھ رہا ہے آہستہ آہستہ سب بدل جائے گا نجانے کیوں سلمٰی کا دل اس کی باتوں پر یقین کرتا چلا جاتا تھا۔ ایک ڈراؤنا خواب تھا دھیرے دھیرے آنکھ کھل رہی تھی۔

شیزا باہر تخت پر بے وجہ اکیلی بیٹھی ہوئی تھی تخت کے اردگرد بے شمار خشک پتے بکھرے ہوئے تھے۔ جو ذرا سا قدم پڑنے پر ہی اپنا وجود کھو دیتے تھے صبح ہی صفائی کروائی مگر لگتا تھا کہ جھاڑو دی ہی نہیں۔ وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اس کے پاس آ بیٹھی تھی۔

شیزا کی آنکھوں میں کچھ بھی نہیں تھا نہ ہی اس کے ہونٹ کچھ کہنا چاہتے تھے نجانے کیوں حور جہاں کو اس پر ترس آ گیا تھا۔ ایسی ہی کچی

خزائیں اس نے بھی گزاری تھیں، کسی کے لیے وقت ایک جیسا نہیں رہتا اس کا وقت بدل گیا تھا۔ شیزا کسی بھی طرح وقت کے ساتھ ایڈجسٹ کر لے گی مگر پچھلے زندگی کی طرف تو اسے آنا چاہیے اسے گلزار سے دل لگانا چاہیے پھر آہستہ آہستہ معاذ کے دل میں بھی جگہ بنا ہی لے گی۔

فرح روایتی عورت نہیں تھی اس نے شیزا کے آنے کے باوجود کوئی شکن اپنے چہرے پر آنے نہیں دی تھی۔ دل تک پہنچنے میں وقت لگتا ہے اور اترنے میں بس ذرا سا وقت۔

"شیزا! تمہارے لیے چائے بنا دوں۔" حور جہاں کو اس کی فکر تھی۔ اس کا دل ٹوٹ چکا تھا، چوٹ روح پر پڑی تھی۔ آنکھیں بے نور تھیں مگر اس نے کچھ نہیں کہا بس ٹھنڈی چائے کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ بھرتی رہی۔ وہ اسے دیکھتی رہی دیر تک۔

نور جہاں دھیرے دھیرے سورۃ فاتحہ پڑھ رہی تھی ابھی چار سال کی بھی نہیں تھی مگر اس کے لبوں سے پرنور آیتیں ایسے ادا ہو رہی تھیں کہ خود مصطفیٰ چچا حیران رہ گئے تھے۔ اس ننھی سی جان کو بھی اللہ سے جوڑ دیا تھا پھر سارے سکھ چین کے زرد پتے ان پر گر گئے تھے۔

وہ وہی لڑکی تھی ہاں وہی، جس کو ان کے خیال میں نماز بھی نہ آتی ہوگی، کتنا چھوٹا سوچتے ہیں ہم جب اپنے سے کسی کو کمزور دیکھتے ہیں۔ لوگ ہماری سوچ کے برعکس بھی تو ہو سکتے ہیں بس مختلف، دور سے اسے دکھ سہنا پڑا تھا زندگی مکمل تھی اور کسی اس نے ادھوری بھی نہیں۔

وہ خزاں میں چلتے ہوئے اسد کی طرف جا رہی تھی وہ تو زرد رتوں کا چاند تھی پھر وہ بہار میں کیسے بدل گئی شاید صبر کی وجہ سے اور صبر کرنے والوں کے ساتھ یقیناً اللہ ہے۔

☆☆

قرۃ العین خرم ہاشمی

دُعا کا دیا

قرۃ العین خرم ہاشمی

دُعا کا دیا

"فریال بیٹی! ان سے ملو یہ میری بچپن کی سہیلی رافعہ ہیں۔ پچھلے کچھ مہینوں سے اپنے بیٹے کے پاس رہنے دبئی گئی ہوئی تھیں۔ کچھ دن پہلے ہی واپس آئی ہیں اور فرصت ملتے ہی سب سے پہلے میری بہو کو دیکھنے چلی آئیں۔"

عالیہ نے بہت محبت سے اپنی سہیلی کا تعارف اپنی ایک مہینہ پہلے بنی بہو فریال سے کروایا۔ جس نے ایک طائرانہ نگاہ سامنے بیٹھی سادہ سی عورت پر ڈالی اور منہ بناتی صوفے پر بیٹھ گئی۔ رافعہ چونکیں۔ فریال کے چہرے کے بدلتے رنگ دیکھ کر وہ دل میں حیران ہو رہی تھیں کہ پہلی ملاقات، جس میں ابھی تو تعارف کا مرحلہ ہی طے نہیں ہوا اور بہو بیگم کے مزاج نہیں مل رہے تھے۔

"بھئی۔ میں کوئی عجوبہ تو نہیں ہوں کہ ہر دوسرے دن کوئی نہ کوئی دیکھنے یا ملنے چلے آرہا ہے۔ ٹھیک ہے شادی پہ سب نے دیکھ لیا۔ کافی ہے۔"

فریال نے اپنے خوب صورت جدید انداز میں کٹے بالوں کو ادا سے جھٹکتے ہوئے اظہار رائے کیا تو رافعہ نے نرم مسکراہٹ چہرے پر سجا کر فریال کی طرف دیکھا۔

"بتایا تو ہے کہ رافعہ شادی پر نہیں آسکی تھیں۔ ویسے بھی یہ رسمیں چند دن ہی چلتی ہیں۔ بعد میں دوڑتی بھاگتی زندگی میں ذمہ داریوں تلے دب کر سب کچھ پیچھے رہ جاتا ہے۔"

عالیہ نے سنجیدگی سے کہا۔ فریال سر جھٹک کر منہ میں کچھ بڑبڑائی۔ رافعہ سمجھ کر سر ہلانے لگیں۔

"دراصل آج کل کی بچیاں جلد رسموں سے گھبرا جاتی ہیں۔ خیر یہ کچھ تحائف میری طرف سے ہیں اور یہ سلامی بھی۔"

رافعہ نے اٹھ کر فریال کے سر پر پیار دیتے ہوئے دعائیں دیں اور کچھ پیسے اسے پکڑائے تو فریال گڑبڑا گئی۔ اس کے چہرے پر شرمندگی کا تاثر تھا جبکہ عالیہ نے جتاتی نگاہوں سے فریال کی طرف دیکھا تو فریال نے نگاہیں چرالی تھیں۔

"میں چائے بنا کر لاتی ہوں۔" فریال نے جلدی سے کہا اور وہاں سے اٹھ کر چلی گئی۔

"کیسی لگی میری اکلوتی بہو؟" عالیہ نے مسکرا کر پوچھا۔

"اچھی بچی ہے۔ تھوڑی ضدی اور ہٹ دھرم لگتی ہے مگر بات کو جلد سمجھنے کی صلاحیت ہے۔ تم نرمی اور سمجھ داری سے کام لو گی تو ان شاء اللہ سب ٹھیک رہے گا۔"

رافعہ نے نپے تلے انداز میں کہا۔ رافعہ کی تین بہوویں تھیں اور تینوں کے ساتھ ان کا سلوک مثالی تھا۔ اس لیے عالیہ ہر بات میں ان سے مشورہ کرتی تھیں۔ کچھ دیر کے بعد فریال چائے کی ٹرالی گھسیٹتی لاؤنج میں داخل ہوئی۔ اس نے مختصر وقت میں چائے پر کافی اہتمام کر لیا تھا۔ یہ دیکھ کر دونوں ہی بہت متاثر نظر آرہی تھیں۔

☆☆☆

"امی! آپ نے ارحم کو برتھ ڈے سرپرائز کے بارے میں ہرگز نہیں بتانا۔"

فریال کچھ دیر پہلے ہی شاپنگ کر کے بازار سے تھکی ہاری لوٹی تھی۔ کچھ دن کے بعد ارحم کی سالگرہ تھی۔ فریال نے اس کے لیے گھر میں چھوٹی سی پارٹی رکھی تھی۔ جس میں صرف گھر کے لوگ اور دو گلیاں چھوڑ کر رہنے والی اس کی اکلوتی نند اپنی فیملی کے ساتھ مدعو تھی۔ عالیہ خاموشی سے فریال کے جوش کو دیکھ رہی تھیں۔ انھیں بہت اچھا لگ رہا تھا کہ فریال کو اپنے شوہر سے اتنی محبت ہے۔ فریال بہت زندہ دل لڑکی تھی جو زندگی کے ہر لمحے کو دھوم دھام سے منانے پر یقین رکھتی تھی۔ عالیہ کو اس کی کسی بات پر اعتراض نہیں تھا کیونکہ اپنے گھر میں خوشیاں دیکھ کر، عالیہ کو بہت اچھا لگتا اور وہ ہمیشہ دل میں ان خوشیوں کے دائمی ہونے کی دعا مانگتی۔

فریال ہر چیز پرفیکٹ چاہتی تھی۔ اس لیے کسی چیز پر سمجھوتا کرنے کو تیار نہیں تھی۔ مہنگے ڈریس، کیک، اعلا [illegible] ہر چیز پر

فریال نے دل کھول کر پیسہ خرچ کیا۔ حالانکہ عالیہ کو پیسے کے بے جا اسراف پر کچھ تحفظات تو تھے مگر عالیہ نے نظر انداز کر دیا کہ ان کا کیا معمولی سا اعتراض بھی فریال کی خوشی کو ماند کر سکتا تھا۔ عالیہ اپنے اوپر روایتی ساس کی چھاپ نہیں لگانا چاہتی تھیں۔ اس لیے خاموشی سے سب دیکھتی رہیں۔

سالگرہ والے دن ارحم کو آفس بھیج کر فریال کچن میں چلی گئی۔ سارا دن کام کر کے شام کو مہمانوں کے آنے سے پہلے فریال خوب صورتی سے تیار ہو گئی۔ ارحم آفس سے گھر آیا تو سالگرہ کے کیک، موم بتیوں کی جلتی روشنیوں اور تازہ پھولوں کی سجاوٹ نے اس کا استقبال کیا۔ ارحم کے لیے یہ بہت خوش گوار سرپرائز تھا۔ رات تک محفل جمی رہی۔ عالیہ اپنے گھر میں خوشیاں رقص کرتے دیکھ کر بہت خوش تھی۔

"فریال بہت زندہ دل لڑکی ہے۔ وہ زندگی کے ہر لمحے کو یادگار بنانے کی کوشش کرتی ہے۔"

اگلے دن عالیہ نے ناشتے کے بعد پہلا فون اپنی دوست کو کیا اور کل کے گزرے خوش گوار دن کے بارے میں تفصیل سے بتانے لگیں۔ رافعہ بھی سن کر مسکرانے لگیں۔ رافعہ کو متاثر دیکھ کر، عالیہ کے دل سے وہ ملال بھی ختم ہو گیا جو فریال کو فضول خرچی کرتے دیکھ کر دل میں پیدا ہوا تھا۔

☆☆☆

سردیوں کے دھند میں لپٹے دنوں نے عالیہ کو اپنے کمرے تک محدود کر دیا تھا۔ عالیہ کی صحت کے لیے سردی کی شدت برداشت کرنا مشکل ہو گیا تھا۔ اس لیے وہ زیادہ تر کمرے میں بند رہتیں۔ گھر کی مکمل ذمہ داری فریال کے سر تھی۔ فریال اپنی مرضی سے جو دل چاہے کرتی۔ اسے کسی کی روک ٹوک کا ڈر نہیں تھا۔ گھر کے معاملات سے دور رہنے کے باوجود عالیہ جانتی تھیں کہ گھر کا بجٹ کافی حد تک بگڑ چکا تھا۔ وجہ فریال کی فضول خرچی تھی۔ وہ بلا ضرورت سامان سے گھر بھرنے کی عادی تھی۔ ارحم اور فریال کے درمیان ہونے والی بحث اکثر عالیہ کے کانوں میں پڑتی مگر عالیہ ان سنی کر دیتیں کہ فریال اسی طرح گھر داری سیکھے گی مگر یہ عالیہ کی خام خیالی ثابت ہوئی۔

ایک دن ناشتے کے وقت ارحم اور فریال میں مدہم لہجے میں ہوتی بات چیت اچانک تیز گفتگو کا روپ دھار گئی تو مجبوراً عالیہ کو لاؤنج سے اٹھ کر ڈرائنگ روم میں آنا پڑا۔ جہاں ارحم کے چہرے پر شدید خفگی کا تاثر تھا۔ فریال بھی غصے میں نظر آرہی تھی۔ عالیہ کو اندر آتا دیکھ کر تیز لہجے میں کہنے لگی۔

"میں آپ سے بات کرنے ہی آرہی تھی۔ پچھلے کچھ دنوں سے ارحم کا رویہ میرے ساتھ اچھا نہیں ہے۔ میری ہر بات پر اعتراض کرتے ہیں۔ ہر وقت محدود آمدنی اور وسائل کا رونا روتے ہیں۔ دیکھیں یہ سب تو زندگی کے ساتھ چلتا ہے۔ اب ہم اس وجہ سے اپنی خوشیوں سے تو منہ نہیں موڑ سکتے ہیں نا۔"

فریال نے لمبی تقریر کی۔ عالیہ نے گہری سانس لے کر ارحم کی طرف دیکھا۔ وہ جانتی تھیں کہ ان کے تحمل مزاج بیٹے کو بلاوجہ غصہ نہیں آتا تھا۔

"صبح صبح کس بات پر تم دونوں بحث کر کے اپنے موڈ خراب کر رہے ہو؟" عالیہ نے نرم لہجے میں سوال کیا۔

"ہماری شادی کو ابھی صرف چار مہینے ہوئے ہیں اور ان چار مہینوں میں، میں کوئی چار سو بار تو کسی نہ کسی خوشی کو دھوم دھام سے منا چکا ہوں۔ حد ہے۔ مجھے تو اب خوشی کے نام سے چڑ ہونے لگی ہے۔" ارحم نے غصے سے کہا۔

"حد تو جھوٹ بولنے میں ہے۔ چند بار ہی میں نے کسی خوشی کو منایا ہوگا۔ آپ نے چار سو بنا دیا۔" فریال نے تپ کر کہا۔ عالیہ کو اس کا لہجہ برا لگا۔

"آرام سے بات کرو۔ شوہر ہے تمہارا۔" عالیہ نے نرمی سے ٹوکا۔

"آپ اپنے بیٹے کو بھی سمجھائیں کہ میں ان کی بیوی ہوں۔" فریال نے ترکی بہ ترکی جواب

دیا۔
"دیکھو فریال! اس میں بحث کرنے یا لڑنے کی بات نہیں ہے۔ میں مزید کسی فضول شوق کی خاطر پیسہ خرچ کے موڈ میں نہیں ہوں۔"
ارحم نے سنجیدہ لہجے میں ضبط کرتے ہوئے کہا۔ عالیہ نے چونک کر فریال کی طرف دیکھا۔
"چار دن بعد، نیا سال شروع ہو رہا ہے۔ میں چاہ رہی تھی کہ ہم نئے سال کا استقبال آتش بازی سے کریں۔ بون فائر، سرد راتوں میں بہت اچھا لگتا ہے اور!" فریال نے پُرجوش انداز میں کہا تو عالیہ گہری سانس لے کر رہ گئیں۔
"نئے سال کے بعد، پھر کوئی دن آ جائے گا۔ فروری میں تمہیں ویلنٹائن ڈے یاد آئے گا تو مارچ میں بہار کو منانے کا خیال۔ مجھے ان فضول چیزوں سے دور ہی رکھو۔" ارحم نے ہاتھ جوڑ کر کہا اور بڑبڑاتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔
"ارحم ٹھیک کہہ رہا ہے۔ نیا سال منانے کے لیے اتنا اہتمام کرنے کی کیا ضرورت ہے۔" عالیہ نے نرمی سے کہا۔
"اف امی! آپ کو نہیں پتا۔ آج کل لوگ نئے سال کے آغاز میں کیا کچھ نہیں کرتے۔ کہتے ہیں کہ سال کا آغاز جیسا کرو گے، سارا سال ویسا ہی گزرے گا۔ ارحم کی مرضی ہے۔ میں اپنی دوستوں کے ساتھ نیو ائیر نائٹ پارٹی میں چلی جاؤں گی۔ ارحم صاحب گھر میں رہیں۔" فریال نے ہٹ دھرمی سے کہا۔
"اگر ایسی بات ہے تو ہر نئے دن، ہر نئے سال کا آغاز دعا کے دیے جلا کر کرو۔ جس کی روشنی آنے والی مشکل کے اندھیرے میں مددگار ثابت ہو گی۔" عالیہ نے نرمی سے کہا مگر فریال ان سنی کر کے وہاں سے چلی گئی۔
عالیہ نے گہری سانس لی۔ وہ جو بات محسوس کر رہی تھیں وہ غلط نہیں تھی۔ فریال وقتی خوشی اور سکون کو سب کچھ سمجھتی تھی۔ اس کے نزدیک نئے دن کی
کے ہر خاص اور عام موقع پر شور کرنا، گانے گانا، جھومنا، دونوں ہاتھوں سے پیسے لٹانا ہی خوشی کا نام تھا۔

☆☆☆

"امی! آپ جاگ رہی ہیں؟ سردی تو نہیں لگ رہی؟"
رات بارہ بجے کے قریب ارحم ماں کے کمرے کی لائٹ جلی دیکھ کر فکرمندی سے اندر داخل ہوا تو عالیہ نے چونک کر بیٹے کی طرف دیکھا۔
"ہاں، ٹانگوں میں بہت درد ہے۔ شدید سردی میں جوڑوں کا درد بھی بڑھ جاتا ہے۔" عالیہ نے کہا تو ارحم بے چینی سے آگے بڑھا اور ماں کے پیروں کے پاس بیٹھ گیا۔
"آپ سو جائیں۔ میں آپ کے پیر دباتا ہوں۔" ارحم نے نرمی سے کہا تو عالیہ مسکرا دیں۔
"تم کیوں بوڑھی ماں کے ساتھ نئے سال کا آغاز اداسی سے کرنا چاہتے ہو۔ فریال نے تمہیں فارم ہاؤس پر ہونے والی نیو ائیر پارٹی میں بلایا تو تھا۔ تم چلے جاتے۔" عالیہ نے نرمی سے کہا۔ فریال شام کو اپنی دوست کے ساتھ چلی گئی تھی۔ گھر میں صرف وہ دونوں ہی تھے۔
"مجھے آپ کی دعا اور سائے میں ہی ہر سال کا آغاز کرنا ہے۔ سارا سال ہر آفت سے محفوظ رہتا ہوں۔"
ارحم نے لاڈ سے کہا تو عالیہ کی آنکھوں میں دعا بن کر آنسو چمک اٹھے۔ عالیہ نے آگے بڑھ کر ارحم کا ماتھا چوما۔
"میری دعا ہمیشہ تمہارے روشن ماتھے پر چاند بن کر چمکے گی۔" عالیہ نے محبت سے کہا۔ اس وقت کہیں قریب ہی نئے سال کے آغاز پر آتش بازی اور پٹاخوں کا شور بلند ہوا تھا۔ ارحم اور عالیہ نے مسکرا کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔
"نیا سال مبارک امی ـــ!" ارحم نے مسکرا کر کہا۔ [illegible]
جانتا تھا کہ ماں راضی اور خوش ہے تو آنے والا ہر لمحہ روشن ہے۔

☆☆☆

یہ سال کا دوسرا روشن دن تھا جب سیڑھیاں اترتے ہوئے فریال کا پاؤں سلپ ہوا اور وہ گر کر زخمی ہو گئی۔ فریال کو کچھ دن بستر پر لیٹ کر گزارنے پڑے۔ فریال ٹھیک ہو کر روزمرہ کے کام سرانجام دینے لگی جب ایک دن بازار سے واپس آتے ہوئے بائیک پر سوار دو لڑکوں نے اس کا ہینڈ بیگ چھین لیا جس میں قیمتی موبائل کے علاوہ اچھی خاصی رقم بھی موجود تھی۔ فریال آگے پیچھے آنے والی مشکلات سے گھبرا گئی۔
"اف! میرے لیے تو یہ سال مشکل ہی ثابت ہو رہا ہے۔ ابھی نئے سال کے کچھ دن گزرے ہیں اور آگے پیچھے پریشانیاں آ رہی ہیں۔" فریال نے پریشانی سے فون پر اپنی دوست سے کہا تو لاؤنج میں داخل ہوتی عالیہ نے چونک کر اسے دیکھا تھا۔ اس کی دوست نے کسی عامل کے پاس جانے کا مشورہ دیا۔
"ٹھیک ہے۔ ہم کل ہی عامل بابا کے پاس چلتے ہیں۔ تم ان سے ٹائم طے کر کے مجھے بتا دینا۔" فریال نے جلدی سے ہامی بھر کر فون بند کر دیا۔ عالیہ نے سنا تو حیرانی سے فریال کی طرف دیکھا۔
"کسی عامل کے پاس جانے کے بجائے، صدقہ دو۔ اللہ آسانی عطا کرے گا۔" عالیہ نے نرمی سے کہا۔
"مگر میری دوست بتا رہی ہے کہ بہت مشہور عامل ہیں۔ ان کے دم سے ہر مشکل دور ہو جائے گی۔ تھوڑے پیسے لگیں گے۔ مگر خیر ہے۔ ابھی تو سال کی ابتدا ہے۔ سارا سال تو ایسے نہیں گزار سکتی ناں۔ عامل بابا کے تعویذ سے ہر بلا سے محفوظ رہوں گی۔"
فریال نے دوست سے سنی سنائی بات کہی تو
عالیہ نے افسوس سے سر ہلایا۔
"ایک بات تو بتاؤ! تم نے نئے سال کا آغاز اپنی اسی دوست کے ساتھ، ہلا گلا کرتے، نیو ائیر پارٹی منا کر کیا تھا کہ سارا سال ایسے ہی خوش باش رہو گی مگر ایسا نہیں ہوا۔ کیوں؟" عالیہ نے سنجیدگی سے سوال کیا تو فریال گڑبڑا گئی۔ اسے کوئی جواب سمجھ میں نہیں آیا۔
"ایسا اس لیے نہیں ہوا کہ ان چیزوں میں کوئی سچائی نہیں تھی۔ سچائی اگر ہے تو وہ اپنوں کے ساتھ اور پیار میں ہے۔ سچائی اگر ہے تو وہ دعا میں ہے۔ صرف سال ہی نہیں، اپنی زندگی کے ہر نئے دن کا آغاز دعا سے شروع کرو۔ دعا کا حصار ازل تک ساتھ چلتا ہے۔ یہ حصار کبھی نہیں ٹوٹتا ہے۔ میرا کام تمہیں سمجھانا تھا۔ آگے تمہاری مرضی ہے۔"
عالیہ نے نرمی سے کہا اور فریال پر فیصلہ چھوڑ کر وہاں سے جانے لگیں۔ تب ہی فریال کے موبائل پر اس کی دوست کی کال آ گئی جو عامل سے کل کا وقت طے کر کے اسے بتا رہی تھی۔
"ایسا کرو کہ عامل بابا کو منع کر دو۔ میں جان گئی ہوں کہ میرا محفوظ حصار کون سا ہے۔"
فریال نے یقین سے کہا اور فون بند کر دیا۔ عالیہ مسکرا دیں۔ فریال ضدی، ہٹ دھرم، فضول خرچ ضرور تھی مگر اس کی سب سے بڑی خوبی، اس کے مزاج میں لچک کا ہونا تھا۔ وہ تجربے کے بعد سیکھنا جانتی تھی۔ یہی بات رافعہ نے فریال کے بارے میں کہی تھی۔ عالیہ کو آج رافعہ کے درست تجزیے پر یقین آ گیا جو اس نے پہلی ملاقات میں فریال سے مل کر کیا تھا۔ عالیہ کو یقین تھا کہ آنے والے وقت میں، فریال کے جلائے دعا کے دیے، اس گھر اور ان کی زندگی میں ہمیشہ خیر کی روشنی پھیلاتے رہیں گے۔

☆☆

آسیہ رئیس خان

روگ، بجوگ، سنجوگ

ابر اوڑھے اور نمی سمیٹے آج کی صبح بڑی حسین تھی۔ پچھلی رات برسے بادلوں کی وجہ سے ہوائیں مستانی اور فضا دھواں دھواں سی تھی۔ سمندر قریب ہی تھا اس لیے ٹھنڈک کا اثر بھی زیادہ تھا۔ گھاس اور پودوں پر ٹھہری بوندیں ان کی سبز پوشاک کو دلکش بنا رہی تھیں۔

ساون جاتے جاتے یوں جوش میں آیا تھا کہ کل سے مسلسل برسات ہو رہی تھی۔ اپنے کمرے کی کھڑکی سے شیشے پر ہاتھ پھیر کر اس پار کے بھیگے موسم کو اس نے بھیگی پلکوں سے مسکرا کر دیکھا۔

سمندر کنارے اس ریزورٹ میں آنا اس کی زندگی کی سب سے بڑی تبدیلی تھی۔ اب اس نے بہت آگے کا سوچنا چھوڑ دیا تھا۔ صبح اٹھ کر اسے بس آج کے دن کرنے والے کام کی فکر ہوتی تھی اور وہ اس شام تک کا ہی سوچتی تھی۔

کھڑکی کے پاس سے ہٹ کر وہ پیچھے آئی۔ آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر شانے سے بالشت بھر نیچے جھول رہے نم بالوں کو سمیٹ کر آدھے بال کیچر میں قید کیے۔ موسچرائزر لگایا، لپ بام ہونٹوں پر رگڑنے کے بعد دروازے کے پیچھے ٹنگا سوئٹر پہنا، کلائی پر گھڑی باندھی اور آخر میں پلنگ سے دوپٹا اٹھایا اور جوتے پہن کر دروازہ بند کر کے باہر آ گئی۔

مکمل ناول

جس کمرے کو اس کا دفتر ہونے کا شرف حاصل تھا وہ اس طویل و عریض املاک کے داخلی دروازے کے قریب پہلا کمرہ تھا اور اس کی رہائش والا کمرہ سب سے آخری۔ اس کے بغل والے کمروں میں مظفر چاچا کی رہائش تھی۔ ان دنوں ان کی بیوی بیٹا بہو اور پوتا گاؤں گئے ہوئے تھے۔

پتھریلی روش پر چل کر 'ایڈمنسٹریٹو آفس' پہنچنے تک وہ ملازمین کی گڈ مارننگ میڈم اور گڈ مارننگ میم کا جواب دیتی رہی۔ آج ناشتے کے لیے کھانے کے کمرے کے باہر احاطے میں ہونے کا دن تھا۔ اس حصے میں اوپر چوں کہ چھت تھی، اس لیے متوقع بارش کے باوجود باورچی خانے کا عملہ انتظامات میں مصروف تھا۔

ابھی موسم ریزورٹ کی سیر کا نہیں تھا اس لیے کاٹیج اہل اعیال سے خالی تھے ورنہ ان کی موجودگی میں جب سارے کاٹیج بچوں، عورتوں، مردوں اور بزرگوں پر مشتمل خاندانوں سے بھرے ہوتے تب ماحول ہی مختلف ہوتا تھا۔ 'آف سیزن' میں عموماً وہاں دیگر سرگرمیاں ہوتی تھیں جیسے اس وقت یہاں پچھلے چار دنوں سے ایک کارپوریٹ کانفرنس ہو رہی تھی۔ اس کی ٹیم کے ملازمین کے علاوہ کل شب ایک نیا مہمان آیا تھا۔

"السلام علیکم۔" دفتر کے باہر ہی اسے مظفر چاچا مل گئے۔

"وعلیکم السلام۔"

"آج کانفرنس کا آخری دن ہے۔ نیا گیسٹ سر کا دوست ہے۔ ان کی بکنگ نہیں تھی، کل سر کا فون آیا تھا کہ ان کے لیے نمبر سیون ریڈی کر دیا جائے۔"

مظفر چاچا اسے مفصل حالات سے آگاہ کر رہے تھے۔ وہ اس کے یہاں آنے سے پہلے بلکہ جب یہ ریزورٹ بننا شروع بھی نہیں ہوا تھا اور یہ جگہ ایک خالی میدان تھا تب سے اس کی رکھوالی کا کام کر رہے تھے۔

زیادہ پڑھے لکھے نہیں تھے اور نہایت نرم خو بھی۔ کمپیوٹر چلانا اور حساب کتاب کا اندراج جیسے کام ان کے بس کے نہیں تھے اور ملازمین بھی ان کے مزاج کا غلط فائدہ اٹھاتے تھے۔

یہی وجہ تھی کہ ان کاموں کے لیے ایک منیجر رکھنا پڑا تھا ورنہ یہاں کے کرتا دھرتا مظفر چاچا ہی تھے۔ وہ موئس کے والد کے پرانے اور خاص بندے تھے۔ جب اس سے پہلے والے منیجر نے نوکری چھوڑی تو وہاں وہ آ گئی ورنہ کام تو سارا وہی دیکھتے تھے۔

وہ گزشتہ شب کی ابو کی فون کال ذہن سے جھٹک کر پوری توجہ سے کام کر رہی تھی کہ فون بجنے لگا۔ پھر کہیں گھر سے فون نہ ہو، اس خدشے کے ساتھ اس نے اسکرین پر نظر ڈالی اور علیزہ کا نام دیکھ کر اطمینان سے فون اٹھایا مگر دعا سلام کے بعد اس کا اطمینان ہوا ہو گیا۔

"ابھی تمہاری امی سے بات ہوئی۔" اس کے اعصاب اس بری طرح شل ہوئے کہ وہ اس بات پر حیرت کا اظہار بھی نہیں کر سکی۔

"تم نے بتایا کیوں نہیں عرشی کی منگنی ہے؟"

"میں بھی بھول گئی تھی کل ابو نے یاد دلایا۔"

اس نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے دھیرے سے کہا۔

"پھر؟"

"پھر کیا؟"

"جانے کا کیا سوچا؟"

"کچھ بھی نہیں۔"

"بہن کا فنکشن ہے، تمہاری موجودگی ضروری ہے ورنہ سب کتنی باتیں بنائیں گے، تمہیں بھی اندازہ ہے۔"

"کچھ الفاظ ہی ادھر ادھر کر لو۔" وہ اس کی امی کے جملے دہرا رہی تھی۔

"ایسی کوشش بھی کیوں کروں، جب تم نے تب بھی سمجھی جاتا ہے۔"

"میرا ذرا بھی دل نہیں ہے، وہاں جا کر مجھے کتنی باتیں سننا پڑیں، اس کی کسی کو پروا نہیں۔" وہ ماں سے بھی شکوہ نہیں کر سکتی تھی مگر علیزہ واحد ہستی تھی جس سے وہ سب کہہ سکتی اور کہتی بھی تھی۔

"تم چاہو تو سب کی زبانیں بند کر سکتی ہو، اتنی معصوم اور بھولی نہیں ہو۔"

"ہاں تاکہ سب ابو کی تربیت اور چھوٹ پر انگلی اٹھائیں۔"

"تم سب کی انگلیاں بھی توڑ سکتی ہو۔" اسے اس کی جنگجو صلاحیتوں پر بڑا بھروسا تھا۔

"میری بے وقوف سکھی! یہ سب کرنا ہوتا تو یہاں تمہاری خادمہ کیوں بنتی؟"

"کون سی خدمتیں کر رہی ہو میری؟"

"ٹھیک ہے تمہاری ملازم تو ہوں۔"

"ٹھیک ہے تم موئس کی ملازم ہو۔ یہ سب چھوڑو کیسے اور کب جاؤ گی، یہ بتاؤ؟"

"لیزا! میرا ابھی قطعی دل نہیں ہے۔"

"اپنے ابو کی خاطر جاؤ۔" رگ رگ سے واقف راز داں کے نقصان بھی بہت ہیں، وہ دم پر ہاتھ رکھتی ہے یا نبض پر ہاتھ۔

"ایک تو موسم ایسا خراب ہے پھر ابھی کنفرم ٹکٹ بھی نہیں ملے گی۔"

"ٹکٹ تو شاید مل بھی جائے لیکن ادھر کوئی برج ٹوٹ گیا ہے تو اس روٹ کی ٹرینیں بند ہیں۔"

"اور بس سے جانے کا سوال ہی نہیں۔ ایک بار کا تجربہ عمر بھر کے لیے کافی ہے۔"

"تمہیں کیا ہی ہوا ابھی پچاس کی نہیں جو بس سے سفر نہیں کر سکتیں۔"

"تمہیں معلوم بھی ہے کتنے گھنٹے کا سفر ہے؟"

"نہیں۔"

"آٹھ دس گھنٹے لگتے ہیں بلکہ اس سے زیادہ بھی اور راستوں کا حال تو پوچھو ہی مت۔"

"آٹھ دس گھنٹے اتنے بھی زیادہ نہیں۔ ایڈجسٹ اور کر لو۔"

"میرا مالک اتنی تنخواہ نہیں دیتا مجھے، دوسرے ابو تنہا اتنا لمبا سفر ٹیکسی سے کرنے کی اجازت نہیں دیں گے۔"

"رکھو فون۔ تم بس بہانے بناؤ گی میں دیکھتی ہوں شاید ٹرین شروع ہوئی ہو یا جہاں تک جا رہی ہے وہاں تک جاؤ آگے بس سے جانا۔"

"میں ابو سے بات......"

"اللہ حافظ۔" اس نے فون بند کر دیا۔

وہ جانتی تھی علیزہ اسے عرشی کی منگنی میں شریک کروا کے ہی دم لے گی۔ اب یکسوئی دشوار تھی۔ اپنا کام نپٹا کر اس نے معمول کے مطابق دوپہر کے کھانے سے قبل 'کچن اور ہاؤس کیپنگ اسٹاف' کی خبر گیری کی اور انتظامات کا جائزہ لیا۔

کچھ دیر میں ہی کھانے کے کمرے میں ٹھہراؤ شروع ہوتا تھا۔ وہ کمرے میں جانے کے بجائے باہر کھلی فضا میں چلی آئی۔ اسے اطمینان تھا کہ اس وقت سب کھانے کے لیے ایک جگہ جمع ہوں گے اور ادھر کوئی نہیں ہوگا۔

اسے یہاں رہتے دو سال ہو گئے تھے۔ جس دن اس نے خالہ کو کہتے سنا تھا کہ وہ جہاں شیراز کے رشتے کی بات کرتی ہیں، طلاق شدہ بہن کی بات درمیان میں آ جاتی ہے، اس نے گھر چھوڑنے کے متعلق سوچنا شروع کر دیا تھا۔ لڑکی والوں کو یا تو اعتراض ہوتا تھا کہ طلاق شدہ بڑی نند، بھی بھابھی کو سکون سے رہنے نہیں دے گی یا فرمائش کہ پہلے اس نند کا کہیں نکاح کروا دیا جائے۔

پھر جب خالہ اس کے لیے تواتر سے رشتے لے کر آنے لگیں اور کسی طرح تھما سلسلہ دوبارہ شروع ہوتا دیکھا تو اس نے بلا سوچے سمجھے اعلان کر دیا کہ وہ ملازمت کے لیے گھر سے دور جا رہی ہے۔

وہ کامرس گریجویٹ تھی۔ طلاق کے بعد خود کو مصروف رکھنے کے لیے کچھ دن اس نے اپنے شہر کے نجی اسکول میں بچوں کو پڑھایا تھا پھر وہ چھوڑ کر گھر میں ٹیوشن لینا شروع کی۔ کچھ دن بعد وہ بند کر کے کئی کمپیوٹر کورس کیے پھر ایک اور جگہ اکاؤنٹنگ کا کام کیا۔ کچھ وقت بعد اس سے بھی اکتا گئی تو آن لائن ہاسپٹیلٹی منیجمنٹ کورس کر لیا۔

جب ابو نے نوکری کے بابت پوچھا تو اس نے کہہ دیا۔ اسی کورس کی بنیاد پر اس نے کئی جگہ درخواستیں بھیجی تھیں جن میں سے کچھ نے اسے انٹرویو کے

لیے بلایا ہے۔
اس جھوٹ کے بعد اس نے بچپن کی اکلوتی، امیر اور رازدار سہیلی علیزہ کو فون کھڑکایا کہ جلد میرے لیے نوکری ڈھونڈو اور ان ہی دنوں علیزہ کے شوہر کو اپنے علی باغ کے ہالی ڈے ریزورٹ کے لیے منیجر کی ضرورت تھی۔
اس کے ایسی جگہ رہنے اور کام کرنے کی مخالفت سب کے ساتھ ساتھ ابو نے بھی کی اور یہاں بھی علیزہ کام آئی۔ مظفر چاچا اپنی بیوی اور بیٹے بہو کے ساتھ وہاں رہتے تھے۔ ان کی موجودگی اور علیزہ کی یقین دہانیوں کے بعد کہ وہ قریب ہی ہے، اس کی خبر گیری اور حفاظت کی ذمہ داری اس کی ہے، اسے ابو سے اجازت مل سکی تھی۔
اس کا زیادہ وقت اپنے کمرے میں کتابیں پڑھنے میں گزرتا تھا یا سمندر کنارے گھنٹوں ٹہلنے میں۔ جب اکتا جاتی تو علیزہ سے ملنے چلی جاتی تھی۔ اس دوران وہ چار پانچ بار ہی گھر گئی۔ جس میں شیراز کی شادی بھی شامل تھی اور اس آزمائش کی وجہ سے ہی وہ عرشی کی منگنی میں نہیں جانا چاہتی تھی۔
وہ اپنے خیال میں گم سوئمنگ پول سے آگے نکل آئی تھی۔ بہت بڑے رقبے پر چھوٹے بڑے سے بارہ بنگلے بنے تھے۔ اس کے علاوہ کھانے کا بڑا کمرہ تھا، ایک کانفرنس ہال تھا۔ اس کے ساتھ ہی ایک بڑا ہال مختلف انڈور کھیلوں کے لیے مختص تھا۔ وہ جہاں پہنچ گئی تھی وہاں کی کچی زمین میں اس کے جوتے کی دو انچ ہیل اب دھنس رہی تھی۔ مزید آگے جانے کا ارادہ ترک کر کے وہ وہیں پھولوں کے قطعے کے قریب رکھے بنچ پر بیٹھ گئی۔ یوں تو اسے بھرپور تنہائی میسر تھی مگر جب اسے کچھ سوچنا ہوتا یا وہ الجھی ہوتی تو مسلسل چلتے رہنا اس کی عادت تھی۔
کچھ دیر بعد سگریٹ کی بو پر وہ خیالوں سے باہر آئی۔ یہ کسی کی موجودگی کا ثبوت تھا۔ سوچ میں غرق کش لگاتے ہوئے، سر جھکائے چلا آرہا انظر اس وقت ٹھہرا جب راستے میں بنچ رکاوٹ بنا۔ سر اٹھایا تو بنچ کے دوسری طرف وہ اسے دیکھ رہی تھی۔
اوہ!" تب ہی دور سے اس طرف چلے آتے دو نوجوان ٹھٹھک کر رک گئے۔"
"سوری۔" وہ دونوں واپس پلٹے۔ وہ بھی شاید اس تنہا گوشے میں سگریٹ پینے آئے تھے۔
"ابھی مون کپل!" ایک کی تمسخر بھری دبی دبی آواز دونوں تک پہنچی۔
"مڈل ایج کپل بھی ہوں!" دوسرے جملے کے ساتھ دونوں کا قہقہہ بھی تھا۔
"حضرت کی داڑھی سفید ہے، میرا تو ایک بال بھی سفید نہیں۔" سدوس کے چہرے پر غصہ ابھرا اور اس نے تنفر سے سوچا۔ جب سے اس نے تیس کا ہندسہ پار کیا تھا بقول علیزہ عمر کے معاملے میں بڑی زود رنج اور حساس ہو گئی تھی۔
انظر بنا کسی ردعمل کے بنچ کے برابر سے گزر کر آگے بڑھ گیا۔
"یہ شاید مونس بھائی کے مہمان ہیں۔" اس نے اس کی پشت کو دیکھتے ہوئے اندازہ لگایا۔
ابھی چند قدم ہی طے کیے تھے کہ اچانک بارش شروع ہو گئی۔ وہ تیزی سے سامنے موجود کاٹج کی طرف بھاگی۔ کھڑکی کے چھجے کے نیچے وہ بمشکل بارش سے خود کو بچا رہی تھی۔ بارش کا زور بڑھتا جا رہا تھا۔
"کیا ضرورت تھی ادھر نکلنے کی۔" اس نے خود کو کوسا۔ مظفر چاچا سے چھتری منگوانے کے لیے اس نے سوئیٹر کی جیب سے فون نکالا۔ جب تیسری بیل پر بھی انہوں نے فون نہیں اٹھایا تو وہ بری طرح جھنجلا گئی۔ بارش اب خوب زور پکڑ چکی تھی۔
"کسی کے ہاتھ واپس بھیج دیجیے گا۔" اچانک نمودار ہو کر اس نے ہاتھ آگے بڑھایا جس میں ونڈ چیٹر جیکٹ تھا جو کسی قدر بارش سے بھی بچا لیتا تھا۔ اس مہربانی پر وہ گومگو کی کیفیت میں تھی۔
"بارش تیز ہو رہی ہے، کیچڑ کی وجہ سے چلنا مشکل ہو جائے گا۔" کہہ تو وہ بالکل ٹھیک رہا تھا۔
"تھینک یو۔" [illegible]
گیا۔ جیکٹ پہن کر ہڈ سر پر ڈالتے ہی وہ سنبھل کر آگے بڑھی۔ ہوا میں بھی تیزی ہونے لگی تھی۔ کمرے میں آ کر اس نے سکون کا سانس لیا کہ کہیں پھسلے بنا سلامت پہنچ گئی تھی۔
جیکٹ اتارتے ہوئے اسے احساس ہوا اس میں بھی سگریٹ کی بو بسی تھی۔ ظہر پڑھنے کے بعد اس نے انٹرکام پر کہہ کر کافی اور سینڈوچ منگوایا اور عبدالرزاق قریشی کا ناول لے کر بستر میں دبک گئی۔ پڑھتے ہوئے آنکھ لگ گئی تھی کہ فون کی آواز پر جاگی۔ علیزہ کا نام دیکھتے ہی وہ کراہی تھی۔
"شاہ رخ بھی غلط ہو ہی نہیں سکتا۔" علیزہ چہک کر بولی تھی۔
"ہیں؟"
"دل سے چاہو تو کائنات کا......"
"ٹھیک ٹھیک......" وہ کراہی۔
"انظر بھائی بھی اسی طرف اورنگ آباد اپنے گھر جا رہے ہیں، مونس نے ان سے بات کر لی ہے، آگے تمہیں گھر تک پہنچا دیں گے۔"
"کون انظر بھائی؟"
"انظر عرفان، مونس کے دوست ہیں، ان کے نام سے مرعوب مت ہونا۔ وہ بہت نائس اور قابل بھروسا انسان ہیں ورنہ میں تمہیں ان کے ساتھ سفر پر جانے نہیں دیتی۔" اسے نائس اور قابل بھروسہ انسان والی صفت پہلی بار بری لگی۔
"میں نے تمہاری امی سے بھی بات کر لی ہے۔"
اس کی مستعدی اسے نڈھال کر رہی تھی۔
"میں انظر بھائی کا نمبر فارورڈ کر رہی ہوں، بات کر لو کب نکلنا ہے، انہیں بھی تمہارا نمبر دیا ہے۔"
کوفت زدہ سی کروٹیں بدلنے کے بعد آخر اسے بستر چھوڑنا ہی پڑا۔ عصر پڑھنے کے بعد وہ کمرے سے باہر آئی۔ کانفرنس والے کچھ جا چکے تھے، کچھ نکل رہے تھے۔ ملازمین خالی کاٹیج کی صفائیاں کر رہے تھے۔
"میں فون نہیں کروں گی، ان کے پاس بھی میرا نمبر ہے تو۔" یہ سفر میں دیر کرنے کی کوشش تھی۔
"جب مونس بھائی نے ان سے کہا ہے تو انہیں خود ہی کال کرنا چاہیے۔"
شام کی چائے کے لیے ہال میں داخل ہوتے ہوئے اسے اندازہ نہیں تھا وہاں ایک میز پر بیٹھا انظر بھی یہی سوچ رہا ہے اور یہ اتفاق دونوں کی کوشش ناکام کرنے والا ہے۔
"وہ فون کرے تو وقت ڈیٹائیڈ ہوگا۔" کافی کا گھونٹ لیتے ہوئے انظر نے ایک بار پھر خود کو باور کرایا۔
وہ تو کسی معجزے کے انتظار میں تھا جو اسے جانے سے روک دے مگر اب مونس کی سفارش ٹالنا ناممکن تھا۔ اسے چھینک آئی اور سدوس نے آواز کی سمت چونک کر دیکھا۔
"اوہ! مجھے جیکٹ واپس کرنا تھا۔" اسے دیکھتے ہی اسے یاد آیا۔ ٹشو رکھ کر پھر کافی کا مگ اٹھاتے ہوئے انظر کی نظر اس پر پڑی۔
"السلام علیکم۔" دونوں طرف تعارف کرایا جا چکا تھا اس لیے مروت اور اخلاق نبھانا ضروری تھا۔ وہ قریب آئی۔
وعلیکم السلام میں نے جواب دیا۔ وہ منتظر تھی کہ وہ مونس کی کال یا ان کے متوقع سفر کی بات کرے گا۔
"میم! آپ کی چائے۔" ملازم اس کی چائے لیے حاضر تھا۔ اس نے میز پر رکھ دیا۔
"اور کچھ چاہیے؟"
"نہیں، تھینک یو۔" وہ چلا گیا۔
اس کے منصب، میزبانی اور علیزہ کی مہربانی کا تقاضا تھا سو وہ کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔
انظر نے فون اٹھایا اور اس میں مصروف ہو گیا۔
"گھمنڈی، بے مروت، خود پسند......"
چائے کے گھونٹ کے ساتھ چپکے چپکے جائزہ لیتے ہوئے وہ کسی ماہر کی طرح اس کی 'پروفائلنگ' کرنے لگی۔ اس کی صورت حسن کے یونانی دیوتا والے معیار پر تو شاید پوری نہ اترتی تھی لیکن مجموعی

طور پر اس کا حلیہ اور شخصیت پرکشش تھی۔ اس کی وجہ شاید اس کے وجود کا ٹھہراؤ اور وقار تھا۔

"یہاں تک ریڈ ہے۔" اچانک انظر نے فون میز کے درمیان رکھا۔ جس کا رخ اس کی سمت تھا۔ اسکرین پر کھلے گوگل میپ کے راستے پر اس کی انگلی متحرک تھی۔

"ابھی نکلیں تو ٹریفک میں پھنس جائیں گے پھر بھی اگر آپ کو جلدی ہے تو......"

"کوئی جلدی نہیں۔" اس نے جلدی سے کہا۔

"اوکے۔" اس نے فون اٹھا لیا۔ "صبح آپ جب بھی ریڈی ہوں ٹیکسٹ یا کال کر دیجیے گا۔"

"آپ وقت بتا دیں، میں آجاؤں گی۔"

لمبے سفر پر جانا ہو تو وہ رات کو نکلتا تھا یا پھر علی الصبح۔ سفر تو یہ بھی طویل تھا، بہت طویل۔

"مجھے نہ کبھی انہیں تو وقت پر پہنچنا ہوگا۔" سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھ رہی سدوس کو دیکھتے ہوئے انظر نے سوچا۔

"چھ بجے۔"

"اوکے۔"

"سوری میں۔ جیکٹ ریٹرن کرنا بھول گئی۔" کچھ لمحوں بعد اس نے کہا۔

"اٹس اوکے۔ صبح لے آئیے گا۔" وہ پھر یوں کافی پینے لگا جیسے تنہا ہو۔ سدوس کو وہ گہری سوچ میں گم محسوس ہوا۔ اس کا رویہ لیا دیا سا تھا پھر بھی چہرے سے وہ آدم بیزار نہیں لگا 'نوجوان' نہیں تھا مگر درست عمر کا اندازہ لگانا بھی مشکل تھا۔ اس کے بال زیادہ سیاہ تھے لیکن داڑھی مونچھیں زیادہ سفید۔ اس کا سوٹ شرٹ، جینز، فون، میز پر رکھے ایئر پوڈز، جوتے سب ہائی اینڈ برینڈز کے تھے۔ اسے دیکھ کر ہی لگتا تھا، کوئی امیر کبیر بڑے رکھ رکھاؤ والا بندہ ہے۔

"اور مغرور بھی!" اس نے اپنے ہی خیال کے آگے ٹکڑا جوڑا۔ اسے پھر چھینک آئی اور اس نے معذرت کی۔ کافی ختم کر کے وہ کھڑا ہو گیا۔

"صبح چھ بجے ملتے ہیں۔" بڑا ہی مزاج کے برعکس بات کرتے ہوئے لہجے میں احترام اور نرمی تھی۔

"جی۔" سدوس نے کہا۔ وہ کرسی کھسکا کر باہر نکلا پھر رک کر اسے دیکھا۔

"آپ کہاں ملیں گی؟"

"آفس۔" ذرا ٹھہر کر اس نے جواب دیا۔

"اوکے۔"

وہ چلا گیا۔ وہ بھی چائے ختم کر کے کمرے میں آگئی۔ اگلے دن کے لیے بیگ بھرا اور ابھی سے آنے والے وقت میں ہونے والی کوفت کو سوچ کر کوفت زدہ ہوتی رہی۔

اس کے والدین کی شادی شدہ زندگی کبھی بھی مثالی نہیں تھی۔ ان میں اختلاف اور جھگڑے روز کی بات تھی۔ وہ پہلی اولاد تھی اور بیٹی بھی، اسی لیے باپ سے زیادہ قریب تھی۔ شیراز اکلوتا بیٹا اور عمر میں سب سے چھوٹی تھی اور وہ دونوں باپ سے اس جیسے قریب نہیں تھے۔ بلکہ ان کا جھکاؤ ماں کی طرف زیادہ تھا۔

امی ہر اس بات کی مخالفت کرتی تھیں جس کے لیے ابو راضی ہوں۔ یہی وجہ تھی کہ بڑے غیر محسوس طریقے سے وہ لباس اور کھانے سے لے کر تعلیم اور مضامین تک میں اسلم مرزا کی پسند اور مرضی کو فوقیت اور اولیت دینے لگی۔

فضیلت چاہتی تھیں وہ آرٹس کا انتخاب کرے لیکن اس نے اپنے ابو کی طرح کامرس لیا۔ کالج بھی ماں کی مخالفت میں مخلوط تعلیم والا منتخب کیا۔

روز مرہ کی چھوٹی موٹی باتیں تو تھی ہی تھیں لیکن تابوت میں آخری کیل ثابت ہوا فضیلت کا شوہر کی ناراضی اور اعتراض کے باوجود ضد کر کے اس کی شادی کا فیصلہ۔

اس وقت اسلم مرزا کے دوست کے بیٹے کا رشتہ بھی موجود تھا جو انہیں پسند بھی تھا لیکن فضیلت نے ان کی ایک نہ چلنے دی اور اس کی شادی عاطف سے ہو گئی۔ جہاں سے اگلے ان ہی دنوں طلاق کا داغ لیے لپٹے گھر لوٹ آئی تھی۔ عاطف اور اس کے گھر والوں نے اس کی وجہ نہیں بتائی تھی نہ وہ سمجھ پائے۔

اس کے بعد اس کے اندر ماں کے لیے بغاوت کے جذبات ابھرے اور اب تک باپ پر انہیں حاوی دیکھنے کا دبا دبا غصہ ظاہر ہونے لگا۔ صرف شوہر کو زک پہنچانے اور ان کی پسند کے خلاف جانے کے لیے انہوں نے بیٹی کی زندگی تباہ کر دی تھی اور اب ان کے چہرے پر اس کا افسوس، دکھ اور ملال بھی نظر نہیں آتا تھا۔

کچھ وقت کے بعد جب دوبارہ انہوں نے اس کے لیے رشتے دیکھنا شروع کیے تو وہ ان کی ہٹ دھرمی پر ان سے پوری طرح متنفر ہو گئی کہ شوہر کو تکلیف دینا اور انہیں نیچا دکھانا ہی ان کی زندگی کا مقصد ہو گیا تھا اور اتنی بڑی غلطی کے بعد اسلم مرزا کو شامل کیے بنا ایک بار پھر انہوں نے خود ہی شادی اور رشتے کی ذمہ داری اپنے سر لے لی تھی۔

کچھ آس پاس کے لوگوں کی باتیں بھی تھیں کہ اس کا رویہ باپ کے علاوہ سب کے ساتھ تلخ ہوتا گیا۔ جذباتی اور روحی طور پر تو ان سے دور تھی ہی اب جسمانی طور پر بھی وہ فاصلے پر تھی۔ شادی، پھر طلاق، اس کے بعد لوگوں کے رویے اور باتیں، ماں کا رویہ، دوبارہ شادی کی تلوار...... یہ اس کے دکھ، فکر اور کرب تھے جنہیں وہ سب سے دور ہو کر تنہا جھیل رہی تھی۔

☆☆☆

وہ وقت پر پہنچ گئی تھی۔ کچھ دیر بعد ہی مظفر چاچا نے اطلاع دی۔

"سر بلا رہے ہیں۔"

وہ بیگ اور پرس لے کر اٹھی تو انہوں نے بیگ اس کے ہاتھ سے لے لیا۔ دروازے پر پہنچ کر اسے ونڈ چیٹر جیکٹ یاد آیا جو کرسی پر رکھا تھا۔

"اف! پھر بھول رہی تھی۔"

باہر وہ سفید بی ایم ڈبلیو کے پاس کھڑا تھا۔ مظفر چاچا سے بیگ لے کر اس نے پچھلی نشست پر رکھ دیا۔

"پلیز، مجھے آگے بیٹھنا ہے۔" وہ قریب پہنچی تو سلام کے بعد اس نے اگلا دروازہ کھولا۔ وہ شکریہ کہتی اندر بیٹھ گئی۔

اس نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال کر دروازہ بند کیا۔ سدوس نے کھڑکی کا شیشہ نیچے گرا کر مظفر چاچا سے الوداعی کلمات کہے۔

"چلیں؟" فون اور گوگل میپ پر منزل سیٹ کرنے کے بعد انظر نے اس سے اجازت طلب کی۔

"جی۔" اس نے مظفر چاچا کو ہاتھ ہلا کر اللہ حافظ کہا اور شیشہ چڑھا لیا۔ سٹی سے باہر نکلنا ہی مشکل تھا اگر ٹریفک ملتا۔ اسی لیے اس نے جلدی سفر شروع کیا تھا۔ دس منٹ بھی نہیں ہوئے تھے کہ بارش شروع ہو گئی۔ اس نے پرس سے عبدالرزاق گرنہ کے ناول کا ترجمہ 'یادِ مفارقت' نکالا جو کل شروع کیا تھا اور پڑھنے لگی۔ کچھ دیر میں وہ بھول گئی کہ بازو میں کوئی اور بھی ہے۔ اس کی محویت نے انظر کو اسٹیریو لگانے سے باز رکھا۔ پہلو بدلتے اور کبھی ناخن کترتے ہوئے اس نے ناول ختم کرنے کے بعد سر اٹھایا۔ انظر بڑا متاثر ہوا۔

اس نے کتاب واپس رکھی تھی کہ فون بجنے لگا۔ اس نے نکلنے سے پہلے پیغام چھوڑ دیا تھا۔ وہی دیکھ کر اسلم مرزا کال کر رہے تھے۔

"السلام علیکم ابو...... جی ابو نکلے ہیں...... چھ بجے...... جی...... انہیں اورنگ آباد جانا ہے، وہاں سے میں آجاؤں گی۔ نہیں نہیں کسی کو نہ بھیجیں، ویسے ہی وہاں کام بہت ہوں گے۔ جی...... اللہ حافظ۔"

وہ شہر کی حدود سے باہر نکل آئے تھے۔ راستے کے دونوں طرف ہورڈنگز پر مختلف اشتہارات تھے۔ وہ یونہی سب کو بغور دیکھ رہی تھی کہ ایک پر نظر پڑتے ہی اس نے آنکھیں پھاڑ کر اس ہورڈنگ کو گھورا پھر جیسے سلو موشن میں اس کا سر خود بخود انظر کی طرف گھوم گیا۔ اسے بغور دیکھنے کے بعد اس نے پھر ہورڈنگ کو دیکھا جو اب بالکل قریب تھی۔

وہ ریکنگ شو 'آئیڈیا ود میڈیا' کا اشتہار تھا۔ جس کے چار ججز کی تصویر میں ایک ہو بہو انظر جیسی

تھی۔ اس شو میں شرکاء اپنے بزنس آئیڈیاز بزنس پلان کے ساتھ ججز کے سامنے پیش کرتے تھے۔ پریزنٹیشن اور سوال جواب کے بعد اگر وہ قائل ہوتے تو ان کے آئیڈیاز میں انویسٹ کرتے تھے۔ اس نے ہورڈنگ پر نام پڑھنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہی۔ کار تیزی سے آگے بڑھ رہی تھی اور وہ پیچھے رہ گیا تھا۔ اس نے سر پیچھے موڑ کر جہاں تک دیکھ سکتی تھی اسے دیکھا پھر سیدھی ہو کر چور نظروں سے انظر کو گھورا۔

"علیزہ نے بتایا کیوں نہیں؟ اچھا......" اس کے دماغ بتی جلی۔

"اس لیے اس نے کہا تھا نام سے مرعوب مت ہونا۔" اس نے فون نکالا اور گوگل پر اس کا نام سرچ کرنے لگی۔

انظر عرفان، ہائیٹ چھ فٹ دو انچ، باپ کا نام عرفان احمد، ماں کا نام رونق بانو، ایک بہن، تاریخ پیدائش چار فروری انیس سو چھیاسی، تعلیم آئی آئی ایم اندور، پیشہ سی ای او سلیٹ۔ "وہ غیر دلچسپ تفصیل پر سرسری نظر ڈالتے ہوئے آخری لفظ پر ٹھٹک گئی۔

"اوہ!" اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ 'سلیٹ' تو اس کے فون میں بھی تھا۔ یہ نئے لکھنے والوں کی سیلف پبلشنگ سائٹ اور ایپ کا نام تھا جو کئی زبانوں میں تھی۔ ہر طرف اس کی دھوم مچی ہوئی تھی۔ نہ صرف نئے لکھنے والوں اور پڑھنے کے شوقین لوگوں میں بلکہ اسٹارٹ اپس اور بزنس کی دنیا میں بھی۔ اس نے تو شیئر مارکیٹ میں اس کے 'آئی پی او' آنے کی خبر بھی کہیں پڑھی تھی۔

اس نے ریئلٹی شو کے لیے یوٹیوب کا رخ کیا۔ غیر محسوس طور پر وہ دروازے سے لگ کر بیٹھی ہوئی تھی۔ ایک خاتون کے ساتھ تین مرد ججز میں وہ "ینگسٹ" تھا۔

"یہ عجیب منافقت ہے دنیا کی!" اس نے بسورتے ہوئے دل میں سوچا۔ "عورت تیس کی بوڑھی اور مرد چالیس کا بھی ینگسٹ...... ہونہہ......"

وہ خود اور کامیاب اسٹارٹ اپ سی ای او کے طور پر مشہور تھا۔ ویڈیو کے نیچے تبصروں پر نظر ڈالتے ہوئے اسے احساس نہیں تھا کہ اس کے بدلتے تاثرات سے وہ محظوظ ہو رہا ہے۔ وہاں زیادہ تر تبصرے نہیں تھے بلکہ اس کے 'سالٹ اینڈ پیپر لک' پر لڑکیاں فدا ہو رہی تھیں۔ وہ ججز میں سب سے زیادہ مقبول تھا اور وجہ میں کسی قابلیت صلاحیت کا تو ذکر نہیں ملا بس اس کی صورت اور شخصیت کی تعریفیں نظر آ رہی تھیں۔ جانے کتنی دیر بعد اسے احساس ہوا تو وہ فون بند کر کے سیدھی ہوئی اور پھر مشکوک نظروں سے اسے دیکھا۔

"یہ واقعی وہی ہیں؟"

اور جیسے اس نے اس کا خیال سن لیا۔

"میری ہی تصویر تھی......" اس نے ایک ہاتھ اٹھا کر پیچھے اشارہ کیا۔ "وہاں ہورڈنگ پر۔" وہ اسے دیکھ کر مسکرایا۔

"آں...... ہاں......" اس نے سر ہلایا۔

"آپ کو برا تو نہیں لگا میں نے پہچانا نہیں؟" وہ بے ساختہ ہنسنے لگا۔

"بالکل نہیں۔" وہ خجل سی ہو گئی۔

"نہیں...... دراصل میں نے ابھی دیکھا آپ بہت مقبول ہیں تو آپ کو فوراً پہچان لیے جانے کی عادت ہو گی شاید دیکھتے ہی آٹوگراف بھی مانگتے ہوں گے لوگ۔" ایسے زیرک بندے سے کیا چھپانا جو ٹھیک ٹھاک ذہن پڑھ لے۔

"ہاہا...... ایسا بھی نہیں! میں ویسے بھی زیادہ پبلک یا سوشل فگر بننا پسند نہیں کرتا ہوں۔"

"آپ کی فین فالوئنگ تو کافی لگتی ہے۔" وہ کرٹسی سے مسکرایا۔

"ویسے اس سیزن کے بعد میں کانٹریکٹ رینیو نہیں کروں گا۔"

"کیوں؟ آپ بطور جج کافی کامیاب ہیں۔"

"یہ میں نے ایک دوست کے اصرار پر قبول کیا تھا۔ میری دلچسپی بزنس میں ہے ریئلٹی شو بز

ہیں نہیں۔" "مجھے تو کتابوں سے دلچسپی ہے۔"

"اچھا! آپ کو؟" اسے یہ بات اچھی لگی اور اس کا اظہار اس کی آواز سے بھی ہو رہا تھا لیکن وہ جس طرح چپ تھا سدوس نے دلچسپی سے اسے دیکھا۔

"آپ کو کتابوں یا مطالعے میں بھی انٹرسٹ نہیں؟"

"کتاب نان فکشن یا میری فیلڈ یعنی بزنس کی ہو تو شوق سے پڑھتا ہوں لیکن فکشن یا ناولز وغیرہ میں نہیں پڑھتا۔"

"پھر آپ کو 'سلیٹ' کا خیال کیسے آیا؟"

"اس وقت ذہن میں بہت سارے کانسپٹس تھے، مارکیٹ ریسرچ کے بعد لگا 'سلیٹ' کے لیے وقت اور موقع مناسب ہے اس لیے اس پر کام کیا، یہ جذباتی فیصلہ نہیں تھا بلکہ ویل پلانڈ اور سوچا سمجھا بزنس وینچر تھا۔"

"میں بھی ایپ یوز کرتی ہوں۔"

"تھینک یو۔" اس نے مسکراتے ہوئے ایک نگاہ اس پر ڈالی۔

"آپ کا شوق تو نظر آ رہا تھا۔"

"یہ میرا واحد شوق ہے۔"

"ویسے جلد ہم پبلشنگ فیلڈ میں بھی قدم رکھنے والے ہیں، کارڈ کاپی پبلشنگ۔ بچوں کی کامک بکس سے اس کی ابتدا ہو گی۔"

"صرف انگریزی میں یا دیگر زبانوں میں بھی؟"

"ابھی انگریزی، ہندی، مراٹھی اور بنگالی میں ان شاء اللہ اس کے بعد باقی ریجنل لینگویجز کو بھی شامل کریں گے۔"

"اردو لازمی شامل کیجیے گا۔"

"جی ارادہ تو ہے بلکہ......"

تب سے ایک دوسرے سے رخ موڑے اپنے کام سے مطلب رکھنے والے وہ دونوں اپنے پسندیدہ موضوع پر طویل گفتگو میں مگن ہو چکے تھے۔ تسلسل سے چل رہی باتیں اس وقت تھمیں جب انظر کا فون بجا۔ اس نے نام دیکھ کر رنگ خاموش کر دی۔

"میں اٹھا کر کچھ دوں، آپ ڈرائیو کر رہے ہیں؟"

"اس کی ضرورت نہیں۔" وہ مروتاً مسکرایا۔

سدوس نے اسکرین پر جگمگاتے 'ابا کالنگ' کو دیکھا۔ اس کی ٹکٹکی پر انظر بھی متوجہ ہوا۔

فون خاموش ہوتے ہی اس نے نگاہ ہٹائی ہی تھی کہ پھر رنگ ہونے لگی۔ اب کے انظر نے ہاتھ بڑھا کر کال کاٹ دی۔

سدوس کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ ایک اجنبی کی کال پر اس کی اس قدر حساسیت پر وہ متعجب ہوا۔

"آپ سفر میں ہیں تو وہ فکر مند ہو رہے ہوں گے۔" زیادہ دیر صبر نہیں کر سکی تو اس کی سمت چہرہ کر کے گویا ہوئی۔ اس کی شہد رنگ آنکھوں میں ہلکی سی خفگی بھی گھلی تھی۔ "آپ رک کر بات کر لیں۔"

"کیا یہ کوئی یونیورسل لاء ہے کہ ہر فادر چائلڈ کے تعلقات ایک سے ہوتے ہیں؟" سادہ لہجہ تھا لیکن سدوس کو الفاظ کی کاٹ بری طرح محسوس ہوئی۔

"نہیں ایسا کوئی لاء نہیں۔" اس نے جاتی نظر اس پر مرکوز کرتے ہوئے کہا۔ انظر کی نظر راستے پر تھی۔ وہ پھر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔

"میں واقعی اس معاملے میں متعصب ہوں۔"

"اس نے دل میں قبول کیا۔

کچھ وقت بعد انظر نے رفتار کم کی۔

"کافی بریک لیتے ہیں۔" اس نے کار سڑک سے دائیں طرف کچے میدان میں موڑی جہاں ڈھابہ نما ہوٹل تھا۔ یہ کسی بسورتے بچے کے منہ کا زاویہ درست کرنے کے لیے آئس کریم یا چاکلیٹ کے لالچ جیسا اقدام تھا۔

کار سے باہر نکلتے ہوئے اسے اپنے شدید رویے کا ذرا سا افسوس ہوا۔

وہ ضروریات سے فارغ ہو کر آئی تبھی بیرا کافی لے کر آیا۔

مجھ سے پوچھا بھی نہیں چائے چاہیے یا کافی۔ کپ اٹھاتے ہوئے ایک اور شکایت کا اندراج ہوا۔

ڈال دی تھی۔
"زیادہ شور نہیں۔" عائشہ اور عبدالرحمان نانا اور ماموں کے ساتھ اندر آئے تو ابیہ نے ٹوکا۔
"بیٹا انہیں کچھ کھانے کے ساتھ دوائی دے دو فوراً پھر انظر کو دینا۔" عرفان احمد نے کہا۔
"جی ابا۔" انظر نے اس کا پرس اور سفری بیگ ابیہ کو تھمایا۔
"آپ بھی فریش ہو جائیں بھائی، کافی لیں گے یا کھانا؟"
"پہلے کافی، آجاؤ بچو!" وہ انہیں لے کر ہال سے چلا گیا۔ عرفان احمد باہر برآمدے میں چلے گئے۔
"انہوں نے اپنے ابا کو سلام بھی نہیں کیا۔" چادر چہرے پر لیتے ہوئے سدوس نے سوچا۔
ابیہ اسے چائے بسکٹ اور دوائی دے گئی تھی۔ اسے نیند تو نہیں آئی لیکن وہ اوڑھ لپیٹ کر لیٹی رہی تھی۔ ابیہ کے علاوہ پھر کمرے میں کوئی نہیں آیا یہاں تک کہ اسے پسینہ آنے لگا اور وہ چادر ہٹا کر اٹھ بیٹھی۔ کمرے میں کوئی نہیں تھا۔ کھڑی ہوئی تو کھڑکی سے باہر برآمدے میں رکھی میز اور کرسیوں میں ایک پر عرفان احمد کوئی کتاب پڑھتے نظر آئے۔ صاف ستھرا اور ترتیب سے سنوارا گیا کمرہ تھا۔ اس کی توجہ دائیں طرف والی الماری نے کھینچی۔ ایک دیوار کی پوری چوڑائی ایں الماری سے چھپی تھی اور الماری کتابوں سے بھری تھی۔
"وہ کیا کہتے ہیں انگریز، سیب اپنے پیڑ سے زیادہ دور نہیں گرتا!" اس نے مسکراتے ہوئے سوچا۔ تبھی اندر داخل ہوتی عائشہ نے پیچھے مڑ کر پکارا۔
"مما آنٹی جاگ گئی ہیں۔"
اس نے بچی کو سلام کرتے ہوئے جیکٹ اتار کر صوفے پر رکھی۔
"وعلیکم السلام۔" عائشہ کو شاید سلام کے جواب کا موقع شاذ ہی ملتا تھا اس لیے اس نے گردن سیدھی کرتے ہوئے بڑی بردباری سے کہا۔
"کیسی طبیعت ہے اب؟" ابیہ اندر آئی۔ انظر کی شباہت سے اس نے جانا وہ اس کی بہن ہے۔
"ٹھیک ہے۔ بہت شکریہ آپ کا اور پریشان کرنے کے لیے معذرت خواہ ہوں۔"
"کسی شکریہ اور معذرت کی ضرورت نہیں۔" باتوں کی آواز سن کر عرفان احمد بھی ہال میں آگئے۔ انہوں نے بھی ابیہ والا سوال کیا۔
"الحمدللہ انکل بہتر ہوں اب۔" اس نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ عصر کا وقت ہو گیا تھا۔ اس نے نماز پڑھ کر نکلنے کا سوچا۔
"مجھے اب نکلنا چاہیے۔"
"بیٹا پوری ریاست میں بارش ہے، کہیں کہیں تو حالات بہت خراب ہیں، اب شام ہو گئی ہے بسیں ٹرینیں کچھ بھی وقت پر نہیں، جو چل رہی ہیں بھی لیٹ ہیں، کچھ بسیں راستے میں پھنسی ہیں، بہتر ہوگا آپ صبح نکلیں۔"
"جالندھر زیادہ دور نہیں ہے انکل! ایک ڈیڑھ گھنٹے کا ہی سفر ہے۔" اسی وقت انظر اندر آیا۔ اس کا حلیہ بدلا تھا۔ ٹی شرٹ اور پاجامے میں وہ اسے بڑا گھریلو سا لگا۔
"آنٹی جا رہی ہیں۔" عائشہ نے ماموں کے قریب جا کر اس کا ہاتھ تھام کر اطلاع دی۔
"آگے ٹریفک جام ہے۔" اس نے ایک بار پھر فون میں گوگل میپ کا رخ راستہ اس کے سامنے کیا۔ جہاں ٹریفک کی رفتار کے مطابق پہنچنے کا متوقع وقت پانچ گھنٹے درج تھا جو ظاہر ہے اس سے کم ہو سکتا تھا اور اس سے زیادہ بھی۔
"آپ گھر پر بات کر لیں چاہیں تو میں آپ کے والدین سے بات کر لیتا ہوں۔" اور اسے ایک دم یاد آیا۔ اس نے ابو کو اطلاع نہیں دی تھی کہ وہ یہاں پہنچ چکی ہے اور ٹھہری ہے۔
"میرا پرس؟" اس نے ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ ابیہ نے صوفے کے پیچھے سے پرس اٹھا کر اسے دیا۔

"میں ابو سے بات کرتی ہوں۔" اس نے فون نکالتے ہوئے کہا۔ عرفان احمد واپس برآمدے میں چلے گئے، انظر عائشہ کو لے کر اندر چلا گیا، ابیہ بھی پیچھے ہولی۔
چادر اٹھا کر ان کی تین مسڈ کالز دیکھ کر اسے افسوس ہوا اور خود پر غصہ آیا۔
اس کی طبیعت اور آگے کی صورت حال سننے کے بعد انہوں نے بھی اسے رکنے کا مشورہ دیا۔ انہیں بھی ٹریفک کا علم تھا۔ اس وقت گھر سے کسی کا اسے لینے آنا بھی سود مند نہیں تھا۔ انہوں نے اس سے پہلے گھر میں کون کون ہیں ضرور پوچھا تھا۔ وہ فون واپس پرس میں رکھ کر کتابوں کی الماری کی طرف بڑھ رہی تھی کہ ابیہ آئی۔
"کیا کہا انکل نے؟"
"وہ بھی رکنے کا کہہ رہے ہیں۔"
"آئیے آپ کمرے میں فریش ہو جائیں۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔
کمرے میں آ کر اس نے عصر پڑھی۔ باہر جانے کا ارادہ ہی کر رہی تھی کہ ابیہ کھانے کی ٹرے لیے اندر آئی اس کے ساتھ عائشہ بھی تھی۔
"کھانے کا وقت تو نہیں لیکن آپ کو ضرور بھوک لگی ہوگی۔" اسے واقعی بھوک لگی تھی۔
کھانے کے دوران سات سالہ عائشہ اس کا انٹرویو لیتی رہی جس میں نام سے لے کر کیا آپ انکل کی دوست ہیں اور کون سا رنگ اور کون سا کارٹون پسند ہے سب شامل تھا۔
ابیہ سے باتوں کے دوران اسے پتا چلا انظر اسے پہلے ہی فون کر کے ان کی آمد اور اس کی ناساز طبیعت کا بتا چکا تھا۔ کھانے کے بعد جب وہ عائشہ کے اصرار پر ہال میں آئی تو وہاں عبدالرحمان اور انظر پہلے سے موجود تھے قریب ہی عرفان احمد بھی تھے، اپنی کتاب کے ساتھ۔
ابیہ دوسرے شہر میں رہتی تھی۔ شہر میں سسرال عید کر کے اس شام کو میکے کے لیے آئی تھی۔
"انکل اکیلے رہتے ہیں؟"
"جی۔" اس نے مختصر جواب دیا۔
اس نے دور بیٹھے عرفان احمد کو دیکھا جو کتاب پڑھ رہے تھے۔ بچے بار بار انہیں کسی نہ کسی بہانے سے مخاطب کر رہے تھے اور وہ بغیر جھنجھلائے بنا نرمی سے ان کی ہر بات کا جواب دے رہے تھے۔
اس میں ماموں سے پوچھو، انظر اسے سمجھا، جیسے جتلے بھی تھے لیکن وہ انہیں مخاطب کرتا تھا نہ کسی طرح عمل سے ان کی بات سن لینے کی رسید دے رہا تھا۔
مغرب کے بعد عائشہ نے شور مچایا کہ ابیہ حسب وعدہ اسے مہندی لگائے۔ ابیہ نے بتایا عائشہ مہندی کی بے انتہا شوقین ہے۔ بس شادی منگنی یا کسی فنکشن کا ذکر سن لے تو پہلا کام ہاتھوں پیروں پہ مہندی لگانے کا ہوتا تھا۔ اپنی لگ چکنے کے بعد وہ سدوس کے سر ہو گئی کہ آپ بھی لگائیں۔
"آنٹی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"
"ٹھیک تو ہے۔" اس نے سدوس کے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔ "فیور نہیں ہے انہیں۔"
"ٹھنڈ میں مہندی نہیں لگاتے۔"
"لگاتے ہیں، دیکھیں۔" اس نے اپنی ننھی ہتھیلیاں اس کے آگے پھیلائیں۔
"ضد نہیں کرو بیٹا۔"
"آنٹی! آپ کو لگانی ہے نا؟ مما بہت اچھی لگاتی ہیں۔" اب وہ اسے لالچ دے رہی تھی۔
"عائشہ! ایسے ضد نہیں کرتے۔" ابیہ نے سختی سے کہا۔
"آنٹی پلیز۔" اس نے مسکین سی صورت بنا کر کہا اور اسے اس پر بے انتہا پیار آ گیا۔
"اچھا لگا دیں، لیکن بس ایک آدھ بیل سی۔"
"آپ کو زکام نہ ہو جائے پہلے ہی موسم سرد ہے اور بخار بھی۔"
"کوئی بات نہیں ان شاء اللہ کچھ نہیں ہوگا، ہے ناں عائشہ؟"
"اچھا فکر آپ کے گا اور کچھ نہیں ہوگا۔" وہ کھل

غنودگی کو داغ کیے چہرے کے ساتھ وہ اس وقت جیکٹ سے آزاد تھی۔ اس نے آسمانی دوپٹا اپنے گرد لپیٹ رکھا تھا۔ انظر اپنی جگہ سے اٹھا اور دیوار کے قریب جا کر جلتی سگریٹ بجھا کے صحن میں اچھال دی۔

"ارے۔۔۔ کیوں؟"

"آپ کو شاید پسند نہیں۔" وہ وہیں ستون سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔

"پسند ناپسند کی تو کوئی بات نہیں لیکن ہاں یہ کوئی اچھی عادت تو نہیں۔" چند گھنٹوں پہلے غنودگی کے خمار میں کہی اپنی بات اسے یاد نہیں تھی۔

"میں عادی اسموکر نہیں، بس جب بھی یہاں آنا ہو یا یہاں پہنچ جاؤں تو تھوڑا شغل ہو جاتا ہے۔" "کوئی اسموکر قبول نہیں کرتا کہ وہ ایڈیکٹ ہے۔" وہ دھیرے سے ہنس دیا۔

"میں ایڈیکٹ نہیں پھر بھی شغل تو ایڈمٹ کر لیا ہے۔۔۔" اسے ایک دم یاد آیا۔ "آپ نے کھانا نہیں کھایا تھا، بھوک لگی ہوگی۔"

"نہیں۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "لیکن چائے کی طلب ہے۔"

"آپ بیٹھیں، ابھی حاضر کرتا ہوں۔" اس نے کرسی کی طرف اشارہ کیا اور اندر چلا گیا۔

وہ آگے آ کر کرسی پر بیٹھ گئی۔ کچھ ہی وقت بعد وہ گھر پہنچانے والی بس میں سوار ہونے والی تھی اور دانستہ کوشش کر رہی تھی ابھی سے اس بارے میں نہ سوچے۔ ذہن بٹانے کے لیے اس نے چاروں سمت تفصیلی نظر ڈالی۔ پرانی طرز کا مکان تھا لیکن دیکھ بھال اور مناسب رنگ و روغن کی وجہ سے پرانا نہیں لگتا تھا۔ صحن میں خوب قامت اور گھنے پیڑ تھے۔ وہ انہیں پہچاننے کی کوشش کرنے لگی۔ جامن کا پیڑ اسے سمجھ میں نہیں آیا، لیموں کے پیڑ بھی پہچان نہ سکی۔ ان کے علاوہ وہ انار اور نیم کا درخت کی شناخت کر سکی تھی۔

"انظر عرفان کو ٹی وی پر دیکھ کر کوئی سوچ بھی نہیں سکتا کہ اس کا گھر ایسا ہوگا۔" اس نے سوچا۔ "ویسے یہاں ان کے ابا کا گھر ہے۔ وہ تو شاید ان کی طرح ہی عالی شان فلیٹ میں رہتے ہوں گے۔ عالی شان پرسنالٹی ہے؟" اپنے خیال پر اس نے خود سے سوال کیا۔

"ہے تو 'سالٹ اینڈ پیپر پرسنالٹی'!" اپنی ایجاد کردہ اصلاح پر وہ مسکرانے لگی۔

"لیکن اپنے والد سے ان کا رویہ کچھ زیادہ ہی سرد ہے۔" حالاں کہ وہ بتا چکا تھا کہ وہ ماں سے زیادہ قریب تھا، باپ کے ساتھ کچھ 'ایشوز' ہیں پھر بھی ذرا سے وقت میں ہی اسے ان دونوں کے درمیان تکلف بہت محسوس ہوا تھا۔

"کیا میرا اور امی کا تعلق بھی دیکھنے والوں کو ایسا ہی لگتا ہوگا؟" نا چاہتے ہوئے بھی سوچ کا دھارا اس سمت بہہ نکلا۔

"حالاں کہ میں نے تو آج سے پہلے کسی کے سامنے ایشوز کا اعتراف بھی نہیں کیا ہے۔" اس کا دل عادتاً ماں کے خیال سے اداس ہونے لگا۔ وہ کھڑی ہو گئی۔ صحن میں اترنے کے ارادے سے دائیں طرف بنے پانچ زینوں کی طرف بڑھی پھر یاد آیا کہ ابھی ابھی بخار اترا ہے تو پہلے زینے پر ہی بیٹھ گئی۔ کلائی پر بندھی گھڑی میں وقت دیکھا۔ چار بج کر پانچ منٹ ہو رہے تھے۔ تبھی قدموں کی چاپ پر اس نے مڑ کر دیکھا، انظر مگ لیے ادھر آ رہا تھا۔

"میں کافی ایکسپرٹ ہوں، چائے بنانی نہیں آتی پھر بھی کوشش کی ہے۔" ایک مگ اسے تھماتے ہوئے وہ بھی زینے کے دوسرے سرے پر بیٹھ گیا۔

"ایمان داری سے بتایئے گا کتنی بری بنی ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" اس نے مسکرا کر مگ تھاما پھر اس مگ کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"آپ چائے نہیں پیتے؟" تب سے وہ کافی پی رہا تھا اور اسے بھی پلائی تھی۔

"[illegible] میرا پہلا اور آخری پیار کافی ہے۔" سدرہ نے چائے کا پہلا گھونٹ لیا اور حلق سے نیچے اتارنے سے پہلے بے بسی سے انظر کو دیکھا۔

"اتنی بری ہے؟" وہ نتیجے کے لیے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

اس نے اقرار میں سر ہلایا اور جیسے وہ مائع اندر دھکیلا۔

"آپ کو اس وقت کیفین کی طلب ہے۔" انظر نے اس کے ہاتھ سے مگ لے لیا۔ "آپ وہ اس سے پوری کریں۔" اور اپنا کافی بھرا مگ اس کے آگے کیا۔

"نہیں آپ......"

"میں نے بس آپ کا ساتھ دینے کے لیے بنائی تھی۔" اس نے جھوٹ کہا۔ سدرہ نے مگ لے لیا۔

انظر نے چائے کا مگ زینے سے لگی کیاری میں انڈیل دیا۔

"امید ہے چائے ان کا پہلا پیار نہیں ہوگی۔" وہ مگ میں کافی کو دیکھتے ہوئے ہنس دی۔ انظر نے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔

"آپ واقعی ایکسپرٹ ہیں۔" پہلے گھونٹ کے بعد اس نے مان لیا۔

"اسی لیے تو پورے اعتماد سے آپ کو تھمادی، یہ اکیلے رہنے کا فائدہ ہے کہ بندہ کم از کم اپنی پسندیدہ چیز اچھی بنانے لگتا ہے۔"

"اور کیا اچھا بناتے ہیں؟"

"کافی، کافی اور کافی۔"

"مجھے لگا تھا آپ تیسری چیز سگریٹ کہیں گے۔"

"یقین کر لیں پلیز میں عادی اسموکر نہیں ہوں۔" اس نے مشکوک سا تبسم چہرے پر سجا لیا۔

"ویسے ڈرگ اور نشے کے عادی لوگ خود اپنا [illegible]"

"اور میں اسے آپ کی جنرل نالج ہی مان رہی ہوں۔" وہ ہنس دیا۔

چند پل خاموشی باری باری ان دونوں کے چہروں تکتی رہی۔ بالآخر اس کی نظروں سے گھبرا کر سدرہ گویا ہوئی۔

"پتا نہیں مجھے کہنا چاہیے یا نہیں۔۔۔" وہ رک گئی۔ انظر اسے دیکھنے لگا تو اور جز بز ہوئی مگر انظر نے 'ہاں کہیں' جیسا کچھ کہہ کر حوصلہ نہیں دیا بلکہ یونہی نظر جمائے رہا۔

"مجھے آپ کا انکل کے ساتھ سرد رویہ بہت محسوس ہوا۔"

"آپ کو ٹھیک ہی محسوس ہوا۔" سدرہ نے گردن موڑ کر اسے دیکھا اور جانے کیوں اور کیسے اس کی نگاہوں میں شکایت تھی، انظر کا دل اس پل اس شکایت پر مغموم بھی ہوا تھا۔

انظر نے نگاہوں کا زاویہ نہیں بدلا تو وہ دوبارہ مگ کو دیکھنے لگی۔

"ہمارے درمیان گرم جوشی یا بے تکلفی نہیں ہے اور یہ بات دیکھنے والوں کو محسوس ہوتی ہے۔"

"آپ کی بات کا 'ہم دونوں کے درمیان' والا حصہ غلط ہے۔"

"وہ کیسے؟"

"تکلف اور سرد مہری صرف آپ کی جانب سے ہے۔" وہ صرف اپنے ابو کے لیے نہیں بلکہ دنیا کے سارے اباؤں کے لیے حساس تھی۔ انظر نے فوراً کچھ نہیں کہا۔

"انکل خاموشی سے آپ کا خیال رکھتے ہیں، ان کے چہرے، ان کی آنکھوں اور ہر انداز سے آپ کے لیے محبت اور فکر جھلکتی ہے۔"

"درمیان کا کوئی ایک منظر بس لیڈنگ ہو سکتا ہے اس لیے اس کی بنیاد پر پوری کہانی اخذ کرنے کی کوشش خام ہے۔"

"میں کہانی نہیں اخذ کر رہی، صرف اتنا کہہ رہی ہوں، آپ سے جو بھی ایشوز ہوں انکل کی محبت [illegible]

سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ میرے بھی امی کے ساتھ کئی ایشوز ہیں اور سب کا مین ریزن ان کا ابو کے ساتھ رویہ ہے لیکن میں نے ان کی محبت پر بھی شک نہیں کیا۔ مجھے ان سے شکایتیں ہیں، ان کے فیصلوں پر اعتراض تھے، ہیں اور رہیں گے بھی، مجھے ان پر غصہ بھی بہت آتا ہے، میں یہ بھی اعتراف کرتی ہوں کہ مجھے ان کے مقابلے میں ابو سے زیادہ محبت ہے، مجھے ابو کی زیادہ یاد آتی ہے، میں ان کے لیے زیادہ فکر مند رہتی ہوں، میں انہیں زیادہ رعایتیں دیتی ہوں اور بھی بہت کچھ لیکن ان سب کے باوجود میں جانتی مانتی ہوں امی کو مجھ سے محبت ہے، آپ یہ قبول کرتے ہیں؟"

"نہیں۔" وہ نیچے زینے کو دیکھ رہا تھا۔ "میں یہ مانتا اور جانتا ہوں کہ میرے ابا کو محبت کرنا ہی نہیں آتا۔" پیچھے ہال کے دروازے کے قریب کھڑے عرفان احمد واپس پلٹ گئے۔ اپنے کمرے کی کھڑکی سے باپ کو دیکھ رہی ابیہ ان کے جھکے کندھے دیکھ کر آنسو روک نہیں سکی۔

اس کا لہجہ اتنا پریقین اور آواز اتنی راسخ تھی کہ وہ اس کی ذرہ برابر تردید بھی نہ کر سکی۔

"میں نے اپنی ماں کی اداس آنکھیں اور بے رنگ زندگی دیکھی ہے۔ ابا کا مزاج تب بھی ایسا ہی تھا دیکھنے والوں کو لگتا تھا وہ نہایت کیئرنگ اور نرم مزاج ہیں لیکن سچ یہ ہے کہ وہ دل کو محبت سے خالی رکھ کر زندگی کو اس اچھے برتاؤ سے بھرنے کی کوشش کرتے تھے اور میں اس بات کا گواہ ہوں کہ ساری اچھائیاں، نرمی، فکر کوئی خوشی نہیں دیتی اگر ان میں محبت شامل نہ ہو۔ فرائض کی تکمیل جسمانی آسودگی دیتی ہے یا روزمرہ کی روٹین آرام دہ کر دیتی ہے لیکن دل...... انسان کی روح...... اگر یہ تشنہ اور ترستے رہیں تو انسان سانس لیتا ہے جیتا نہیں ہے اور میں نے امی کو جیتے نہیں دیکھا۔" وہ اب بھی سر جھکائے زینے کو دیکھ رہا تھا۔

سدرہ اسے دیکھ اور سن رہی تھی۔ ماں سے اس کی قربت اور محبت ان کی تنہائی اور درد سے جڑی تھی۔

"انکل کے پاس کوئی وجہ ہوگی، ہو سکتا ہے انہیں کسی سے محبت رہی ہو اور وہ اسے بھلا نہ پائے ہوں یا کوئی حادثہ انہیں محبت یا عورت سے ہی متنفر کر گیا ہو اور بھی کوئی ریزن ہو سکتا ہے......"

"جو بھی ہو ایک وفادار، نیک بیوی جس کے ساتھ آپ نے گھر بسایا، فیملی بنائی اسے عمر بھر اپنے لیے اجنبی رکھنا، اس سے ایسا فاصلہ اور رویہ رکھنا کہ آٹھ دس سال کا بچہ بھی اسے غیر فطری محسوس کرے اس بچے اور ماں کے ساتھ ظلم ہے۔" اور اس وقت سدرہ نے جانا وہ اپنے باپ کو وہی سلوک لوٹا رہا تھا جو اس کی ماں سے روا رکھا گیا تھا۔ وہ اسے دیکھتی چپ ہی رہی تو انظر نے سر اٹھایا۔

"میں زیادہ ہی سینٹی مینٹل ہو گیا۔" وہ ہلکے سے مسکرایا۔

"آں...... نہیں تو۔" وہ اپنے خیال سے باہر آئی اور خالی مگ ایک طرف فرش پر رکھا۔ انظر نے اس کے پرسوچ اور سنجیدہ چہرے کو بغور دیکھا۔ اس کی بھوری آنکھوں میں الجھن کے ساتھ کچھ اور بھی تھا جسے محسوس کرتے ہی انظر نے خوشی کو بھی دل میں بڑا سا پلاٹ الاٹ کر دیا۔ ضمیر نے آنکھیں بھی دکھائی کہ وہ اس کی پریشانی کو اپنی خوشی کا سامان کر رہا ہے لیکن کچھ جذبے ساری زندگی 'ٹین ایجر' ہی رہتے ہیں۔

"محبت اتنی پیچیدہ اور دو لوگوں کے لیے اتنی مختلف بھی ہوتی ہے۔"

"یہ سوال ہے، ابھی ابھی ہوئی گفتگو کا خلاصہ یا میرے والدین کی کہانی سے حاصل شدہ نتیجہ؟"

"پتا نہیں کیا ہے۔" اس نے گہری سانس لی۔ اچانک کچھ یاد آنے پر پوری اس کی سمت گھوم گئی۔

"آپ کے اب تک شادی نہ کرنے کی وجہ یہی ہے؟" انظر نے لب بھینچ لیے۔

[illegible]

بارش وقتی تھی یا پھر ابھی ابھی الاٹ ہوئے پلاٹ کی کارستانی۔ مستقبل کا تو کسی کو علم نہیں ہوتا "اب تک......"

"جلدی کریں عمر نکلی جا رہی ہے۔" اس نے ماحول بدلنے کے لیے لہجے کو ذرا شوخ کیا۔

"ہمم۔" اس نے بھی تائید کی۔

"اچھا ہوا آپ کو فیور ہو گیا تھا۔" چند پل بعد انظر نے کہا۔

"اچھا کیسے؟"

"ورنہ آپ مابدولت کی کافی سے محروم رہ جاتیں۔" وہ بے ساختہ ہنس دی۔

"ویسے آپ کی وجہ سے ہی مجھے بخار آیا تھا۔"

"ارے! میری وجہ سے کیسے؟ میں نے تو حفاظت کے لیے آپ کو اس وقت جیکٹ دی تھی جب ہم بالکل اجنبی تھے۔"

"اور آپ نے ہی ڈائننگ ہال میں چھینک چھینک کر مجھے انفیکٹ بھی کیا تھا۔"

"یہ سائنٹفکلی غلط ہے، وائرل انفیکشن کا انکیوبیشن پیریڈ ہی دو سے پانچ دن ہوتا ہے۔"

"یعنی میں کچھ دن کے بعد پھر بیمار پڑوں گی......؟"

"یعنی آپ کو یقین ہے میں نے آپ کو انفیکٹ کیا ہی ہے؟" اس نے جرح کے انداز میں پوچھا۔

"لگتا تو یہی ہے۔" وہ چھیڑنے کے لیے مسکرائی۔

اچانک تیز بارش شروع ہو گئی۔ پانی زینوں پر بھی آنے لگا۔ وہ دونوں تیزی سے کھڑے ہو کر سائبان کے اندر آ گئے۔

"اب فیور آیا تو الزام اس بارش کے سر ہوگا۔" انظر نے کہا۔ بارش کے ساتھ ہوا بھی تیز ہو گئی تھی۔

"نہیں، یہ الزام آپ کے ہی سر رہے گا۔" وہ مگ اٹھانے کے ارادے سے پھر زینے کے قریب گئی مگر اس کا ارادہ بھانپتے ہی انظر نے ہاتھ کے اشارے سے روکا اور خود آگے بڑھ کر دونوں مگ اٹھا لیے۔

"ریسٹ کریں صبح پھر آپ نے سفر کرنا ہے۔"

"جی۔"

وہ اسی کمرے میں چلی آئی جہاں سوئی تھی اور انظر مگ رکھنے باورچی خانے میں چلا گیا۔

☆☆☆

صبح سات بجے وہ جانے کو تیار تھی۔ عرفان احمد نے انظر سے کہا کہ اسے گھر تک چھوڑ آئے اور وہ پہلی بار باپ کا حکم بجا لانے کو دل و جان سے تیار تھا مگر سدرہ نے انکار کر دیا۔ ڈیڑھ گھنٹے میں بس سیدھا اس کے شہر پہنچانے والی تھی۔ وہ بیگ لے کر باہر ہال میں آئی تھی کہ اسے چھینک آئی۔

"آپ نے دوائی لی؟" عرفان احمد نے پوچھا۔

"نہیں۔" وہ منمنائی۔

"لے لیں کہیں پھر بخار نہ آ جائے اور جیکٹ بھی پہنیں، ابیہ لے آؤ بیٹا۔" انہوں نے بیٹی کو دیکھا اور وہ اندر سے کروسین کے ساتھ انظر کا جیکٹ بھی لے آئی۔ وہ جیکٹ کو اسی کی ملکیت سمجھ رہے تھے۔

عرفان احمد نے جب اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر 'سدا خوش رہیں، خیریت سے گھر پہنچیں' کہا تو اس نے دل سے دعا کی کہ باپ بیٹے کے بیچ کی دیوار ڈھے جائے اور وہ اس خوب صورت رشتے کو پوری جزئیات کے ساتھ گلے لگا کر نبھائیں۔

راستے میں انظر نے واپسی کا پوچھا۔ وہ اسی شام یا اگلے دن صبح نکلنے والا تھا اور اسے مزید باپ کے گھر روکنے کے لیے سدرہ نے کہا۔

"سنڈے کل ہے اور فوراً تو نکل نہیں سکتی، پرسوں یا اس کے ایک دن بعد، آپ بھی تب تک رک جائیں تو ساتھ چلتے ہیں۔" "پلیز" تو بڑی دل لبھانے والی تھی مگر پرانی چیزیں، جذبے اور عادتیں زیادہ پختہ، گہری اور پر اثر ہوتی ہیں۔

"خیال تو بہت اچھا ہے لیکن میں اتنا وقت نہیں رک سکتا۔" اس کی نگاہیں سامنے سڑک پر تھیں اور سدوس کا دل اداس ہو گیا۔ جب وہ سامنے دیکھنے لگی تو انظر نے اس کی طرف نظر کی۔

"سوری سدوس!" اس نے دل میں اس سے معذرت کی تھی۔

کار سے اترنے سے پہلے وہ۔ جیکٹ اتارنے لگی تو انظر نے کہا۔

"لے جائیں، بارش نہیں لیکن خنکی تو اب بھی ہے۔"

"نہیں شکریہ اب تو دھوپ نکل آئی ہے۔ انکل اور بھیہ اسے میرا ہی سمجھ رہے تھے اس لیے انکار نہیں کیا تھا۔" وہ بیگ اور پرس لیے نیچے اتر گئی تھی۔

☆☆☆

گھر میں سب ہی اسے دیکھ کر خوش ہوئے تھے۔ جیسی اسے امید تھی گھر مہمانوں سے بھرا تھا۔ خالہ اور ننھیال کے علاوہ دونوں چاچا اور دادا بھی موجود تھے۔ پھوپھو شام تک کسی بھی وقت آنے والی تھیں۔

"اچھا کیا آ گئیں۔" خالہ نے تنہائی ملتے ہی کہا۔

"بہت مشکل سے آئی ہوں خالہ۔ ٹرینیں بند ہیں آپ کو پتا تو ہوگا۔"

"ارے کیا مشکل..... علیزہ نے بتایا تھا تم مونس کے دوست کی گاڑی میں آ رہی ہو۔ وہ تو میں نے منع کیا آپا کو کہ یہاں یہ تفصیل کسی کو بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔" وہ دانت پیس کر رہ گئی۔

ابو گھر کے مرد مہمانوں کے ساتھ میزبانی کے فرائض انجام دینے میں مشغول تھے اس لیے اسے باقی سب کے درمیان بیٹھ کر باتیں نا صرف سننا پڑ رہی تھیں بلکہ باتیں کرنا بھی پڑ رہی تھیں ورنہ وہ دونوں باپ بیٹی اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنا کر بیٹھتے تھے۔ شیراز کی بیوی سوسن امید سے تھی اور اسے بھی

ہی نظریں اس کی کمی جتاتی یا اس کے چہرے پر حسرت تلاش کرتی محسوس ہوئیں۔

ان کے خاندان میں کم عمری میں شادی کا رجحان تھا اس کی عمر کی لڑکیوں کے اچھے خاصے بڑے بچے تھے۔ ایسے میں اس کا توجہ کا مرکز بن جانا فطری تھا۔ رشتے داروں سے ملتے عرشی کی تیاریاں دیکھتے اور کچھ گھر کے کاموں میں ہاتھ بٹاتے وہ دن تو گزر گیا۔ موسم کے پیش نظر اگلے دن رسم ہال میں رکھی گئی تھی۔

☆☆☆

وہ لباس تبدیل کرنے اور بال بنانے کے بعد آئینے کے سامنے کھڑی تھی کہ فون پر روشنی کے ساتھ نام چمکنے لگا اور اس نے پہلی رنگ پر ہی فون ریسیو کر لیا تھا اور اب ہینڈ سیٹ کان تک لے جاتے ہوئے کئی بار پچھتا چکی تھی کہ ایسی بے صبری کا مظاہرہ کیوں کیا۔

"السلام علیکم۔" دوسری طرف کوئی شناسا ہو تو وہ ہمیشہ سلام کرتی تھی۔ اُدھر وہ اپنی بے اختیاری اور جلد بازی پر تذبذب کا شکار تھا۔ جواب دے کر جب اس نے مزید کچھ نہ کہا تو ان چند لمحوں میں سدوس کا دل ڈوبتا ابھرتا رہا۔

"سب ٹھیک ہے؟" اس نے پوچھا مگر لہجہ اللہ کرے سب خیریت ہو اس دعا سا تھا۔

"سدوس!" اس نے بالآخر کہا۔

"جی۔"

"ہم ابھی مل سکتے ہیں؟"

"کہاں؟"

"جہاں آسانی ہو۔" رسم تو شام میں تھی مگر اس وقت گھر مہمانوں سے بھرا تھا ایسے میں گھر سے باہر جانا جوکھم بھرا کام تھا۔

"اگر ممکن نہیں تو کوئی بات......" اس کی سوچتی چپ محسوس کر کے وہ کہنے لگا تھا۔

"نہیں۔" اس نے بات مکمل نہیں ہونے دی۔ "بائی وے پر جو بریک پوائنٹ ہے وہاں کتنی دیر میں پہنچ سکتے ہیں آپ؟" "[illegible]" اس نے

دونوں شہروں کے درمیانی مقام کا نام لیا۔

"نہیں پچیس منٹ۔"

"او کے وہیں ملتے ہیں۔"

"سدوس انظر۔"

"آپ لیٹ کر رہے ہیں۔"

"او کے۔" اس نے فون رکھ دیا۔

وہ اب کمرے میں ہاتھ ملتے ہوئے باہر جانے کا بہانہ سوچ رہی تھی۔ اسے صرف ابو سے کہنا تھا کہ وہ بنا زیادہ سوال جواب کیے بنا اسے جانے دیتے اور پیچھے سب کو بھی سنبھال لیں گے، وہ جانتی تھی لیکن ان سے کہنے کے لیے بھی کوئی معقول بہانہ ضروری تھا۔ ادھر ادھر ٹہلتے ہوئے اس کی نظر پرس سے باہر نکل رہی کی چین پر پڑی اور اسے بہانہ سوجھ گیا۔ اس نے پرس اور فون اٹھایا اور باہر نکل گئی۔

شیراز سے پوچھ کر وہ ابو کے پاس آئی۔

"ابو!" اس نے آواز دے کر انہیں قریب آنے کا اشارہ کیا۔

"کیا بات ہے بیٹا؟"

"ابو! میں بہت اہم چابی غلطی سے اپنے ساتھ لے آئی ہوں، اس کی ضرورت ہے ریزورٹ میں۔ یہاں سے کسی جانے والے کے ساتھ مجھے یہ چابی واپس بھیجنے کو کہا ہے، وہ بندہ ابھی بائی وے والے بریک پوائنٹ پر انتظار کر رہا ہے، میں فوراً دے کر واپس آ جاتی ہوں۔"

"بیٹا کوئی اور دے آئے گا، میں شیراز......"

"نہیں ابو! شیراز کو ڈھیروں کام ہیں یہاں اور کسی اور سے کہا تو خوامخواہ سب کو علم ہوگا اور پھر......" اس نے دانستہ بات ادھوری چھوڑ دی۔

"میں دے آتا ہوں۔"

"نہیں ابو! سب آپ کی غیر موجودگی محسوس کریں گے، آپ کا رہنا لازمی ہے۔"

"اچھا کسی کے ساتھ۔"

"رکشا لے جاتی ہوں اسی سے آ جاؤں گی۔" [illegible]

"اچھا ٹھیک ہے۔ سنبھل کے جاؤ اور سنبھل کے آؤ۔"

"جی ابو۔"

بھرے پورے گھر سے چپکے سے کھسکنا آسان نہیں تھا مگر کسی طرح وہ باہر نکل گئی۔ کسی نے دیکھا بھی ہو تو اسے پروا کہاں تھی۔ ابو نے کہہ دیا تھا اس کے لیے کافی تھا۔

وہ پہلے پہنچ گئی تھی اور بے چینی سے آنے والے راستے پر نظر جمائے کھڑی تھی کہ اچانک جھوٹ کہہ کر وہاں پہنچنے پر کہیں سے 'کیوں' کی سرگوشی ابھری اور وہ تھم گئی کہ جواب میں اس کے اندر بڑی معنی خیز خاموشی پھیل گئی۔

کچھ دیر بعد قریب سے ابھرے ہارن پر وہ چونکی۔ سامنے انظر کی سفید بی ایم ڈبلیو کھڑی تھی۔ وہ ڈرائیونگ سیٹ پر ہی تھا۔ آگے بڑھ کر دروازہ کھول کر وہ اس کے بازو والی نشست پر بیٹھ گئی۔ وہ سلام کرنے جا رہی تھی کہ اس کا چہرہ دیکھ کر الفاظ بھول گئی۔

"کیا ہوا انظر؟" اس کی آواز میں تشویش ہی نہیں کوئی انجانا سا خوف بھی تھا۔

"پہلے کار کسی مناسب جگہ پارک کر لوں۔" اس نے کار سڑک پر لے جاتے ہوئے کہا۔ کچھ منٹ بعد سڑک سے نیچے اتار کر ایک کھلی جگہ اس نے کار روک دی۔

"اب کچھ کہیں بھی، مجھے گھبراہٹ ہو رہی ہے۔" وہ دونوں ہاتھوں سے اسٹیرنگ وہیل تھامے بیٹھا رہا تو اس نے کہا۔

"مجھے بھیہ نے بہت اصرار کر کے بلایا تھا کہ بابا کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اور اسے بھی مجھ سے کچھ ضروری کام ہے۔ اس کی جذباتی بلیک میلنگ کے آگے میں ہمیشہ ہار جاتا ہوں۔ مجھے بھی لگا تھا ہر بار کی طرح مجھے بلانے کے لیے ابا نے بھیہ کو استعمال کیا ہے لیکن اس دفعہ بھیہ نے مجھے عمر بھر کا پچھتاوا دینے اور اپنی زندگی کے جھوٹ سے روبرو کرانے

بلایا تھا۔"

اسے کوئی سرا نہیں مل رہا تھا لیکن وہ تحمل سے سن رہی تھی۔ انظر اب بھی سامنے دیکھ رہا تھا۔

"سدوس! ہمارے والدین یا والدین میں ہمارا فیورٹ اس رتبے کے علاوہ ایک فرد بھی ہوتا ہے، خامیوں، کمیوں، برائیوں سے بھرا، منفی جذبات اور احساسات سے لڑتا، ہارتا انسان جو ہم دیکھنا نہیں چاہتے۔ ہم اسے اتنی اونچی مسند کا وارث بنا دیتے ہیں کہ ہماری اپنی ہی نظر وہاں تک پہنچ نہیں پاتی۔ تم نے اس دن سچ کہا تھا انہیں کسی سے محبت ہوئی اور وہ اسے بھلا نہیں پائے ہوں مگر یہ آدھا سچ تھا۔" اس نے چہرہ موڑ کر اسے دیکھا۔

"ایسی محبت امی کو تھی۔" "ساری عمر جس بت کو پوجا تھا اسی بت کی کرچیاں اس وقت انظر کی آنکھوں کو لہولہان کر رہی تھیں۔ اس نے اسٹیرنگ وہیل چھوڑ کر نشست سے پیٹھ ٹکائی اور کچھ پل کے توقف کے بعد اس نے کہنا شروع کیا۔

"ابا نانا جان کے بھتیجے تھے، یتیم بھی اور ان کے چہیتے بھی۔ امی اپنے کالج میں کسی کو پسند کرتی تھیں۔ ان کی خواہش پر نانا جان اس سے ملے اور اسے رجیکٹ کر کے ابا سے ان کی شادی کر دی۔ نانا جان نے بیٹی کی خوشیوں کا وعدہ لیا اور ابا نانا جان کے اتنے احسان مند اور قرض دار تھے کہ کوئی سوچ نہیں سکتا انہوں نے وہ کر دکھایا۔ ابا انہیں پسند کرتے تھے وہ اس سے واقف تھیں۔ شادی ہوگئی، امی اسے بھولیں نہیں نہ ابا کو قبول کیا بلکہ ابا کو ان کی محبت کا واسطہ دے کر ان کی اس محبت کو سمجھنے کو کہا۔ میں جس تنہائی اور اداسی کی وجہ ابا کو سمجھتا رہا وہ امی کا اپنا انتخاب تھی۔ ابا نے امی سے محبت کی اور پھر عمر بھر ان کی جائز ناجائز ہر خواہش کا احترام کیا۔" اس نے آگے جھک کر گلو باکس کھول کر وہی ڈائری نکالی۔

"اس میں درج الفاظ پڑھ کر۔۔۔" اس نے ڈائری سامنے کی۔

"میں بہت شرمندہ ہوں۔۔۔ میری کوتاہ [illegible]

تھی۔ ابا نے امی کو محبت نہیں دی، امی ترستی رہیں لیکن۔ کہانی اتنی سیدھی بھی نہیں۔ وہ دونوں اپنی اپنی جگہ اپنے طریقے سے محبت کر رہے تھے، محبت نبھا رہے تھے، نیک اور وفادار کون تھا۔ کون غلط تھا اور کون بہت غلط، اس کا حاصل کیا رہا، کسے کیا ملا، یہ سوال اب بھی تشنہ ہے۔" اس نے ڈائری والا ہاتھ نیچے کیا۔

"مگر یہ کہانی تھی تب تو ٹھیک تھا، اصل المیہ اس کے آگے ہے۔" اس نے گہری سانس لے کر اسے دیکھا۔

"یہ ڈائری انیسہ کو امی کے انتقال کے بعد ملی تھی۔ اتنے سال اس نے یہ چھپائے رکھی لیکن اب ابا کی گرتی صحت اور میرے رویے نے اسے مجبور کیا کہ وہ یہ تلخ حقیقت مجھ تک پہنچا دے، شاید بیٹیوں کے دل باپ کے لیے بنائے ہی نرم گئے ہیں۔ اسے یہاں تک پڑھنے کے بعد بھی ابا کے متعلق میری رائے بدلی نہیں تھی لیکن اس کے آگے محبت کے دو روپ ہیں۔ ایک انتقام اور دوسرے کو صرف تکلیف دینے والا، اسے روند کر توڑ کر زندہ لاش بنانے والا اور دوسرا محبوب کی خواہش اور خوشی پوری کرنے والا، اس کے لیے جیتی جاگتی پھرتی لاش بن جانے والا۔۔۔" اس نے رک کر گہری سانس لی۔

"میری پیدائش کے بعد مجھے دیکھ کر ابا کے چہرے پر بکھری خوشی اور محبت نے امی کے اندر انتقام اور جلن کی آگ لگائی تھی۔ وہ خوش نہیں تھیں تو ابا کو بھی کسی حال میں خوش رہنے کا حق نہیں تھا۔ ان کے دل میں یہ مقام کسی اور کا تھا لیکن زندگی نے یہاں ابا کو لا کھڑا کیا تھا، وہ انہیں اس مقام پر نہیں دیکھنا چاہتی تھیں۔ ان کی نفرت پہلے اتنی شدید نہیں تھی جتنی میری پیدائش کے بعد ان کے الفاظ سے محسوس ہوئی۔ انہوں نے ابا کے چہرے سے یہ خوشی اور محبت چھیننے کے لیے پورے منصوبے کے ساتھ مجھے استعمال کیا تھا، شروع سے آخر تک۔ میری سوچ اور ذہن نے ان کی اداسی اور ابا کے رویے کے معنی خود [illegible]

کچھ الٹ پلٹ کرتے ہوئے وہ کم سنی سے ہی ان کے ہاتھ تھام کر انہیں اس راستے پر لے آئی تھیں جہاں ابا کچھ بھی نہ تھے۔ انہوں نے کسی سے پوچھے اور بتائے بنا برتھ سرٹیفکیٹ فارم پر میرا نام لکھ دیا تھا کہ ایک بار سسٹم میں رجسٹر ہونے کے بعد تبدیل کرنا نہایت مشکل ہوتا ہے۔ عقیقے کے دن جب سب نام تجویز کرنے لگے تب انہوں نے کہا میرا نام انظر ہے، انظر جو۔۔۔" اس کی آواز اور آنکھیں بھیگ گئیں تو وہ رکا۔

"ایک منٹ۔" جب ضبط نہیں کر سکا تو ڈائری پیچھے ڈال کر دروازہ کھول کر باہر نکلا اور کچھ قدم آگے جا کر رک گیا۔ اس کی پشت کار کی طرف تھی۔ اس کے نام کا یہ منظر اسے بھی کچھ دیر کے لیے ساکت کر گیا تھا۔ سدوس بھی باہر آگئی۔ اس کی طرف قدم بڑھائے اور پھر رک گئی۔ کوئی تعلق، کوئی حق نہیں تھا جو اسے اس روتے شخص کے آنسو پونچھنے، اسے گلے لگانے یا پشت پر ہاتھ رکھ کر تسلی دینے بھر کی اجازت دیتا تھا۔ خواہش کی شدت اور تڑپ پر اس کی اپنی طے کردہ حد غالب آگئی۔ کچھ سرحدیں پار کرنے کے لیے صرف احساس کافی نہیں ہوتا ہے۔ وہ الٹے قدموں سے پیچھے ہٹی اور کار سے ٹکرا کر رک گئی۔ وہ اس کی طرف پیٹھ کیے اور وہ اس کی پیٹھ کو دیکھتے ہوئے رو رہی تھی کہ آنسوؤں میں شریک ہونے کے لیے کسی اجازت کی ضرورت ہوتی ہے نہ تعلق کی، ہاں یہاں احساس کافی ہوتا ہے۔

اس کی تسلیم شدہ کہانی ہی غلط نہیں تھی بلکہ اس کا کردار بھی کچھ یکسر ثابت ہوا تھا اور نام تو یہ کیسا انتقام اور غصہ تھا، کیسی محبت جس کے فراق نے اولاد کو بھی نہیں چھوڑا۔ محبت اور جنگ میں سب جائز والے مقولے پر محبوب اور بیوی تو عمل کر سکتی ہے لیکن کیا ماں بھی؟

کچھ دیر بعد وہ سنبھل کر پلٹا اور اسے پیچھے دیکھ کر چونک گیا پھر سست سے قدم اٹھا کر اس کے [illegible]

کر چکی تھی۔

"سوری! میں یہ سب تمہیں سنا کر اداس کر رہا ہوں۔ مجھے اس وقت کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ ابا کا سامنا کرنے کی ہمت بھی نہ تھی، اس لیے گھر جانے کے بجائے ادھر چلا آیا۔"

"آپ گھر سے کب آئے؟" اس کی آواز بھی بھاری ہو چکی تھی۔

"نہیں، کار ایک جگہ پارک کر کے پڑھ رہا تھا، پھر بہت دیر وہیں رکا رہا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، کچھ سوچ پاتا یا فیصلہ کرتا اس سے پہلے تمہیں فون لگا چکا تھا۔" اس نے اب غور کیا کہ اس کا تخاطب بدل گیا تھا۔

"[illegible]"

"سچ ڈھیلے ہوتا ہے ہمیشہ کے لیے تھا نہیں، اس سے بھاگا نہیں جا سکتا، اسے فیس کرنا ہی پڑتا ہے۔ اندر آؤ، دھوپ ہے۔" اس نے دوسری طرف جا کر اس کی نشست کا دروازہ کھولا۔ اس کے بیٹھنے کے بعد وہ خود بھی اندر آیا۔

سدوس نے مڑ کر ڈائری کو دیکھا پھر انظر کو وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

"سچ یا غلط کا فیصلہ تو آسان ہے لیکن یہ اتنی بلیک اینڈ وائٹ سچویشن نہیں ہے۔ ان سب کا ذمہ دار کون تھا، صرف امی یا نانا جان اور ابا بھی، کسے رویہ بدلنے کی ضرورت تھی، کس کی سوچ غلط تھی، کسے سخت ہونے کی، کسے نرمی برتنے کی، کب سخت ایکشن ناگزیر تھا، کہاں سہولت دینا چاہیے تھی یا راستہ ہی بدل لینا چاہیے تھا، ایسے کئی سوال ہیں جن کے جواب اب ڈھونڈنا مشکل ہے اور فضول بھی۔"

سدوس اس کی ایک ایک اختیاری اور بے اختیاری حرکت محسوس کر رہی تھی جن میں بے قراری تھی، اس کے الفاظ اور آواز میں جذبات کا بہاؤ سب اس پر یوں اثر کر رہا تھا جیسے وہ اس کا درد کھینچ رہا ہو۔

"اگر یہ امی کی رائٹنگ، ان کے الفاظ نہ ہوتے تو دنیا کی کوئی طاقت مجھے اس کا یقین نہیں دلا سکتی

تھی۔ اس وقت میری سمجھ میں نہیں آ رہا مجھے ان کی سوچ اور عمل پر دکھ اور حیرت زیادہ ہے یا ابا کے لیے اپنی سوچ اور رویے پر۔ اس ڈائری کے لکھتے ہی جملے مجھے کتنی بار مار گئے مگر اب جب مجھے ابا کے لیے اپنے خیالات یاد آ رہے ہیں تو میں واقعی شرمندگی سے مر جانا چاہتا ہوں۔ امی پر میرا مان ٹوٹا ہے اور ابا..... میں تو ہر پل، ہر لمحہ انہیں توڑتا رہا شعوری کوشش سے بھی اور اپنی موجودگی، اپنے نام سے بھی۔ میرا ہونا ہی ان کے لیے کتنا بڑا امتحان ہے پھر بھی وہ میرے ساتھ......" ایک بار پھر اس کی سرخ آنکھیں نم ہو گئیں اور آنسو سدوس کی آنکھوں سے گرے۔ کتنے لمحے چپ چاپ سرک گئے۔

"ایک ماں نے یہ کیسا ستم کیا تھا، کبھی نہ بھولنے اور مٹنے والا، ہمیشہ سزا اور درد کا سایہ بن کے ساتھ چلنے والا...... کاش! ان کے ساتھ یہ ڈائری بھی مر جاتی دفن ہو جاتی لیکن پھر انکل اور انظر......" اس کی سوچیں بھی بھٹک رہی تھیں۔

"سوری!" انظر نے مڑ کر اسے دیکھا۔ "میں تمہیں یہاں۔"

"نہیں۔" اس نے تیزی سے کہا اور چہرہ صاف کیا۔ "مجھے اچھا لگا کہ آپ نے مجھ سے شیئر کیا۔" انظر نے نظریں ہٹائیں لیکن کہا کچھ نہیں۔

"اب آپ کیا کریں گے میرا مطلب ہے انکل۔ ان کے ساتھ آپ" اپنی بات مناسب انداز میں کیسے کہے اسے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اس کی دعا اس طرح قبول ہوگی یہ تو وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔

"مجھے تو ان سے بے حساب معافیاں مانگنا چاہیے لیکن سچ کہوں تو اس وقت میرا دل کر رہا ہے میں کہیں غائب ہو جاؤں، کبھی ان کا سامنا نہ کروں۔" وہ جیسے ایک دم بہت تھک سا گیا تھا۔

"آپ کو ان کے پاس جانے میں دیر نہیں کرنا چاہیے۔ اب تو آپ ان کا صبر جانتے ہیں، انہیں انتظار بھی ہوگا کہ کبھی تو ان کی ریاضت ثمر آب ہوگی، انہیں اور منتظر نہ رکھیں۔"

"اچھا ہوا امی نہیں ہیں۔" "دنیا میں اپنی سب سے عزیز ہستی کے لیے یہ الفاظ کہتے ہوئے انظر کیسا محسوس کرتا اپنے آپ میں کیسی اذیت ناک سزا ہے کوئی اس سے پوچھتا۔

"کیا محبت ایسی ہوتی ہے سب کو اضطراب اور کرب دینے والی؟ یہ پیچیدہ جذبے، الجھے تعلقات کے سوا کچھ نہیں اور عمر بھر بھٹکتا مسافر کا مقدر بھی۔" آج سے پہلے اس نے محبت اور اس کے فلسفے پر کبھی غور نہیں کیا تھا اور پہلی بار سوچا بھی تو وہ کوئی اچھا خیال نہیں تھا۔

تبھی سدوس کے فون کی رنگ ہونے لگی۔ اس نے پرس سے فون نکالا۔ فضیلت کی کال تھی۔ اس نے موبائل سائلنٹ کر کے فون رکھ دیا۔ انظر کو پھر پچھتاوے نے گھیرا۔ کتنی بار اس نے بھی یہی کیا تھا۔ کاش اوقت واپس آ سکتا۔

"میں تمہیں گھر ڈراپ کر دیتا ہوں۔" اسے یاد آیا آج اس کی بہن کی منگنی تھی۔

"آپ اسی پوائنٹ تک چھوڑ دیں جہاں میں ویٹ کر رہی تھی۔ مہمانوں کے بیچ اس وقت میں کسی اجنبی کے ساتھ کار سے پہنچی تو یہ مقامی اخبار کی زینت بننے والا اسکینڈل ہوگا۔"

"میں اجنبی تو نہیں۔"

"وہاں سب کے لیے تو ہیں۔"

انظر نے چابی گھما کر انجن کو جگایا۔

"سوری میں اتنا ہی وقت دے سکی، اگر گھر میں فنکشن نہ ہوتا تو مزید رکتی۔"

"تم آنے کی پابند نہیں تھیں سدوس۔" وہ سڑک پر دیکھ رہا تھا۔ "تمہارا آنا اور سننا اس سارے واقعے کی واحد اچھی بات ہے۔" جیسے ماہر انگلیاں رباب کے تار چھوتے ہی مدھر سی دھن بکھیر دیتی ہیں وہی کام اس کے الفاظ نے کیا تھا بس رباب یہاں سدوس کا دل تھا۔ وہ چپ رہی تو انظر نے گردن موڑ کر دیکھا۔ وہ گود میں رکھے پرس کو دیکھ رہی تھی۔ چند منٹ بعد مطلوبہ [illegible] پہنچ [illegible] خاموش [illegible]

کار پارک کر کے وہ بھی باہر نکلا۔

"کہیں جانا ہے؟"

"نہیں، رکشا ہے۔" "پیچھے دو تین رکشا کھڑے ہیں۔"

"واپسی کا ڈیپارچر کیا؟" انظر نے پوچھا۔

"کل یا پرسوں ان شاء اللہ۔"

"میں نے آج واپسی کا سوچ لیا تھا لیکن اب نہیں جا پاؤں گا پھر بھی نکلنے سے پہلے ایک ٹیکسٹ کر دینا۔"

اس نے سر ہلایا۔ ایک بار پھر فون کی رنگ ہونے لگی۔ اس نے فون دیکھا نہ باہر نکالا۔

"میں چلتی ہوں اب۔" وہ رکشا کی طرف بڑھی پھر رک کر پلٹی۔

"انظر!" وہ ذرا ٹھہری۔

"مجھے آپ کا نام پسند ہے، یہ آپ کی شخصیت کو سوٹ کرتا ہے، اگر مجھے موقع ملا تو اپنے بہن بھائیوں کے بچوں میں کسی کا نام ضرور رکھنا چاہوں گی تا کہ وہ بھی ایک حساس اور محبت کرنے والا انسان بنے۔"

وہ اس سے کئی قدم کے فاصلے پر تھی۔

"ٹھیک ہے۔" کچھ توقف کے بعد انظر نے کہا تو آواز میں ارتعاش تھا۔

پھر وہ رکشا میں بیٹھ کر روانہ ہو گئی۔ انظر رکشا کے اوجھل ہونے تک وہیں رکا رہا تھا۔

گھر پہنچی تو گیٹ سے اندر جاتے ہی فضیلت سے سامنا ہو گیا۔

"حد کرتی ہو تم سدوس۔ یہ کوئی وقت تھا باہر جانے کا؟ تمہارا جانا ضروری بھی نہیں تھا کسی کے بھی ہاتھ بھجوا سکتی تھیں، آنکھوں کو کیا ہوا تمہاری؟"

"راستے میں بہت گرد اڑ رہی تھی، سارا راستہ آنکھوں سے پانی بہتا رہا ہے۔" حالاں کہ اسی قسم کے سوال سے بچنے کے لیے ایک جگہ رک کر پانی کی بوتل خرید کر اس نے منہ دھویا تھا۔

"عرشی کے کمرے میں روز واٹر ہوگا وہ ڈالو [illegible] کی تیاری کرو۔"

مصروف تھیں اس لیے اس کی جلد خلاصی ہو گئی۔

لڑکے والے دوسرے شہر سے تھے۔ وہ تقریباً پچاس ساٹھ افراد تھے اور ان کے آنے کے بعد رسم سے پہلے ان کی خاطر تواضع میں ہی بہت وقت لگ گیا۔ پھر رسم ہوئی۔ اس کے بعد کھانا۔ وہ بھی سب کے ساتھ کاموں میں لگی تھی۔ کانوں میں گاہے گاہے دل چیرتے جملے پڑ رہے تھے۔

"یہ ہی ہے بڑی والی۔"

"وہی جو ایک رات بعد ہی طلاق لے کر گھر آ گئی تھی۔"

"نوکری کرتی ہے، کسی ہوٹل میں منیجر ہے۔" یہ ایسے کہا جاتا جیسے اس سے گھٹیا ملازمت اور کوئی ہو ہی نہیں سکتی۔

"کچھ تو ہوگا ورنہ ایک رات میں لڑکا طلاق کیوں دیتا اور پھر کہیں دوسری شادی بھی نہیں ہوئی اب تک۔"

"خود سر اور ضدی ہے۔ سب کی مرضی کے خلاف نوکری کر رہی ہے۔"

"ایسی لڑکیوں کو تو آزادی ہی چاہیے ہوتی ہے۔"

"باپ کو مٹھی میں کر رکھا ہے۔ ماں اور بہن بھائی کو تو پیر کی جوتی سمجھتی ہے۔"

یہ پہلی بار نہیں تھا۔ شیراز کی منگنی اور پھر شادی کے دوران وہ سارا وقت روتی رہی تھی۔ ایسا نہیں تھا کہ اس نے یہ سب پہلی دفعہ سنا تھا۔ وہ سنتی رہتی تھی لیکن اس تواتر سے اور ان لوگوں کے منہ سے جن کے متعلق اسے گمان تک نہیں تھا یہ سب سننا ایک الگ تجربہ تھا۔ اس بار اس کا اپنا ذہن بٹا ہوا تھا۔ دھیان بھٹک بھٹک کر انظر اور اس کے ابا کی طرف جا رہا تھا۔

جانے وہ گھر گیا بھی یا نہیں، انکل سے بات کی یا نہیں، کیا کہا ہوگا، اپنی ماں کا اصل چہرہ کیسے قبول کر پائے گا، یا اسے بھول جانے کی کوشش کرے گا۔ اس کی فکر نے وقتی طور پر اسے اپنے مسئلے، لوگوں کی

نظروں اور لفظوں سے بے نیاز کر دیا تھا۔

☆☆☆

وہ ڈائری ہاتھ میں لیے کچھ دیر اسے دیکھتا رہا پھر اسے گلوباکس میں بند کر دیا۔ اب بھی اس کے اندر کوئی اسے اکسا رہا تھا کہ بھاگ جاؤ یہاں سے، لوٹ جاؤ مگر وہ اپنے باپ کی سزا ابھی ختم کرنا چاہتا تھا۔ بنا ملے چلے جانے کا فیصلہ ماں کی طرح بے حسی، خود غرضی اور صرف اپنے جذبات کو اہمیت دینے والی فطرت کا عکاس تھا اور ایک دن میں وہ کایا پلٹ ہوئی تھی کہ اب اسے یقین تھا اس کی فطرت باپ پر گئی۔

اس نے آواز کیے بنا کار کا دروازہ بند کیا اور چھوٹا گیٹ کھول کر اندر آیا۔ کار بھی اس نے باہر کھڑی کی تھی۔ زینے چڑھتے ہوئے ہی اسے ہال میں صوفے پر اخبار پڑھتے عرفان احمد نظر آ گئے تھے۔ عام طور پر وہ ان کی موجودگی میں ہال میں آتا ہی نہیں تھا۔ اس کے قدموں کی چاپ پر انہوں نے سر اٹھا کر دیکھا۔

"کہاں چلے گئے تھے صبح صبح؟ اور اتنی دیر سے واپس آئے ہو۔" انہوں نے اخبار سے نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔

وہ 'یونہی تھا، ایسے ہی، کہیں نہیں' جیسے مبہم جواب دے کر گزر جانے والا آج صوفے کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ انہوں نے چونک کر بغور اسے دیکھا اور پھر اخبار بند کر کے اپنے بازو میں رکھ لیا۔

"سب خیریت ہے؟" یہ فکر مندی پرانی تھی، نیا انظر کا رد عمل تھا۔ وہ سر جھکائے ہمت مجتمع کر رہا تھا۔ کتنے ہی پل گزر گئے اس کے منہ سے کوشش کے باوجود ایک لفظ بھی نہیں نکلا، وہ عام سا سوری بھی نہیں کہہ پایا تھا۔

"کیا ہوا ہے انظر؟" ابیہہ جو ہال میں آ رہی تھی واپس پلٹ گئی۔ انظر اٹھ کر قالین پر ان کے پیروں کے پاس بیٹھا اور ان کے گھٹنوں پر سر ٹکا دیا۔

"انظر...... انظر......" کچھ محسوس کرتے ہی انہوں نے اسے اٹھانا چاہا لیکن ان کی زبان سے ادا ہونے والا اس کا نام اس کے دل میں تیر کی طرح پیوست ہو رہا تھا۔ یہ اذیت اسے اقبال جرم کے بوجھ تلے دبائے ہوئے سزا کو گلے لگانے والے مجرم سی تسکین دے رہی تھی۔ جب وہ ہلا بھی نہیں تو وہ خود فرش پر بیٹھ گئے اور اسے شانوں سے تھاما۔

"تم بتانا نہیں چاہتے تو نہ کہو لیکن بیٹا اس طرح نہ کرو۔ تم تو میرا سہارا میرا غرور ہو۔" وہ ان سے لپٹ گیا۔

"مجھے معاف کر دیں ابا......" اس نے بمشکل اپنی آواز اور لہجہ سنبھالا ہوا تھا۔ "میں نے ہمیشہ آپ کو غلط سمجھا، آپ کے متعلق ہمیشہ غلط سوچا، میں اپنی ساری غلطیوں کا اعتراف کرتا ہوں، میں شرمندہ ہوں، آپ سے نظریں نہیں ملا سکتا، میں جانتا ہوں آپ مجھے معاف کر دیں گے لیکن میں خود کو......" وہ اڑتالیس کا نوجوان پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا تھا۔

"نہیں بیٹا......" انہوں نے اپنے لرزتے ہاتھ اس کے گرد پھیلا کر اسے خود سے قریب کیا۔ ان پر وہ لمحہ گزر رہا تھا جس کی آس میں انہوں نے پرخار تپتے صحرا کو حلق میں کانٹے اگاتی پیاس کے ساتھ عبور کیا تھا۔ بس ایک لمحے کی آس جس میں وہ سرخرو ہوں گے، جس میں ان کے نام بھی کوئی بے غرض جذبہ ہوگا، ان کی محبت پر کسی کو یقین آئے گا، ان کی قربانیاں کوئی سمجھ سکے گا۔

"معافی کس بات کی، میں کبھی تم سے ناراض نہیں رہا، تم نے کچھ غلط نہیں کیا۔" وہ جانے کس مٹی سے بنے تھے کہ انہیں محبت کے علاوہ کچھ اور نہیں آتا تھا۔ وہ بہت دیر تک روتا رہا انہوں نے بھی اسے چپ کرانے کی کوشش نہیں کی۔

اس نے انہیں بتایا کہ اسے روتی کی ڈائری ملی تھی جس میں انہوں نے اپنا دل کھول رکھا تھا، جوان کی وارفتگی، اس نے ابیہہ کا ذکر نہیں کیا تھا۔ انہوں نے روتی کے متعلق ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ بس اس کا شانہ تھپتھپایا تھا۔ اس عمر میں بیٹے سے جوانی اور محبت کے قصوں پر کلام کرنا آسان نہیں ہوتا۔

"وہ سب اب قصہ [illegible] ب تم [illegible]

انہوں نے کہا۔

کچھ وقت بعد ان کے پاس سے اٹھ کر ابیہہ کے کمرے میں آیا۔ بچوں کو اس نے انظر کے کمرے میں ٹی وی لگا کر بٹھایا تھا۔ وہ کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی۔ دروازہ کھلنے کی آواز پر پلٹی۔ وہ کھڑکی کے قریب آیا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ انظر نے اسے شانوں سے تھاما۔

"تھینک یو۔" اس نے کہا اور ابیہہ بھائی کے شانے سے لگ کر رونے لگی۔ ماں کے اس روپ کے بارے میں بات کرنا ان کے لیے ناممکن سا تھا۔ وہ دونوں اس پل الفاظ کے بغیر گفتگو کا ہنر سیکھ گئے تھے۔

☆☆☆

منگنی والی رات تو سب اتنے تھکے تھے کہ اگلی صبح گیارہ بجے سے پہلے کوئی نہیں جاگا۔ دونوں چاچا اور دادا ناشتے کے بعد چلے گئے جبکہ ماموں اور تائی لوگ پچھلی شب ہی چلے گئے تھے۔ اسے اس طرح علیزہ کے ذریعے بلانے کی وجہ اس وقت سمجھ آئی جب پھوپھو نے آ کر اسے تیار ہونے کا کہا کہ کچھ لوگ اسے دیکھنے آ رہے تھے۔ ان کی جگہ امی یا خالہ ہوتیں تو وہ صاف انکار کر دیتی تھی لیکن ایسا پھوپھو کے ساتھ کرنا ناممکن تھا اسی وجہ سے انہیں یہ ذمہ داری دی گئی تھی۔

وہ کپڑے تبدیل کر کے یونہی بیٹھی تھی کہ عرشی اپنا سازوسامان لیے کمرے میں آ گئی۔

"پھوپھو نے کہا ہے آپ کا میک اپ کر دوں۔"

"اس سے کیا میری عمر کم ہوگی، یا میں بے انتہا حسین لگنے لگوں گی اور تم سب لوگوں کو اتنا بے وقوف اور اندھا کیوں سمجھتے ہو کہ انہیں سمجھ میں ہی نہیں آئے گا کہ میں نے کتنے کلو میک اپ تھوپا ہے؟" اس کولہ باری پر عرشی نے آنکھیں پوری کھول کر کچھ دیر اسے گھورا پھر ہاتھ میں پکڑا باکس پلنگ پر رکھا اور کمر پر ہاتھ رکھ کر اس کے سامنے تن کر کھڑی ہوئی۔

"پہلی بات آپ بنا میک اپ کے ہی بڑی خوبصورت ہیں دوسری بات کہ پریزنٹیشن بھی ایک چیز ہوتی ہے، بندہ گھر والے حلیے میں مہمانوں کے سامنے نہیں جاتا اور اتنا غصہ کس بات کا؟ خوامخواہ ہی انرجی کس لیے ویسٹ کر رہی ہیں آپ؟ ہوگا وہی جو آپ چاہیں گی، کوئی زبردستی تو آپ کو نہیں بیاہنے سے رہا۔ آپ بھی اچھی طرح مقابل کا جائزہ لیں تاکہ دلائل کے ساتھ انکار کر سکیں اگر دیکھنے لائق کچھ نہ ملے تو ابو تو ہیں ہی۔ آپ چاہیں تو اس ایکسپیرینس کو انجوائے بھی کر سکتی ہیں، ویسے بتا دوں یہ رشتہ امی یا خالہ کی طرف سے نہیں، یہ کوئی پھوپھو کے سسرالی رشتے دار ہیں۔" اس نے بہن کے جلال کی ایک وجہ وہیں ختم کر دی۔

اس کی تقریر کے بعد وہ چپ ہی رہی۔

"ویسے تو میک اپ لک کے لیے بھی میک اپ کیا جاتا ہے، وہی کر دوں؟" ناچاہتے ہوئے بھی وہ مسکرا دی۔

"میں اپنی شکل پہچان سکوں ایسا کچھ بھی کر دو۔"

"اوکے۔" وہ ماہر میک اپ آرٹسٹ کی طرح ایکشن میں آ گئی۔ بچپن سے میک اپ کرنے کے شوق نے اسے خاصا طاق کر دیا تھا۔

رشتہ چونکہ پھوپھو کے توسط سے اور ان کے رشتے داروں کی طرف سے تھا اس لیے ابو بھی دلچسپی لے رہے تھے۔ انہیں بھی اس کی طرح خالہ اور امی پر اس معاملے میں اعتبار نہیں تھا۔ ایک بار کی ضرب ہی بڑی کاری تھی۔

اس بیچارے تیس سالہ مرد کی بیوی کی وفات ہو گئی تھی، بچے نہیں تھے اور یہ ہی اس رشتے کی شرط تھی۔ عرشی کی بات اس کے دل کو لگی تھی اور وہ سر جھکا کر بیٹھنے کے بجائے گفتگو میں حصہ لینے کے ساتھ ساتھ سوال بھی کر رہی تھی۔ اسے محسوس ہو رہا تھا تقریباً سبھی حاضرین اس کی حرکت پر بے آرام ہو رہے ہیں لیکن اسے کہاں پروا تھی۔

مہمانوں کے جانے کے بعد حسب امید اسلم
مرزا اس کے پاس آئے۔
"بیٹا کیا تم نے بھی شادی نہ کرنے کا فیصلہ کرلیا
ہے؟" وہ سر جھکا گئی۔
"تمہاری مرضی کے بنا کچھ نہیں ہوگا لیکن میں
کبھی شادی نہ کرنے کے فیصلے میں تمہارے ساتھ
نہیں، یہ ممکن نہیں۔ تمہیں کوئی پسند ہے تو وہ بھی مجھے
دل سے قبول ہے۔" ذہن و دل میں 'سالٹ اینڈ پیپر
لک' والے ایک شوخ کی شبیہہ لہرائی اور اس کا سر
مزید جھک گیا کہ ابو کچھ بھانپ ہی نہ لیں۔
"تمہیں یہ پسند نہیں تو میں تمہاری پھوپھو سے
کہہ دیتا ہوں لیکن یہ ذہن نشین کرلو کہ تمہیں شادی
کرنا ہے۔"
"جی ابو۔" اس نے انہیں مطمئن کیا اور وہ
شبیہہ مسکرانے لگی۔
اس رشتے پر ابو کے انکار پر امی اور خالہ کے
پرسکون چہرے اسے ایک بار پھر غصہ دلا گئے۔ اس
نے ضروری کام کا بہانہ بنا کر اسی شام واپسی کا شور
مچا دیا۔ سب اسے اگلی صبح جانے کا کہنے لگے۔ تبھی
امی نے اطلاع دی کہ انہوں نے علیزہ سے بات کر
لی ہے مونس کا دوست کل صبح لوٹ رہا ہے وہ اسی کے
ساتھ واپس جائے گی۔ اس کا دل کیا سر پیٹ لے۔
ہوسکتا ہے وہ رکنا چاہتا ہو اور پچھلی بار کی طرح اس
دفعہ بھی مونس کی بات نہ ٹال سکا ہو۔ وہ اس کی وجہ
سے زبردستی آیا تھا اور اب کی وجہ سے جا بھی زبردستی
رہا تھا۔
اگلی صبح کمرے سے باہر نکلی تو پتا چلا چاچی کے
ابا فوت ہوگئے ہیں اور امی ابو شیراز ادھر جا رہے
ہیں۔ عرشی کالج جا چکی تھی۔ خالہ جو اپنے گھر جانے
والی تھیں امی کے واپس آنے تک رک گئیں کہ اس
کے جانے کے بعد سومعا اکیلی ہو جاتی۔ انظر کا رات
کا پیغام تھا کہ وہ دس بجے تک اسے لینے آئے گا۔
علیزہ اسے بتا دے چکی تھی۔ وہ اپنا ضروری سامان
سمیٹ کر بیگ میں ڈال رہی تھی کہ خالہ کمرے میں
آ گئیں۔
"مونس کا دوست آگیا ہے، ہال میں انتظار
کر رہا ہے تم جلدی کرو۔"
وہ اطلاع دے کر وہیں جمی رہیں تو وہ چونک
گئی۔ ضرور انہیں بات کرنا تھی اور وہ موضوع جانتی
تھی۔
"سدرہ! ذرا ٹھنڈے دماغ سے بات سنو۔"
وہ چپ چاپ اپنے کام میں مصروف رہی۔
"ایک جگہ بیٹھ کر بات سن لو۔"
"آپ کہیں میں سن رہی ہوں۔"
"طلاق کے بعد سے تم اپنی زندگی کے فیصلے
اپنی مرضی سے کر رہی ہو، ایسا لگتا ہے اس طرح تم
اپنی ماں کو سزا دے رہی ہو کہ پچھلی شادی اور طلاق کی
ذمہ دار وہ تھیں خیر۔ میں گڑے مردے نہیں اکھاڑنا
چاہتی اس وقت۔ لیکن ایک التجا ہے اب مزید تنگ نہ
کرو اور جو رشتے موجود ہیں یا آئیں ان میں سے کسی
مناسب رشتے کے لیے ہاں کردینا۔"
ان کی ہر بات پارہ چڑھانے والی تھی۔ وہ
آرائشی میز سے موائسچرائزر اور دیگر کریمیں اٹھا رہی
تھی جب انہیں کہتے سنا۔
"تمہارے باپ کو تو اب بھی فکر نہیں ہے،
انہیں بس..."
اس نے ہاتھ سے آرائشی میز کا سارا سامان
پوری قوت سے دور پھینکا۔ فرش پر گری پرفیوم کی
بوتلیں چھناکے سے ٹوٹی تھیں۔ وہ طیش میں ان کے
سامنے آئی۔
"آپ مجھ سے بڑی ہیں لیکن معاف کریں
اور مجھے کہنے دیں آپ کا رویہ اور یہ بات بے غیرتی
اور بے شرمی ہے۔"
"بس کرو سدرہ! آنکھوں اور کان کا استعمال
کرو، اپنے اس دماغ کی کھڑکیاں کھولو۔"
انہوں نے بھی غصے میں اس کی کنپٹی پر اپنی دو انگلیاں
ٹھوکیں۔
"[illegible] تمہارے باپ [illegible] میں [illegible]

...لہجے میں دعوت مبارزت تھی۔
"یعنی کہ وہ امی سے مقابلہ آرائی یا انہیں نیچا
دکھانے کے لیے اپنی اولاد کی زندگیاں داؤ پر نہیں
لگاتے۔" اس نے بھی آئینہ دکھایا۔ "ان کے
نزدیک بچوں کی مرضی اور خوشی کو اولیت حاصل
ہے۔"
خالہ کچھ دیر لب بھینچے اسے گھورتی رہیں پھر
بالکل سرد آواز میں کہا۔
"تو آج سن لو تم باپ کی لاڈلی بیٹی! یہ گھر اور
شادی اگر قائم و دائم ہے تو تمہاری ماں کی قربانیوں
اور سمجھوتوں سے۔ بھائی جان کالج کے سب سے
ہینڈسم اسٹوڈنٹ اور نمبرون فلرٹ تھے، جن کے کئی
چھچھورے زمانہ عشق اب بھی ان کے ہم عمروں کی
یادداشت میں زندہ ہیں۔ مڈل کلاس کے والدین
جن کی چار بیٹیاں ہوں وہ اسے لڑکوں کی معمولی
عادت مان کر شادی کر دیتے ہیں، اس نصیحت کے
ساتھ اب وہاں سے تمہارا جنازہ ہی نکلے گا۔ یہ کوئی
نئی کہانی نہیں مگر یہ سلسلہ شادی کے بعد بھی جاری
رہا۔ بھائی جان کی رنگین مزاجی کے ساتھ ساتھ
خاندان کی باتیں، طنز، تمسخر سب آپا نے سنے اور
اس کے ساتھ رشتے نبھائے، تعلقات بنائے رکھے،
یہ سب آسان نہیں تھا، اتنی قوت برداشت سب میں
ہوتی ہے، اس مسلسل جدوجہد نے انہیں تلخ کر دیا۔
دنیا کے سامنے سب اچھا ہے کا ناٹک کرنے والی نے
گھر میں ناٹک نہیں کیا، وہ شوہر کے ساتھ ہنسی خوشی
والا ڈرامہ نہیں کرسکیں، تمہارے ابو کی رنگین مزاجی کا
سلسلہ تمہارے اسکول جانے کے بعد بند ہوا تھا۔ اللہ
جانے بچی کے نصیب نے یا تمہاری خوب صورتی نے
انہیں خوف زدہ کیا تھا یا پھر مکافات عمل کا خیال آیا تھا
کہ ان کی سرگرمیاں کم ہوتے ہوتے ختم ہوئیں۔ تم
ان کا حسن اور عادتیں لے کر آئی تھیں شاید اسی لیے
انہیں سب سے زیادہ عزیز ہو اور مزاج کی تبدیلی کی
وجہ بھی یہی۔ اپنے جس دوست کے بیٹے سے وہ تمہارا
رشتہ کر رہے تھے اس کی شہرت بھی ایسی ہی تھی
اس لیے آپا نے دل و جان سے اس کی مخالفت کی اور
وہاں شادی نہیں ہونے دی لیکن تقدیر کے آگے ہم
بے بس ہیں، اتنا دیکھ بھال کر جہاں انہوں نے
تمہاری شادی کی تم جانتی ہو وہاں سے تمہیں طلاق
کیوں ہوئی؟ کبھی بتایا نہیں ابو نے تمہارے......
عاطف کی پھوپھو جنھوں نے شادی نہیں کی تھی اور
فلائٹ کینسل ہو جانے کی وجہ سے وہ دبئی سے یہاں
دیر سے پہنچی تھیں، انہوں نے تمہیں اگلی صبح دیکھا تھا۔
تم جوان کے مقابل کھڑی تھی اور جس کی صورت اس
شخص سے ملتی تھی جس نے محبت کے نام پر انہیں دھوکا
دیا تھا، وعدہ کر کے مکر گیا تھا۔ کالج میں تمہارے ابو کا
مکمل نام سرفراز اسلم تھا۔ جب کہ انہیں عام طور پر
سب اسلم مرزا کے نام سے جانتے ہیں۔ شاید یہ
اتفاق نہ ہوتا تو شادی کی نوبت ہی نہیں آئی تھی لیکن
یہی تو تقدیر کی ہیر پھیر اور چالیں ہیں۔ عاطف نے
اپنی پھوپھو کی محبت میں تمہیں طلاق دی تھی، اپنی
پھوپھو کے دکھ کا بدلہ لیا تھا اس نے تمہارے ابو
سے۔"
"آ آ...... آ...... آپ...... آپ جھوٹ کہہ رہی
ہیں خالہ۔"
"ابھی عاطف کو فون لگا کر دوں؟ اسی سے
پوچھ لو۔"
"تمہیں اپنی ماں سے متنفر دیکھ کر کئی بار سوچا
تمہیں یہ حقیقت بتادوں لیکن ہر بار آپا روک دیتی
تھیں۔" خالہ کی بات جاری تھی لیکن اسے کچھ سنائی
نہیں دے رہا تھا۔
اس نے آدھا ادھورا بھرا بیگ اور پرس اٹھایا
اور دروازے کی طرف بڑھی جو بند نہیں تھا۔ پٹ پورا
وا کرتے ہی قدم رک گئے۔ سامنے انظر کھڑا تھا۔ وہ
اس کے بازو سے نکل کر گیٹ کی طرف بڑھی وہ بھی
اس کے پیچھے تھا۔ خالہ نے کمرے میں پلنگ پر بیٹھتے
ہوئے سوچا۔
"بچی نہ ہی سہی تو اسے اس کا علم ہونا ہی تھا۔"
وہ کار کے قریب پہنچی تو دور سے انظر نے

گے۔" پھر خود ہی پیچھے مڑ کر دیکھا جہاں اس کی جیکٹ پڑی تھی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر اٹھالی۔
"تھینک یو۔" انظر نے اس کے ہاتھ سے لے کر پہنا اور باہر نکل گیا۔
اس نے پیر سامنے پھیلاتے ہوئے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسائیں۔ اسے بھی باہر نکلنے کی ضرورت تھی۔
"بارش نہ ہوتی تو اتر جاتی۔" ہاتھ نیچے کرتے ہوتے ہوئے اس نے سوچا۔ کچھ یاد آنے پر پیچھے سے پرس اٹھا کر اس میں سے فون نکالا۔
ابو، امی، خالہ، علیزہ سب کی مسڈ کالز تھیں، پیغامات بھی۔ کچھ دیر سارے نوٹیفیکیشنز کو گھورنے کے بعد اس نے فون سوئچ آف کر دیا۔
"ساری مسڈ کالز انظر نے سنی ہوں گی۔" اس نے فون واپس رکھتے ہوئے سوچا۔ ریئر ویو مرر اپنی طرف کر کے شکل دیکھی اور اسے خالہ کے الفاظ یاد آگئے۔
"تم ان کا حسن اور عادتیں لے کر آئی تھیں۔"
اس کے تیکھے نقش باپ جیسے تھے۔ خاص طور پر اسے حسین بنانے والی گلابی رنگت اور غلافی بھوری آنکھیں۔ اس نے سر کا رخ موڑ دیا اور کیچر نکال کر بال ہاتھوں سے سنوارنے لگی۔ انہیں سیٹ کر کے دوبارہ کیچر لگایا اور دوپٹا درست کر کے انظر جدھر گیا تھا اس طرف دیکھنے لگی۔ وہ آتا دکھائی دیا تو بائیں طرف جھک کر دروازہ پورا کھول دیا۔
"تھینک یو۔" اس نے اس کے ہاتھ سے چائے کا کاغذی کپ لیا۔
"چائے نہیں کیسی ہے لیکن میری بنائی چائے سے تو بہتر ہی ہوگی۔"
اس نے اپنی نشست سنبھال کر دروازہ بند کیا۔ وہ نظروں سے اپنا کافی کپ رکھنے کی جگہ ٹٹول رہا تھا۔ سدوس نے ہاتھ بڑھا کر اس کا کپ لے لیا۔ انظر نے جیکٹ اتار کر پیچھے رکھی پھر گھوم کر واپس پلٹا۔
"تمہیں بھوک تو نہیں لگی؟ میں نے اسنیکس نہیں لیے۔"
"نہیں، بس چائے چاہیے تھی۔" اس نے پہلا گھونٹ لیا۔
"ناٹ بیڈ!" اس نے ایک گھونٹ کے بعد رائے دی۔ اسے دیکھ رہا انظر تسلی سے مسکرا دیا۔
چالیس منٹ بعد وہ ریزورٹ پہنچ گئے تھے۔ بارش تھم چکی تھی۔
"آپ رکیں گے؟"
"نہیں۔"
"تھینک یو سب کے لیے۔"
"یہ تو مجھے کہنا چاہیے، تم نے تو مجھے 'سب کے لیے تھینک یو' ڈیزرو کرنے کے قابل نہیں سمجھا۔" یہ شکوہ تھا یا ناراضی لیکن انظر نے مسکراتے ہوئے سادگی سے کہا۔
اس نے اضطراری انداز میں پہلو بدلا۔ کچھ کہنے کی کوشش میں سر اٹھا کر اسے دیکھا لیکن زبان اور الفاظ کوئی ساتھ دینے تیار نہ ہوا۔
"سدوس!" اس کی احساس سے لبریز سرگوشی نما پکار بھرے بادل میں شگاف کر گئی۔ وہ بے اختیار رونے لگی۔ اس افتاد پر وہ خود حیران تھی۔ خود کو روکنا چاہتی تھی مگر آنسو تھم نہیں رہے تھے۔ اس نے تھوڑی دیر انہیں قابو کرنے کی ناکام کوشش کی پھر دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپ لیا۔ اس کی گھٹی گھٹی سی گریہ زاری رکنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔
"سدوس!" پورا اس کی سمت مڑ کر نشست کے پیچھے ہاتھ رکھتے ہوئے انظر نے پھر آواز دی۔
"اب تم اس بارش میں بھیگنے سے بیمار پڑ سکتی ہو۔" اس نے آہستہ سے چہرے سے ہاتھ ہٹائے اور جھکے سر کے ساتھ دوپٹے سے چہرہ خشک کیا۔
"تم جب بھی اندر کا غبار نکالنے کے لیے ریڈی ہو میں ایک میسج، ایک کال کے فاصلے پر ہوں۔ ویسے میرا خیال ہے علیزہ کی بات مان لینی چاہیے، میں تمہیں وہاں ڈراپ کر دیتا ہوں۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"میں ٹھیک ہوں اور اس وقت اکیلے رہنا چاہتی ہوں۔" اسے اس کی مسلسل نگاہ کا احساس تھا اس کا مدعا بھی جانتی تھی۔
"اوکے۔" دھیرے سے کہہ کر وہ سیدھا ہوا۔ مظفر چاچا آتے دکھائی دیے تو اس نے دروازہ کھولا پھر اس کی سمت رخ کیا۔
"آپ فریش ہو کر ری چارج تو ہو لیں۔"
"ٹھیک ہے لیکن مجھے سات بجے سے پہلے پہنچنا ہے ورنہ کافی لیٹ ہو جاؤں گا۔"
مظفر چاچا وہاں پہنچ چکے تھے وہ باہر نکلی اور پچھلا دروازہ کھول کر بیگ اٹھا کر انہیں تھمایا۔
"آفس میں رکھ دیں چاچا میں آرہی ہوں۔"
"جی بیٹا۔" انظر کو سلام کرنے کے بعد وہ چلے گئے۔ انظر بھی کار سے نکل کر اس کے پاس کھڑا تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔
"پھر۔ اللہ حافظ۔" سدوس نے کہا۔ اس کا گریز اور احتیاط سمجھنے کے باوجود بھی انظر کا چہرہ سب کچھ کہہ رہا تھا اور وہ انجان بننے کی کوشش میں عیاں ہو رہی تھی۔
"جلد ملیں گے پھر۔" اور وہ جیسے تب تک کے لیے دید ذخیرہ کر رہا تھا۔ وہ چپ رہی تو انظر نے کہا۔
"ان شاء اللہ ہی کہہ دو یا واقعی دوبارہ ملنا نہیں چاہتیں؟"
"ایسا نہیں ہے۔ ان شاء اللہ ملیں گے پھر۔" وہ مسکرائی اور انظر کو لگا پھر رونے لگے گی۔
"اللہ حافظ۔" کہہ کر وہ آگے بڑھ گئی۔ آفس کے دروازے پر پہنچ کر اس نے مڑ کر دیکھا۔ انظر نے ہاتھ ہلایا اور وہ بھی ہاتھ ہلا کر اندر چلی گئی۔

☆☆☆

انظر اس کی کال کا انتظار کرتا رہا۔ وہ جان بوجھ کر خود اس سے رابطہ نہیں کر رہا تھا۔ وہ جانتا تھا اسے وقت چاہیے لیکن پھر اس سے صبر نہیں ہوا۔ دوسرے دن وہ اس کے دروازے پر دستک دے رہا تھا۔ سدوس نے کتاب بازو میں رکھی اور دوپٹا لے کر پلنگ سے نیچے اتری۔ اسے لگا تھا مظفر چاچا ہوں گے۔ ان کے علاوہ شاذ ہی کوئی اس کے کمرے تک آتا تھا۔ دروازہ کھولتے ہی اسے جھٹکا لگا۔ یہ اتنا غیر متوقع سامنا تھا کہ وہ انظر کے سلام کا جواب بھی نہیں دے سکی۔ سنبھلتے ہی اس نے ہاتھ سے کھلے بال سمیٹے اور ایک طرف ہوگئی۔ انظر اسے دعوت سمجھتے ہوئے اندر آگیا۔
"میں مخل تو نہیں ہوا؟" اس نے اوندھی کھلی کتاب کی طرف انگلی اٹھاتے ہوئے پوچھا۔
"ویسے میں ایک پروپوزل لے کر آیا ہوں۔" اس سے آگے آکر کرسی کھینچتے ہوئے وہ ساکت ہوگئی۔"
"تمہارے اس شوق سے جڑا۔" اس نے پھر کتاب کی طرف اشارہ کیا۔ اس نے ذرا دیر کے لیے بے جان ہوگئے ہاتھوں سے اسے کرسی پیش کی۔
"بیٹھیں۔" کمرے پر طائرانہ نظر ڈالتا وہ بیٹھ گیا۔
"تم بھی بیٹھو۔" اسے یونہی کھڑا دیکھ کر اس نے آگے جھک کر کرسی کھینچی۔
"میں پہلے کافی کے لیے کہہ دوں۔" وہ دروازے کے قریب دیوار میں لگے انٹرکام کی طرف بڑھی۔
"میرے کمرے میں دو کافی بھیجنا پلیز.....
نہیں کافی ہی۔"
وہ کرسی پر آکر بیٹھی تو مسکرا کر اسے دیکھا۔
"کیسے ہیں آپ؟"
"تم کیسی ہو؟" اس نے جواب دینے کے بجائے گہری نظروں کے ساتھ سوال کیا۔
"ٹھیک ہوں۔"
"میں کال اور میسج کا انتظار ہی کرتا رہا۔"
"میں اب تک ریڈی نہیں ہوں۔"
"یعنی میں چلا جاؤں۔"
"میرا یہ مطلب نہیں۔" اس کے گود میں دھرے ہاتھ اضطراری انداز میں متحرک تھے۔

"آپ میرے شوق کے متعلق کچھ کہہ رہے تھے۔" اس نے بات بدل دی۔

"مجھے 'سلیٹ' کے لیے اردو ایڈیٹر کی ضرورت ہے۔"

"مجھے بس مطالعے کا شوق ہے یہ جاب تو......"

"مجھے ابھی جواب نہیں چاہیے، آرام سے سوچ، چاہو تو میں جاب ڈسکرپشن وغیرہ ای میل کر دوں گا۔" وہ اس بہانے آیا تھا مگر اسے اس بات کو طول نہیں دینا تھا۔

"ٹھیک ہے۔"

تبھی دروازے پر دستک ہوئی۔ سدوس نے اٹھ کر دروازہ کھولا اور ملازم سے ٹرے لے کر واپس آئی۔ اسے میز پر رکھنے کے بعد ایک مگ اس کے آگے رکھا اور کرسی پر بیٹھ گئی۔

"کیا یہاں کے ملازم بھی بری چائے بناتے ہیں؟"

"نہیں۔" وہ ہنس دی۔ "مجھے کافی سے بیر تھوڑی ہے۔" اس نے مگ اٹھایا۔

"تم نے ابو اور امی سے بات کی؟"

"کرتی ہوں۔"

"میں نے روٹین بات کا نہیں پوچھا۔"

"نہیں۔"

"کیوں؟"

"کیوں کروں؟"

"کیوں نہیں کرتی؟"

"اس سے کچھ نہیں بدلے گا، جو جیسا ہے ویسا ہی رہے گا بلکہ جنہیں میں شرمندہ نہیں دیکھنا چاہتی وہ شرمندہ ہوں گے، پھر ایک لڑائی ہوگی، کیا پتا شیراز اور عرشی کو بھی جھگڑا پڑ جائے، پردہ نہیں رہے گا تو لحاظ بھی ختم ہو جائے گا۔ ایک بھی اچھا نتیجہ نہیں اس کا......"

"تمہاری گھٹن ختم ہوگی، تمہارا غصہ اور تکلیف کم ہوگی، تمہارا یہ ڈپریسڈ موڈ ٹھیک ہوگا تم اس قدر سے باہر نکل کر آگے بڑھ سکو گی۔"

"مجھے آگے پیچھے کہیں نہیں جانا ہے۔" اس کے لہجے میں ضد سی تھی۔

"جمود موت ہے سدوس! خود کو اس طرح برف میں دفن نہ کرو۔"

"انظر! میری زندگی میں پہلے بھی کوئی ہلچل اور حرارت نہیں تھی آگے بھی ایسی ہی رہے تو میرے لیے آسانی ہی ہے۔"

"تمہاری زندگی میں حرارت ہوگی محبت بھی......"

"محبت!" تلخ سے لہجے اور طنزیہ تبسم کے ساتھ اس نے بات قطع کی۔

"کون سی محبت؟ آپ کی امی والی جس نے انتقام کا رنگ اوڑھ کے بیٹے کو باپ سے دور کر دیا، انکل والی جس کی سوغات اذیت اور تنہائی ہے، ابو جیسی محبت جس کی گنتی ممکن نہیں یا عاطف کی پھوپھو والی جس نے ایک لڑکی کو طلاق کا طوق پہنایا؟"

اس کے تحت تاثرات دیکھتے ہوئے انظر کے دل پر پہلی بار خوف نے دستک دی، پانے سے پہلے گنوانے کے خوف نے۔

"تم کیوں اسے ان چار افراد کی کسوٹی پر جانچ رہی ہو، دنیا میں صرف یہی شیڈ ہوں تو نہیں محبت کے۔"

"میں نے تو یہی دیکھے اور مجھے یقین ہے اس کا انجام کسی نہ کسی کی بربادی پر ہی ہوتا ہے۔"

"سچ کہیں تم اپنا تجربہ کر کے دیکھ لو۔"

"نہیں ہے اتنا حوصلہ۔" اس کی آواز رندھ گئی۔ "دوسرے کا حوصلہ آزماؤ۔"

"اس آزمائش کا انجام بھی ویسا ہی ہوا تو؟"

"نہیں ہوگا۔"

"مجھے خود پر ہی اعتبار اور یقین نہیں ہے۔" آنسو ضبط کا ہاتھ چھڑا کے پھسلنے لگے۔

"مجھے ہے۔" وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے روتے ہوئے مسکرائی۔

"غلط ہے انظر۔ آپ مجھے جانتے ہی کتنا ہیں، ایسے دعوے نہ کریں۔" اس نے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔

"سدوس! تم سوچو تو وہ، سنو تو۔"

"آپ یہ ہی غلط سمجھ رہے ہیں کہ آپ کو محبت......"

"میں نے کب کہا مجھے محبت ہے؟" اب کے انظر نے اس کا جملہ مکمل نہیں ہونے دیا۔

وہ اتنی شرمندہ ہوئی کہ یہ اس کے لیے زمین پھٹنے اور دھنس جانے کی خواہش والا لمحہ تھا۔

"محبت سے میں بھی بہت گھبراتا رہا ہوں، ایسا نہیں ہے کہ امی کی ڈائری پڑھنے کے بعد یا ابا کے متعلق غلط فہمی دور ہونے پر اچانک مجھے محبت ہو گئی ہے بلکہ مجھے اب بھی نہیں معلوم یہ کیسی ہوتی ہے۔ ڈائری سے پہلے ہی تم نے میرے اندھیری کال کوٹھری میں مقفل احساسات کو دروازے کھولنے کی ضد پر لگا دیا تھا، میرا دل تمہاری جانب مائل ہوا تھا، مجھے تم اچھی لگی تھیں، ڈائری سے پہلے ہی مجھے تمہاری فکر ہوئی تھی، سیڑھی پر تمہیں کافی پیتے دیکھ کر میں نے طے کیا تھا مجھے اچھی چائے بنانا سیکھ لینا چاہیے، جیکٹ سے تمہاری مہندی کی خوشبو پر پہلی بار میں نے اس خوشبو اور رنگ سے جڑی رسم کو سوچا تھا، اسے تم سے منسوب کیا تھا، تمہیں بس اسٹاپ پر لے جاتے ہوئے میں نے سوچا تھا آئندہ ہر بار تمہیں گھر تک ڈراپ کروں گا، ڈائری پڑھنے کے بعد مجھے تم یاد آئی تھیں، باقی زندگی کے سارے درد ساری خوشیاں بھی مجھے تمہارے ساتھ بانٹنا ہے، مجھے تمہارا ہاتھ تھامنے، تمہارے آنسو پونچھنے، تمہیں سنبھالنے اور سمیٹنے والے سارے حقوق چاہئیں۔ میری ان خواہشوں کو تم جو چاہے نام دے دو لیکن سچ کہو، ان میں سے کسی ایک خواہش پر بھی تمہارا دل نہیں دھڑکا؟ اگر دھڑکا ہے تو حوصلہ کرو سدوس......"

"انظر!" پھر آنسو ٹوٹ کر گرنے لگے۔

"مجھے آپ کی سچائی پر شک نہیں لیکن......" گلے کے پھندے نے اسے روکا۔ "آگے آپ مایوس ہوں اس سے بہتر ہے آپ یہ تکلیف دہ بات ابھی تسلیم کر لیں کہ میں آپ کے لیے ٹھیک، محبت میرے لیے نہیں۔ میں اپنے ماں باپ کی زندگی اپنی زندگی سے نہیں نکال سکتی، اس کے اثرات سے نہیں نکل سکتی، یہ میری کمزوری ہے۔" اس نے آنسو صاف کیے۔

"ہم ٹین ایجرز نہیں، ہمارے مزاج پختہ ہیں یہ اب بدلنے والے نہیں، آپ نے اپنی امی کی ڈائری کو جس طرح ہینڈل کیا میں ابو اور امی کی حقیقت ویسے ہینڈل نہیں کر سکتی۔"

"سدوس......"

"پلیز! میں خود کو اچھی طرح سمجھتی ہوں۔ مجھے شادی اور محبت سے چڑ ہوتی ہے۔ آپ زندگی میں آگے بڑھیں، تنہا نہ رہیں، آپ کو خوش دیکھ کر مجھے بھی خوشی ہوگی، مجھے قائل کرنے کی کوشش اور میرے مان جانے کا انتظار فضول ہے۔" وہ کھڑی ہوگئی۔

"کافی ٹھنڈی ہوگئی ہے، میں دوسری لاتی ہوں۔" وہ مگ اٹھا کر جانے لگی تھی کہ انظر نے دوسری طرف سے مگ پکڑ اسے روکنا چاہا۔

"ان سب میں تم نے میرے لیے اپنی فیلنگز کا ذکر نہیں کیا۔" دونوں کے ہاتھ کے درمیان پھنسا مگ ڈگمگایا اور کافی چھلکی۔ انظر مسکرایا اور اپنا ہاتھ ہٹا لیا۔ اس نے نظر چرا لی۔

"ابھی آئی۔" وہ باہر چلی گئی۔ کچھ دیر بعد واپس آئی تو انظر وہاں نہیں تھا۔ وہ بے دم ہوتے قدموں سے آگے آ کر اس کی کرسی پر بیٹھ گئی۔ کچھ دیر مگ کو دیکھتی رہی پھر کافی پینے لگی۔ گرم کافی تھی یا کوئی اور حدت کا احساس کہ وہ روتی جا رہی تھی۔

☆☆☆

انظر نے علیزہ سے جانے کیا کہا تھا کہ وہ ہر دوسرے دن اس کے ارادے بدلنے کے لیے اسے فون کرنے لگی تھی۔

"اب کیا قلموں کی طرح خدانخواستہ خدا

ناخواستہ انظر بھائی کے ایکسیڈنٹ یا کسی بڑی بیماری کی خبر سنتے ہی تمہارا احساس جاگے گا اور تم ہیروئین کی دوڑتی ہوئی آؤ گی؟"
اس سے زیادہ مرتبہ اللہ نہ کرے اس نے دل میں دہرایا تھا۔
"تم مجھے فون کرنے کے بجائے ان کے لیے کوئی ڈھنگ کی لڑکی کیوں نہیں دیکھتیں؟"
"انہیں ایک بے ڈھنگی پسند آگئی ہے اور انہیں اسی کے ساتھ ہیپی اینڈنگ چاہیے۔"
"جو ملنے کی رہی، پہلے ہی ان کے بال پکنے لگے ہیں، تم ہی عقل کے ناخن لو۔"
"اب یہ زیادتی ہے، ان کی عمر اور وہ گرے بال ہی ان کا سب سے بڑا الزام ہے۔"
"کوئی اور بات نہیں تو فون رکھو اور اگر واقعی ان کی فکر ہے تو کہیں شادی کروادو جلدی۔"
"تمہارا کیا "رک جاؤ۔" کا نعرہ لگاتے ہوئے ان کی شادی کے منڈپ میں انٹری مارنے کا ارادہ ہے۔ اتنی فلمی تو نہیں تھیں تم۔"
اس پر کسی بات کا اثر نہیں ہوتا تھا۔ اس کی ان باتوں کا علیزہ پر کوئی اثر نہیں تھا۔
خالہ نے کسی کو نہیں بتایا تھا کہ وہ سب اگل چکی ہیں اس لیے اس کا رویہ بھی سب کے ساتھ معمول کی طرح ہی تھا۔

☆☆☆

پہلی بار عرفان احمد اس کے ساتھ رہنے آئے تھے۔ رات کھانے کے بعد کچھ دیر اپنے کام کی اور ادھر ادھر کی باتوں کے بعد وہ کمرے میں جانے لگا تو انہوں نے آواز دے کر روکا۔
"انظر......"
"جی۔" وہ وہیں سے مڑ کر انہیں دیکھنے لگا۔
"سدرہ کیسی ہیں؟" اسے ان سے اس سوال کی امید نہیں تھی اس لیے گڑبڑا گیا اور فوراً جواب نہیں دے سکا۔
"آں...... ٹھیک ہے...... میری کافی ٹائم سے بات نہیں ہوئی۔" وہ اس کے سامنے آکر رک گئے۔
"ابھی بچی ہے۔ تم بھی شادی کے بارے میں سنجیدگی سے سوچو، پہلے ہی لیٹ ہوگئے ہو۔" انہوں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا اور اپنے کمرے میں چلے گئے۔
"دیکھ لو ابا کو بھی احساس ہے!" اپنے کمرے میں آکر اس نے دل میں اسے مخاطب کیا۔
اگلے دن کے کپڑے دیکھنے کے لیے الماری کھولی تو سامنے ہی اس کا ونڈ چیٹر ٹنگا تھا۔ اس نے اسے ہینگر سے نکالا اور پلنگ کے کنارے پر ٹکا دیا۔ اسے ابھی اس سے سگریٹ کی مہک نہیں آئی تھی بلکہ اس دن کے بعد سے اس میں حنا کی خوشبو بسی تھی۔
اس نے اس کی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ سدرہ کے ہاتھوں سے جھڑی مہندی کے ذرے اب تک اس میں موجود تھے۔ ابا کے الفاظ اب بھی اس کے کانوں میں گونج رہے تھے۔
"پہلے ہی لیٹ ہوگئے ہو۔" وہ کچھ دیر گہری سوچ میں ڈوبا رہا۔ پھر جیکٹ ایک طرف رکھ کے فون اٹھایا۔ علیزہ سے اس کی امی کا نمبر لیا اور اسی وقت انہیں فون لگایا۔
فضیلت نے انجان نمبر دیکھ کر تیسری کوشش میں فون اٹھایا تھا۔ بات ختم کرکے وہ بہت دیر کمرے میں ٹہلتی رہیں۔ پھر کمرے سے نکل کر ہال میں آئیں جہاں اسلم مرزا ٹی وی دیکھ رہے تھے۔
"سب کچھ بھول کر صرف ایک بات کا جواب دیں۔" انہوں نے ریموٹ اٹھا کر ٹی وی بند کرکے بنا تمہید کے ان سے پوچھا۔
"آپ کو سدرہ کی پرواہ ہے؟ کیا آپ اسے واقعی ہنستا بستا دیکھنا چاہتے ہیں؟" انہیں فضیلت کی حرکت پر غصہ آیا تھا اور ان جملوں نے حیران کیا۔ انہوں نے کچھ دیر بیوی کو دیکھا پھر اس کے چہرے کی سنجیدگی بھانپ کر جواب دیا۔
"ہاں۔"
"اس کے لیے کیا کرسکتے ہیں؟"
"کچھ بھی، سب کچھ۔" فضیلت ایک گہری سانس لے کر ان کے بازو میں بیٹھ گئیں۔

☆☆☆

ایک بار پھر وہ دروازے پر غیر متوقع ملاقاتی دیکھ کر ششدر رہ گئی۔ ان دونوں کو ساتھ دیکھنا ہی اس کے لیے عجیب تھا لیکن ان کی بات سن کر تو اسے خواب کا گمان ہونے لگا۔
"تمہاری اور ہماری عمر وہ ہے کہ اب بہانے، جھوٹ اور پردہ داری کا کوئی مطلب نہیں۔ شادیاں قسم کی ہوتی ہیں، ازدواجی زندگی بھی ہر قسم کی، بد قسمتی سے دونوں معاملوں میں ہماری قسم بے جوڑ اور کمزور تھی۔ اس کی وجہ جو بھی رہی ہو ہم نے اپنی اپنی جگہ اپنے طریقے سے بچوں کا بھلا سوچا۔ ہمیں ایک دوسرے کے طریقے اور سوچ پر اعتراض اور اس کے صحیح ہونے پر شک رہا مگر نیت ایک ہی تھی۔ ہمیں اعتراف ہے کہ کئی بلکہ بیشتر معاملات میں ہم نے اپنے رویے اور چپقلش سے بچوں پر ہونے والے اثرات پر دھیان نہیں کیا۔ جس کا افسوس ہے اور پچھتاوا بھی کہ اب وقت گزر چکا ہے۔" وہ حیران تھی اپنے ابو کی بات سن رہی تھی۔ وہ خاموش ہوئے تو فضیلت گویا ہوئیں۔
"ہماری زندگی واحد اور آخری کسوٹی نہیں ہے بلکہ اسے تو وہ معیار بنالو کہ تمہیں کسی حال میں یہاں تک نہیں جانا۔ محبت اور ساتھی تو مقدر میں لکھا ہی ملتا ہے لیکن مقدر لکھنے والا اتنا مہربان ہے کہ اسے بگاڑنا سنوارنا ہمارے اختیار میں دے رکھا ہے، ہم نے بگاڑا، اس بگاڑ سے سیکھ کر تم سنوارو۔ دوسرے کے تجربے سیکھنے اور تجربے کے لیے ہوتے ہیں، اسے اپنے فیصلوں کی بنیاد نہیں بناتے۔ ہر کسی کا اپنے تجربے سے گزرنا ہی زندگی کی خوبصورتی ہے کہ اس میں یکسانیت نہیں ہوتی، یہ کن ہی دو افراد کا ہو بہو نہیں ہوتا کہ سب کے حالات، مزاج، احساسات، سمجھ کا لیول ایک سا نہیں ہوتا ہے اور یہ اچھا شگون ہے بہت خوش آئند بھی۔
اس لیے اچھے گمان کے ساتھ فیصلہ کرو، آگے بڑھو، پسند کرنے والا، پسند آنے والا، سمجھنے والا مل جائے تو اسے مایوس نہیں کرتے، نہ منہ موڑتے ہیں، یہ نعمت سب کے حصے میں نہیں آتی اور زندگی تنہا نہیں کٹتی۔ ہماری زندگی کو ہی دیکھو کہ شادی، بچی اور زندگی کے لیے ایسا ساتھی کیوں ضروری ہے، کیوں انمول ہے۔" اسے پہلی بار ماں کی آواز میں درد محسوس ہورہا تھا۔ وہ رک گئی تھیں۔
"میاں بیوی کی ایک بات پر بھی 'کامن گراؤنڈ' ڈھونڈ لیں تو الجھنیں، مشکلیں کم ہوجاتی ہیں اور اگر یہ اولاد کی بھلائی ہو تو اختلاف بھی کمزور پڑجاتے ہیں، یہ بڑی دیر سے سمجھ میں آیا، اگر یہ ایک بات کہ ہمیں اپنے بچوں کو خوش حال دیکھنا ہے ہم سمجھ جاتے، قبول کرلیتے تو زندگی ایسی نہیں ہوتی جیسی اب تک گزاری ہے۔" ابو کی بات ثبوت تھی کہ بڑی دیر سے ہی مگر وقت رہتے ان دونوں کو 'کامن گراؤنڈ' مل گیا تھا۔
"ہماری زندگی جیسی بھی گزری اب ہمارا مقصد تمہیں خوش اور آباد دیکھنا ہے۔ ہماری ایک طرح سے ناکام زندگی کی کامیابی تم تینوں کو خود سے بہتر زندگی گزارتے دیکھنا ہوگی۔" ابو کی آنکھوں میں ندامت اور ملال کا رنگ اسے بہت دکھ دے رہا تھا۔
اس رات وہ اس کے پاس ہی ٹھہرے۔ اسلم مرزا اس کے پلنگ پر سوئے تھے اور وہ پہلی بار اپنی ماں کے ساتھ نیچے فرش پر بستر بچھا کر۔ رات کے کسی پہر گہری نیند میں فضیلت کو دیکھتے ہوئے اس نے پہلی بار اپنا ان کے اوپر رکھ دیا۔ ماں کی آغوش سے محرومی کی ذمہ دار وہ خود بھی تھی۔
اگلی صبح جب وہ سامان ٹیکسی میں رکھ رہے تھے فضیلت نے اسے بتایا کہ انظر نے انہیں فون کیا تھا۔ اس کا ماننا تھا کہ یہ گرہ ان دونوں کے علاوہ کوئی اور نہیں کھول سکتا ہے۔ انہوں نے یہ نہیں بتایا کہ ان کے لیے اپنی انا اور عزت نفس چھوڑ کر شوہر کے پاس جانا کیسا قیامت سے گزرنے جیسا تھا۔

حنا بشریٰ

داج

ان دونوں کے جانے کے بعد وہ بہت دیر سے فون ہاتھ میں لیے ادھر ادھر ٹہل رہی تھی۔ اس کا نام کب سے اسکرین پر تھا لیکن وہ کال کی علامت کو چھو نہیں پا رہی تھی۔ آخر اس نے واٹس ایپ کھولا۔

"آپ کا پہلا اور آخری پیار اب بھی کافی ہے؟"

کچھ سیکنڈ بعد ہی جواب حاضر تھا۔

"لیس، مشروبات میں۔" وہ سوچ ہی رہی تھی کہ اس کا اگلا پیغام بھی آ گیا۔

"ویسے تم نے چائے کو پہلا پیار نہیں کہا تھا۔"

"اب کہہ دیتی ہوں، چائے میرا پہلا پیار ہے۔"

"میں سیکنڈ پوزیشن پر بھی خوش ہوں۔"

"لیکن میں خوش نہیں۔"

"اور وہ کیوں؟"

"میرے پہلے اور دوسرے پیار کی آپس میں بنتی جو نہیں۔"

توقع کے عین مطابق اگلے پل فون کی رنگ نے شور مچانا شروع کر دیا۔

☆☆☆

"ویسے آپ اب بھی امی والے ہیں۔" وہ دونوں اس وقت ریزورٹ کے کاٹیج نمبر سات کے سامنے گرل کے پاس کھڑے تھے۔

"اس بیان کا پس منظر؟"

"آپ نے ابو کو نہیں امی کو جو فون کیا تھا۔" وہ ہنسنے لگا۔

"ایسا نہیں ہے یہ بحث کا موضوع ہی نہیں کہ ہمیشہ امیاں یعنی عورت صحیح ہوتی ہیں یا ابا یعنی مرد۔ دراصل ہر رشتے میں ایک فریق زیادہ سمجھدار، زیادہ صابر اور رشتے کو چلانے والا ہوتا ہے۔ میرے کیس میں یہ فریق ابا تھے اور تمہارے کیس میں امی اس لیے انہیں فون کیا، اس لیے نہیں کہ میں امی والا ہوں۔"

"ہمم......" اس نے جیکٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا۔

"اب بھی اس میں سگریٹ کی اسمیل ہے۔"

"خدا کا خوف کرو! ہاتھ بھی نہیں لگایا سگریٹ کو، ویسے مجھے تو بھی محسوس نہیں ہوئی۔" اس نے جیب سے ہاتھ نکال کر مٹھی کھولی۔ اس میں خشک مہندی کے ذرات تھے۔ اس نے حیرت سے انفر کو دیکھا

"ہاں مجھے اس سے یہ خوشبو ضرور آتی ہے۔"

"ہا! مجھے کیوں نہیں محسوس ہوئی؟ کپڑے بھی آسیب زدہ ہوتے ہیں کیا؟" وہ خوف زدہ سی جیکٹ اتارنے لگی تھی کہ اس نے اسے شانوں سے تھاما۔

"سگریٹ اور مہندی بہانے تھے، دراصل اس میں ہماری خوشبو بسی ہے، تمہیں میری محسوس ہوئی مجھے تمہاری۔"

سدوس نے منہ بنایا۔

"کیا غلط کہا؟"

"غلط کا نہیں پتا لیکن یہ......اس طرح کے ڈائیلاگ......کیا کہیں گے اسے......ہمم......" وہ سوچنے لگی۔ "ہاں ٹین ایجرز والے ہیں یا پھر۔"

تب ہی علیزہ ان دونوں کو ڈھونڈتی ہوئی ادھر آئی۔

"ادھر ہیں یہ مڈل ایج لیلیٰ مجنوں......"

"ہے......"

"اے!" وہ دونوں تنبیہی انداز میں چیختے ہوئے جارحانہ انداز میں ہاتھ اٹھا کر اس کی طرف مڑے تھے۔

علیزہ سینے پر ہاتھ رکھ کر گھبرا کر پیچھے ہوئی۔

"کیا ہوا؟"

ان دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور زوردار قہقہہ لگایا۔

"انہیں کیا ہوا؟" پیچھے سے آتے موں نے پوچھا۔ "شاید لیٹ شادی کے سائیڈ ایفیکٹس ہیں یا پھر شادی نے دیوانہ کر دیا ہے۔" وہ دونوں حیرت سے انہیں ہنسی سے بے حال ہوتے دیکھ رہے تھے۔

☆☆

حنا بشریٰ
داغ

صحن میں بچھی چارپائیوں پہ وہ چاروں بیٹھے تھے۔ ان چاروں کے درمیان پچھلے دو گھنٹے سے جاری گرما گرم بحث نے ہاتھوں میں پکڑی گرم چائے ٹھنڈی کر دی تھی۔ چند لمحوں کے لیے باتوں کا سلسلہ رکتا تو کسی کے چہرے پہ غصہ ہوتا تو کسی کے چہرے پر سوچ کی پرچھائیاں۔

اگلے ہی لمحے پھر سے وہی بات کسی نئے انداز و طریقے سے چھڑ جاتی۔ نہ باتیں ختم ہونے میں آ رہی تھیں اور نہ ہی ان باتوں کا کوئی نتیجہ نکلتا نظر آ رہا تھا۔

دروازے کی اوٹ میں کھڑی کلثوم کے بھی اب پیر تھک کر دہائیاں دینے لگے تھے۔ اسے دیکھ کر یہ گمان ہونے لگا تھا کہ وہ کوئی پتھر کا بت ہو۔

☆☆☆

"نا مجید پائی (بھائی) ہم نے کون سی ایسی وڈی چیزیں مانگ لی ہیں؟"

ٹھنڈی چائے کا آخری گھونٹ لے کر پیالی پاس ہی چارپائی پر پٹختی پہ میداں تھی۔ جس کی زبان درازی سے پورا خاندان گھبراتا تھا۔ وہ بولنے پہ آتی تھی تو سامنے والے بندے کی تو بولتی ہی بند ہو جاتی تھی۔

ابھی بھی پچھلے دو گھنٹے سے اس کی زبان قینچی کی طرح چل رہی تھی۔ سامنے بیٹھے مجید اور اس کی بیوی صغراں "ہولے ہولے" سروں کو ہلاتے اس کی باتیں سن رہے تھے۔ سننا ان کی مجبوری جو تھی۔ پھر میداں کے سامنے کیا مجال تھی کہ وہ کچھ بولتے۔ اداس چہروں پہ پریشانی جھلک رہی تھی۔ اور گھونٹ گھونٹ ٹھنڈی چائے جیسے زہر مار کر رہے تھے۔

"ناں کسی جوگی دی دیتا ہے۔ اپنی بچی کو ہی دیتا ہے......!"

غصے سے سر جھٹکتے ہوئے کھینچ کر دوپٹہ اپنے سر پہ ڈالا تھا اور ساتھ ہی پاس بیٹھے اپنے شوہر اقبال (عرف بالا) کو موٹی موٹی آنکھوں سے گھورا تھا۔

جس نے بڑا سا سر ہلاتے ہوئے بیوی کی ہاں میں ہاں ملائی تو میداں کا چہرہ فخر سے ٹماٹر کی طرح سرخ ہو گیا تھا۔

بالا پورے خاندان میں زن مرید کے نام سے مشہور تھا۔ مگر اس مشہوری پہ بالا سینہ پھلا کر پھرتا تھا کیونکہ میداں آٹھ جماعتیں پاس تھی اور خاندان کی سب سے "سوہنی اور سیانی" عورت بالے کے حصے میں آئی تھی۔

"میداں جو کہتی ہے سولہ آنے ٹھیک کہتی ہے!" یہ بالے کا اپنی سوہنی اور سیانی میداں کو خراج تحسین تھا۔

"میداں وہ بات کرتی ہے جہاں عام بندے کی عقل وی نئی پہنچی ہوتی!" یہ جملہ تو بالے کا تکیہ کلام تھا۔

"گل تے ٹھیک ہے میداں پائی...... پر......!"

کافی دیر سے خاموش اور فکروں میں گھری صغراں نے بمشکل پائے اور میداں کے سامنے زبان ہلانے کی مجال کی تھی۔

"پر...... کا کی مطلب ہے تیرا صغراں اس پر کا؟"

صغراں کے منہ سے لفظ "پر" غلطی سے کیا نکلا...... بس اب تو میداں کے ہاتھوں اس کی شامت ہی آ گئی تھی۔ صغراں کی بھی اور اس کے "پر" کی بھی۔

وہ تو عین بیچ میں سے اذان کی آواز نے کچھ دیر کے لیے میداں کو تقریر سے روک دیا جو "پر" پہ تھی۔ ورنہ میداں کو روکنا کوئی آسان کام نہ تھا۔

میداں نے اذان ختم ہونے کا انتظار بڑی بے چینی سے کیا تھا۔

جیسے ہی اذان ختم ہوئی پھر کیا تھا۔ میداں تھی اور صغراں کا "پر" اور پھر میداں نے وہ باتیں سنائیں کہ صغراں آنکھیں پھاڑ کر شوہر کو دیکھنے لگی کہ جیسے اس نے لفظ "پر" نہیں کہا، میداں کو کوئی گندی گالی دی ہو۔

"ہم نے جو کہنا تھا کہہ دیا صغری!" جھٹکے سے کھڑی میداں تھی تو ساتھ ہی "حکم کے غلام" بالے نے بھی کھڑا ہونے میں ایک پل کی بھی دیر نہ لگائی۔

"اپنے بندے دا دماغ دے نال اپنی پائی (بھابھی) دی باتوں پہ غور کرنا مجیدے۔" یہ ارشاد اقبال کا تھا۔

"اگر منظور ہے تو ٹھیک...... ورنہ......"

ورنہ کے بعد تو جیسے صغراں مجید کے پیچھے بچھی کھڑی ان سب کی باتیں سنتی کلثوم کی سانس ہی رک گئی تھی۔ جانے والے پیچھے رہ جانے والوں کو ادھیڑ بن میں پھنسا کر جا چکے تھے۔

☆☆☆

رات کا اندھیرا پھیل گیا تھا۔ سب اپنی اپنی چارپائیوں پر فکروں کی چادر اوڑھ کے لیٹ گئے تھے۔ آنکھیں بند تو کسی کی کھلی، دماغ سب کے جاگ رہے تھے۔

"فکریں جو نیک ہوں دماغ سے چمٹی ہوں تو بھلا سکون نیند کہاں آتی ہے!"

کروٹیں بدلتے کبھی ایک طرف، تو کبھی دوسری طرف۔ ان سب کے بدن تھکن سے چور ہونے لگے تھے۔ سوچیں مکڑیاں بنی ان کے ذہنوں میں جالے بنے لگی تھیں۔

مجید گاؤں کا معمولی سا مزارع تھا۔ جس کی آمدنی محدود اور وسائل بھی محدود تھے۔ دوسروں کی زمینوں پہ ہل چلاتے، اپنا پسینہ بہاتے، زندگی بھر مجید کی بس یہی خواہش دل میں رہی کہ اتنی جمع پونجی ہو جائے کہ ذاتی زمین ہی خرید لیتا۔ مگر یہ خواہش بس دل ہی میں رہی اور ساری زندگی دوسروں کی زمینوں پہ ہی پسینہ بہاتے گزر گئی تھی۔

صابر اور رب کی رضا پہ راضی مجید نے تھوڑی آمدنی میں زندگی گزارنے کا ڈھنگ سیکھ لیا۔ رب سوہنے کا بھی بڑا احسان رہا کہ نہ کبھی مجید بھوکے پیٹ سویا اور نہ ہی اس کے بیوی بچے۔

"رب سوہنے میں تیرے تھوڑے دیئے پہ راضی، بس تو کبھی کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانے نہ دینا۔"

ہر رات یہی دعا مانگ کر مجید سویا کرتا تھا۔ مگر آج بے چینی بے سکونی اور دماغ میں چلتی میداں اور بالے کی باتیں اسے سونے نہیں دے رہی تھیں۔ وہ اس مشکل سے نکلنے کے لیے ہزار راستے ڈھونڈ چکا تھا۔ مگر ہر راستہ اسے بند گلی میں لے جا رہا تھا۔ سوچوں نے اس کا دماغ بری طرح تھکا دیا تھا۔

☆☆☆

مجید کے ساتھ والی چارپائی پہ لیٹی سوچوں میں الجھی صغراں کی آنکھیں بھی آج رات نیند سے محروم رہی تھیں۔ صغراں نے تو رات کا کھانا بھی ٹھیک طرح سے نہ کھایا تھا۔ میداں اور بالے کی باتیں اس کی نیند اور بھوک دونوں اڑا لے گئی تھیں۔

گھر کے کل پانچ افراد تھے۔ مجید، صغراں اور ان دونوں کی بیٹیاں کلثوم، رخشی اور رگی۔ مجید جو کما کر لاتا، صغراں کے ہاتھ پہ لا کر رکھتا، اور ساتھ ہی بیوی کو بھی نصیحت کر دیتا کہ "آدھا خرچ کر لے، آدھا جوڑ لینا......"

صبر کی روٹی، شکر کے پانی کے ساتھ کھا کر رب کے حضور سر بسجود ہو جانے والی صغراں نے شوہر کی بات کو پلو سے باندھ لیا تھا۔

وہ جان گئی تھی اور سمجھ بھی گئی تھی کہ "آدھا جوڑ لینا" کا کیا مطلب تھا۔ جن کے گھروں میں رب سوہنا بیٹیاں دے، ان کی ماؤں کو یہ بات کھول کر سمجھانے کی ضرورت نہیں پڑتی۔

صغراں نے جوڑنا شروع کر دیا تھا۔ اور تین ٹرنک (صندوق) بھی خرید لیے تھے۔ آخر کل کو تین بیٹیاں بھی تو رخصت کرنی تھیں۔ خالی ہاتھ تو وداع نہیں کرنا تھا۔ کم یا زیادہ اپنی حیثیت کے مطابق "داج" (جہیز) تو بیٹیوں کو ہی دینا تھا۔ یہ تو رسم دنیا تھی۔ ہر صورت ادا کرنی تھی۔

گھر کا خرچ چلا کرنے کے بعد جو بچتا، صغراں جمع پونجی سے پورے انصاف کے ساتھ بیٹیوں کے جہیز کے لیے کوئی نہ کوئی چیز خرید کر تینوں ٹرنک میں رکھ کر تالا لگا دیا کرتی تھی۔

فیصلہ سناتے ہوئے لرز رہی تھی شدت جذبات سے اس کی رنگت دہکنے لگی تھی۔

"میرا ابا ساری زندگی اپنی ہڈیاں رگڑتا رہا ہے صرف اس لیے کہ ہمیں عزت سے رخصت کر دے۔ وہ اپنی حق حلال کی کمائی سے اتنا داج دے سکتا ہے۔ اگر تجھے منظور ہے تو ٹھیک "ورنہ"!" ٹھک سے کلثوم نے فون بند کرتے ہوئے سب کہہ دیا تھا اب آر ہو یا پار اسے کوئی فکر نہ تھی نہ ارشد کی اور نہ اس کی محبت کی۔ اگر فکر تھی تو صرف اپنے ماں باپ کی پریشانی کی جنھوں نے اپنا پیٹ کاٹ کر اس کا داج اپنی حیثیت سے بڑھ کر تیار کیا تھا جو میداں اور بالے کی ناک کے نیچے نہیں آرہا تھا۔

کلثوم نے یہ ساری الجھن اس کے حوالے کر دی تھی جس نے محبت کا دعویٰ کیا تھا۔ اب وہ جانے اس کی محبت جانے، کلثوم نے اپنا مقدمہ محبت کی عدالت میں بھیج دیا تھا۔

☆☆☆

ارشد کی بارات دھوم دھام کے ساتھ کلثوم کے گاؤں پہنچ گئی تھی ڈھول اور باجوں کے شور نے یہ خبر پورے گاؤں کو دی تھی۔ بارات آنے کی اطلاع ملی تو مجید اور صغراں کے دل کو چین ملا تھا۔ ورنہ تو دل اندیشوں کا شکار تھا کہ ماں باپ کی باتوں میں آ کر کہیں ارشد بھی ایک دم سے قدم پیچھے نہ ہٹالے اور "داج" کو بیچ میں لا کر عین نکاح کے وقت کوئی بڑا ہنگامہ ڈال کر مجید کی پگ گاؤں کی گلیوں میں نہ رول دے۔ مگر اندیشوں کا منہ تو ڈھول باجوں کی آواز سن کر ہی بند ہو گیا تھا۔

محبتوں کا دعوے دار بڑی شان کے ساتھ اپنے ماں باپ کے ہمراہ آ گیا تھا وہ اپنے دعوے پر پورا اترا تھا۔

"کلثوم تجھ سے سچی محبت کی ہے۔ کوئی رکاوٹ محبت کے بیچ میں آئی تو روند کر گزر جاؤں گا!"

ارشد ابھی بھی لاعلم تھا کہ اس کے ماں باپ نے "داج" کی وجہ سے کلثوم کے ماں باپ سے نہ صرف لڑائی جھگڑا کیا تھا بلکہ رشتہ ختم کرنے کا عندیہ بھی دے آئے تھے۔

"کوئی کمی نہیں ہے صغراں میرے پتر [illegible] کی"

یہ میداں کا فخر و غرور تھا۔ جو اول تو مجید جیسی حیثیت رکھنے والے سے رشتہ کرنا ہی نہیں چاہتی تھی۔ اپنے اکلوتے پتر کے لیے میداں کو ایک ایسی بہو کی تلاش تھی جو اتنا ڈھیروں داج لائے کہ اس کا گھر بھر جائے۔ میداں کے مطالبات آسمان سے باتیں کر رہے تھے۔ جس میں فریج، ٹی وی، ڈرائنگ روم کے علاوہ ایسی بہت سی چیزیں تھیں جو مجید اور صغراں نے خود بھی زندگی میں دیکھی نہ تھیں۔

"میداں پاپی! اس سب کی تو میری مجال [illegible] ہے!"

میداں اور بالے نے تو مجید کو فکر میں ڈال دیا تھا۔ مجید نے تو اپنی اوقات سے بڑھ کر بیٹی کو جہیز دینے کی کوشش کی تھی مگر زندگی میں پہلی بار اسے احساس ہوا تھا کہ بیٹی کا باپ جہیز کے معاملے میں کتنا مجبور ہوتا ہے۔

چند جوڑے، دو چار رضائیاں تھیں اور برتن سونے کی ہلکی سی لونگ کے ساتھ گلے کی زنجیر اور اس کے علاوہ ایک سونے کی انگوٹھی بس یہی کچھ تھا جو وہ دے سکا تھا۔ میداں تو اتنا چھوٹا جہیز دیکھ کر چپ کر گئی تھی۔

"لٹے منہ۔ لعنت ہو ایسے داج پہ!"

☆☆☆

میداں اور بالا کسی صورت کلثوم کو اپنی بہو بنانے کو تیار نہ تھے۔

تایا ہونے کے ناتے اگر بالے کا خون جوش مارنے لگتا تو میداں کے طعنے اسے فوراً ٹھنڈا کر دیتے "مجھے نہیں کرنا اپنے پتر کا ویاہ ایسے بھوکے ننگے رشتے داروں میں"

میداں کا تو خونی رشتہ تھا ہی نہیں۔ جو وہ کوئی لحاظ کرتی۔ اس کی باتوں نے بالے کا بھی خون سفید کر دیا تھا۔ [illegible] میں رشتہ ابا جی۔"

کلثوم کی محبت کا دعوے دار ڈٹ گیا تھا ارشد کو کلثوم سے بچپن کی محبت تھی۔ اس کے دل میں بچپن سے ہی کلثوم کا نام تھا ارشد کو ہمیشہ سے مجید چاچا کی حیثیت کا اندازہ رہا تھا مجید نے کتنی مشقت اور تنگ دستی کی زندگی گزاری تھی اور اب حق حلال کی کمائی سے بیٹی کا جہیز تیار کیا تھا۔

"ماں جی ایسی باتیں کریں تو وجہ سمجھ میں آتی ہے پر ابا جی تسی تے کجھ احساس کرو۔"

ارشد کو باپ پر حیرت ہو رہی تھی کہ کیسے ان کا خون سفید ہو گیا ہے نہ بھائی کی حیثیت کا خیال ہے نہ ہی اس کی پریشانی کا۔

"ارشد! اگر ایسے تیری ضد ہے۔ تے فیر تیرا ماں دا مرا منہ ویکھنا [illegible]"

میداں کی اکلوتے بیٹے کو یہ دھمکی گویا شطرنج کی آخری بازی تھی۔ میداں اور ارشد کے درمیان ٹھن گئی تھی دونوں کے درمیان بات چیت بند ہو گئی تھی میداں کسی صورت کلثوم کو لانے کے حق میں نہ تھی اور ارشد نے بھی کسی دوسرے سے شادی نہ کرنے کی قسم کھائی تھی۔ ماں پتر کی کشیدگی نے بالے کو پریشان کر دیا تھا خون نے جوش مارا اور بھائی کو بھائی کا خیال آنے لگا تھا "کیا اصل فساد کی جڑ "داج" ہے۔"

"او اتوں چھڈ وے ضد میداں"

روز روز کی کل کل سے اقبال تنگ آ گیا تھا اور دل کے کسی کونے میں یہ خیال بھی بیٹھ گیا تھا کہ بڑا بھائی ہونے کے ناتے چھوٹے بھائی کا خیال کرنا چاہیے۔

"کوئی غیر ایسا کرے تو سمجھ میں آتی ہے۔ مگر اپنا ہی کرے!"

خاندان برادری کے کچھ لوگوں نے بھی اقبال کو سمجھایا تھا کہ خون کے رشتے خوامخواہ کی باتوں کی وجہ سے توڑے نہیں جاتے۔ یہ کوئی عقل مندی نہیں۔

"جوان پتر سے کی ضد لگائی"

اقبال کو لگا تھا کہ جہیز کی وجہ سے کسی کی بیٹی کو انکار کرنا کتنی ذلت کی بات ہے وہ بھی "کسی" اپنے کو۔

سب کے کہنے پر اور اقبال کے سمجھانے پر میداں نے بیٹے کی ضد کے آگے ہتھیار تو ڈال دیے اور وہ بیٹے کی بارات لے کر تو آ گئی تھی مگر مجید اور صغراں کو منہ کے بگڑے تاثرات دکھانے نہیں بھولی تھی۔

"کھانے کا انتظام پورا ہے نا صغراں!" میداں نے دل کی کھولن اب کسی نہ کسی طرح تو نکالنی تھی۔

"میداں پاپی سارا انتظام پورا ہے فکر کی کوئی گل نہیں"

صغراں نے مسکراتے ہوئے ہمیشہ کی طرح نرمی سے جواب دیا تھا۔

وہ تو پہلے بھی میداں کی تلخ مزاجی کے باوجود دھیمی رہتی تھی اب تو وہ بیٹی کی ساس بھی تھی۔ اپنی حیثیت کے مطابق تو مجید نے کھانے کا اچھا انتظام کیا تھا۔

رب سوہنے نے بھی کھانے میں خوب برکت دی تھی۔ گاؤں کے زمیندار نے دو بوریاں چاول اور گھی کے دو کنستر بھجوائے تھے مجید اس کی زمینوں پر ہل جو چلاتا تھا۔

"کھاتے تے سواد" میداں نے صغراں کی خوش دلی پہ دل ہی دل میں زہر اگلا تھا اور سر جھٹکتے ہوئے منہ دوسری طرف پھیر لیا تھا۔

مگر ہر بات کو نظر انداز کر کے مجید اور صغراں کے دل کو یہی اطمینان بہت تھا کہ بیٹی کو عزت سے رخصت کر رہے تھے اور اپنی حیثیت کے مطابق جو دے سکتے تھے وہ "داج" بھی بیٹی کو دیا تھا۔ بیٹی کو خالی ہاتھ رخصت نہیں کیا تھا۔

☆☆

صوفیہ بٹ

احد

مکمل ناول

جاڑے کی رُت تھی۔

عمرکوٹ کے محل میں پابجولاں وہ راج کماری ماورائی طاقتوں کی یا غیر معمولی شکتیوں کی مالک ہرگز نہ تھی پھر بھی ہڈیوں میں گودا تک جما ڈالنے والی سردی میں سیڑھیوں پہ گھٹنوں پہ سر دھرے یوں بیٹھی تھی جیسے سردی، گرمی، پت جھڑ ساون اس کے لیے نہیں بنے یا وہ خود پتھر سے تراشی گئی کوئی مورت ہے۔ احساس سے عاری ہر شے سے بے نیاز۔

لاجونتی جو دیکھتی تو کہتی۔

"لو پھر پڑ گیا دورا اسے۔"

بسیرے کا پہر تھا۔ پنچھی گھروں کو لوٹ رہے تھے۔ اس سمتا ماں نے گھٹنوں پر سے سر اٹھایا اور چہرہ اوپر کر کے انہیں دیکھنے لگی۔

پنچھی اچھے تھے جو آزاد تھے۔ پورب پچھم اتر دکھن جس دشا چاہتے اڑان بھرتے۔ کسی محل کی دیوار نہ کسی قلعے کی فصیل ان کی پرواز میں روک تھی۔ مغرب ہونے کو تھی۔ اس اداس لڑکی نے سفید دوپٹے سے سر ڈھانپ لیا۔

آن بان شان میں وہ شہزادی تھی مگر ان کی طرح ریشم و حریر کے پیراہن زیب تن کرتی نہ ان جیسا سنگھار کرتی۔ وہ سادہ رہتی بہت سادہ۔ وہ زمین کے کسی دوسرے حصے پہ راج کر آئی تھی اسے اس راجدھانی کی چاہ نہ تھی۔ عمرکوٹ کے اس قلعے میں اس کا دم گھٹتا تھا جہاں ماروی کو اپنوں سے دور کرنے والے اپنے ہی تھے کوئی عمر سومرو نہ تھا۔

یہ محل جیسا گھر اسے ایک ایسا جزیرہ لگتا جہاں آکسیجن کا شدید قحط اور زہریلی گیسوں کی بہتات تھی۔ ہر احساس سے بے نیاز لڑکی کے حواس خمسہ بیدار ہونے لگے اور ہر سانس کے ساتھ اندر زہر ہی زہر بھرنے لگا۔ اس کی نگاہ بھٹکتی ہوئی دائیں کونے کی طرف جو چلی گئی تھی۔ اس سے سانس لینا محال ہوا۔ یہ کونہ ہی تو ہر زہر کا منبع تھا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ اس کونے میں ایسا بم گرائے کہ ہیروشیما اور ناگاساکی کا ذکر دنیا بھول جائے۔

اس کو سانس لینے میں شدید دقت ہونے لگی۔ اس نے اپنی گردن اور سینے کو مسلتے ہوئے اوپر آسمان کی طرف دیکھنے کی کوشش کی پر اسی پل ہوا اس کے نتھنوں سے ٹکرائی اور اس کی نس نس میں زہریلے دھویں بھر گئے۔

اسے لگا وہ حالت نزع میں جارہی ہے۔ موت قریب سے قریب تر ہوتی جارہی ہے۔ آنکھوں سے پانی بہنے لگا۔ وہ ایک دم اٹھی اور پوری قوت سے بھاگتی ہوئی کونے میں بنی سیڑھیوں کی طرف آئی اور سیڑھیاں پھلانگتی ہوئی چھت پر آگئی۔

اوپر پہنچ کر اس کے قدم سست پڑے اور نڈھال سی وسط میں آ کھڑی ہوئی۔ یہاں پہلے کی نسبت گھٹن کچھ کم تھی۔ اس نے پھر آسمان کی طرف نگاہ کی۔

اس کے لبوں سے حیات بن کر ایک لفظ ادا ہوا اور پھر ہر سانس کے ساتھ اسی نام کی مالا جپنے لگی۔ موت چپکے سے الٹے قدموں لوٹ گئی۔ سانس بحال ہونے لگی۔ چہرے پہ زندگی کی رونق سی چمکی۔

لاجونتی ہوتی تو اسے بتاتی۔

"مجھے دورہ نہیں پڑتا لاجونتی۔ مجھے عشق ہر شے سے بے نیاز کر دیتا ہے۔"

لاجونتی ہنستی چلی جاتی۔

عشق۔ عشق اس کے نزدیک اب کچرے، دھول، مٹی جیسے کئی لفظ کا مترادف لفظ تھا۔ وقت بھی کیا شے ہے، زندگی کی لغت میں پڑے ہر لفظ کی تعریف بدل کر رکھ دیتا ہے۔

لاجونتی اتنا ہنستی، اتنا ہنستی کہ اس کی آنکھوں میں پانی بھر جاتا۔ اور وہ تاسف سے اسے تکتے ہوئے کہتی۔

"تم جسے عشق کہتی ہو ناں لاجونتی، وہ دھول مٹی ہی ہے۔ اور میرا جو عشق ہے ناں۔ وہ۔ چھوڑو۔ تمہارے عشق کا میرے عشق سے کیا موازنہ۔"

☆☆☆

"اے بھین! اے اماں۔ رب تیرے بچوں کی حیاتی دے۔ میرے کو دس روپیہ دے، میں کچھ کھا لوں، بھکی (بھوکی) بیٹھی آں سویر کی۔"

گلابی میلی اوڑھنی والی بھکارن بغل میں چند ماہ کا بچہ بغل میں دبائے میل بھرے پوروں والا ہاتھ اس ماں کے سامنے پھیلائے کھڑی تھی جس کا بیمار بچہ رو رو کر ہلکان ہوا جاتا تھا۔ اور اس کی اپنی مت ماری ہوئی تھی۔

"معاف کر اماں۔" عورت کے پاس بھکارن پہ توجہ دینے کا وقت نہ تھا۔

"اے کرموں والی اماں! تیرے بار بچے جیویں۔ دے دے ناں اس بھاگن کو دس روپیہ۔"

جانے اس بھکارن کے منہ سے نکلنے والے یہ جملے رٹے رٹائے تھے یا واقعی دعاؤں کا خزینہ اس بخار میں تپتے بچے کی گلی آنتوں کی جا کی بے حال ماں کی نذر کر رہی تھی۔ وہ عورت تو بچہ سنبھالنے میں پوری بھی اس کی کہاں سن رہی تھی۔ مگر سونے کے چھلے سے سجا ایک دوسرا ہاتھ اپنے بٹوے کی طرف بڑھا۔ بٹوے میں سے ایک لال نوٹ نکلا اور بھکارن کی پھیلی ہتھیلی پر جا پہنچا۔ اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ اس کی زندگی میں لال نوٹ دینے والے بہت کم آئے تھے۔ اس نے سفید چکن کے سوٹ والی اس خوب صورت عورت کو دیکھا جس نے کشمیری کڑھائی کی ہلکے آسمانی رنگ کی شال اوڑھ رکھی تھی۔ بھکارن آنکھوں میں چمک لیے جلدی سے اسپتال سے باہر نکلی اور اطلاع عام کر دی۔ کچھ دیر بعد چھوٹے بڑے کالے گورے اور میلے کچیلے ہاتھ اس کی طرف

مردوں کی طرف بیٹھے چوہدری ہمایوں سلیمان نے دیکھا کہ ان کے بٹوے سے نوٹ نکلتے چلے گئے۔ پچاس، سو کے اور ہزار کے وہ نوٹ بھی جس سے انہوں نے فاطمہ کے لیے ... ولی کے لیے کھلونے، ... کے لیے نئی گیند، گل چہرہ کے لیے کچھ کلپس اور بنٹو کے لیے سنہری ستاروں والی چپل لینی تھی جس کی ضد اس نے جاتے جاتے گیٹ پہ کی تھی۔

"ماں! اسپیشل جا رہی ہیں عید کی شاپنگ کرتے ہیں۔" اس نے مومنہ کو گھورتے ہوئے کہا تھا۔

"جب تمہارے بہن بھائی فرمائشیں کر رہے تھے تب تو یاد نہیں آیا۔"

"وہ تو چھوٹے ہیں۔ عقل تو بڑے کریں ناں۔"

شرمندہ ہونے والوں میں سے تو وہ نہ تھا مگر ہوا یہ کہ اسی وقت امی کو بھی کچھ یاد آ گیا تھا، وہ ان کا بوٹیک والے شاپر میں ڈالے چلی آ گئیں۔

"بابا! شہر جا رہی ہیں تو میرے قمیص اور دوپٹے کی لیس لیتی آئیے گا، نہ زیادہ چوڑی ہو نہ زیادہ پتلی۔ رنگ نہ زیادہ گہرے ہوں نہ ہلکے۔ قیمت مناسب۔"

رحیمہ احمد نے چادر اوڑھتے ہوئے ہدایات سنتے ہوئے وہ شاپر تھام لیا تھا۔ مومنہ نے جتاتی نظروں سے ہمایوں کو دیکھا تو وہ بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے ڈھٹائی سے مسکرا دیا۔

"کتنے دن سے کہہ رہی ہوں مجھے لے چلیے شہر، اپنی ماں کی دفعہ تو مصروفیات یاد آ جاتی ہیں۔" آپ یہ شکوہ کتنا انداز میں کہہ رہی تھیں۔

رحیمہ احمد نے خواہ مخواہ شرمندہ ہوتے ہوئے سوچ لیا کہ شہر کے سب کام نپٹا کر آئیں گی۔ انہیں اپنی بیماری بھولنے لگی۔ ان کے بٹوے میں کتنے پیسے رکھے ہیں، انہوں نے یہ یاد کرنے کی کوشش بھی نہ کی۔ لوٹا پیسے بھی چھپنا نکالنے یہ سوچ کر۔

آتے ہیں۔ میرے شوہر اور بیٹے کی خون پسینے کی کمائی ہی تو ہے۔"

ہمایوں نے جلدی سے انہیں موٹر سائیکل کے پیچھے بٹھایا، مبادا کسی اور کو کچھ یاد آ جائے اور ماں بھلا انکار کرنے والوں میں سے کب تھیں۔ اب وہ غور سے ان کا چہرہ دیکھ رہا تھا جو پہلے ہاتھوں پہ نوٹ رکھتے ہوئے غالباً ساری فہرست بھول چکی تھیں جب کہ اسے خوب اندازہ تھا کہ امی سے لے کر ولی تک کسی ایک کا کام کیے بنا ماں واپس گھر جانے والی نہیں ہیں۔ اور تمام خریداری کرتے ہوئے نوٹ اسی کی جیب سے نکلنے والے تھے۔ اس کی بچت بچنے والی نہ تھی۔

تین چار ہزار بھی نکل جاتے تو نیا موبائل آنے والا نہ تھا اور پرانے موبائل کی حالت ایسی تھی کہ اس کے علاوہ کسی اور کے پاس یہ ہنر نہ تھا کہ اس کے موبائل کو آپریٹ کر سکتا۔

"نوادرات کی قدر کرنی چاہیے۔" اس نے جیب میں پڑے موبائل کو تھپتھپایا اور عقیدت سے ماں کی طرف دیکھا۔

بچوں کی زندگی اور ان کی لمبی حیاتی کے لیے اس عورت نے اپنا بٹوہ خالی کر ڈالا تھا جس کی نظیر کوکھ میں بھی تخلیق نہ ہوئی تھی۔

☆☆☆

عمر کوٹ کا یہ محلوں جیسا گھر اس کے لیے قبر تھا۔ تنگ و تاریک قبر۔۔ جہاں سانپ اور بچھو پھنکارتے تھے۔

ہر سال کی طرح اس محل کو سجایا سنوارا جا رہا تھا۔ اس کے کمرے میں بھی پینٹ ہو رہا تھا۔ نیا فرنیچر اور نئے پردے بھی آ گئے تھے۔ ممی نے کراچی سے منگوائے تھے کیٹ لاگز وہ دن ہی اسے دے رہے تھے کہ وہ ان میں سے کچھ پسند کرے۔ اس نے انہیں چھوا تک نہ تھا۔ تیسرے دن جب وہ اس پوچھا ہونے لگیں تو وہ چپ چاپ بے تاثر انداز میں ان کا چہرہ دیکھتی رہی۔ اپنے تمام لفظوں کو ضائع ہوتے دیکھ کر وہ اٹھنے لگیں جب انہیں اس کی آواز سنائی دی تھی۔

ماں اور بچے کے ملن اور محبت کا یہ منظر ان کے لیے جس قدر مسرت انگیز تھا، اسی قدر اداسی کا باعث بنتا تھا۔

"اس دفعہ بھنڈیوں کا ریٹ چڑھا ہے۔ دعا کریں ماں، ہماری بھنڈی تیار ہونے تک ریٹ یونہی رہے۔" ہمایوں بالٹی اٹھا کر ان کی قریب آتے ہوئے بولا۔

"اللہ سب پر فضل کرے۔"

"او ماں! پلیز خاص الخاص چوہدری ہمایوں سلیمان کے لیے نام لے کر دعا کریں، ورنہ آپ کی اجتماعی دعا لگ کسی اور کو جاتی ہے۔ بھنڈی اترے تو پتا چلے کہ ریٹ گر گیا۔ دعا کھانے والے کو لگ گئی۔ سستی بھنڈیاں کھا کھا کر سیر ہو گیا۔"

ہمایوں نے دہائی دی تو انہوں نے دھیما سا مسکراتے ہوئے اس کے ہاتھ سے بالٹی لے کر بھینس کے پاس رکھی اور بچھڑے کی پشت پہ ہاتھ پھیرنے لگیں۔ بچھڑے کا پیٹ ابھی بھرا نہ تھا غالباً۔ اس نے تھن سے منہ نہ ہٹایا تھا۔ انہوں نے اس کو زبردستی ہٹانے کی کوشش نہ کی جب تک کہ وہ خود ہی رج کر پیچھے نہ ہوا۔

"سارا دودھ تے وچھے کو چونگا دیتی ایں ریہہ۔ پالی (سارا دودھ تو بچھڑے کو پلا دیتی ہیں رحیمہ بھابھی)۔" آپا فردوس کو پرانی شکایت تھی ان سے۔

بچہ اب ماں سے لاڈ کرنے لگا تھا اور وہ بالٹی میں پڑے پانی سے اس کے تھن دھونے لگیں۔ بھینس نے بنا کسی احتجاج کے دوسری بھینسوں کے مقابلے میں زیادہ دودھ دیا۔

"اسلام علیکم۔" چار خانوں کے کھیس جیسی چادر کی بکل مارے کر ورے پھوپھا صادق بیرونی دروازے سے اندر داخل ہوئے تھے۔ ان کے مویشی بھی اسی احاطے میں بندھے تھے۔ ان کی برسوں سے یہ روٹین تھی۔ ہاتھ میں کنڈل لیے نمودار ہوتے اور اپنی بھینسوں میں سے ایک کی طرف بڑھ جاتے۔ بقول ہمایوں کے "صبح صادق کی طرح پھوپھا صادق بھی طلوع ہوتے تھے۔"

رحیمہ احمد سر پہ چادر صحیح کرتے ہوئے سلام کا جواب دے کر نند کا حال پوچھنے لگیں جو جوڑوں کے درد میں مبتلا تھیں۔

جب تک ہمایوں نے دودھ سے بھری تینوں کنڈلیں لا کر باورچی خانے تک پہنچائیں، بقایا افراد خانہ جاگ چکے تھے۔ رفعت جہاں نے رات پھر آٹا گوندھ لیا تھا۔ اب جمے ہوئے دہی کی اوپری بالائی والی سطح احتیاط کے ساتھ بڑے سارے چمچ سے اتار اتار کر چاٹی میں ڈال رہی تھیں۔ ساتھ ہی ایک چولہے پہ ساگ تڑکے کے لیے رکھ دیا تھا۔ سارے میں ادرک اور ہرے لہسن کی مہک پھیلی تھی۔

رحیمہ احمد اب صحن والے چولہے کے آگے آ بیٹھیں۔

دیسی گھی کے پراٹھے، مکھن کے تہہ در تہہ پراٹھے، سوکھی روٹی، مکھن سے چپڑی روٹی۔ گھر کے ہر فرد کی پسند جدا جدا۔

اتنے افراد کا ناشتہ بنانا دونوں دیورانی جیٹھانی کا کام۔ برسوں سے وہ خوش اسلوبی سے یہ کام کیے جاتیں۔ جس دن کوئی ایک خاص طور پر رحیمہ بیمار پڑ جاتیں یا میکے چلی جاتیں تو دیورانیوں کی سمجھ میں نہ آتا کہ کیسے گھر کے مردوں کو کام پہ اور بچوں کو اسکول کالج وقت پہ ناشتہ کروا کے بھیجیں۔

"اٹھو۔ جلدی کرو عروہ۔" اندر کمرے میں عروہ گرم بستر چھوڑنے کو تیار نہ تھی اور ارم اسے ڈانٹ رہی تھی۔

پراٹھا پلٹتے ہوئے رحیمہ احمد کی آنکھوں کے سامنے بہت سارے مناظر آئے۔ ہر منظر میں وہ چہرہ دکھائی دیا۔ پراٹھے سے اٹھتا ہوا دھواں وجہ بنا یا پھر یادیں کہ انہیں سامنے چوکی پہ بیٹھ کر ناشتا کرتا ہوا یونیفارم میں ملبوس ایک دھندلا سا دکھائی دینے لگا۔

☆☆☆

رات چاندنی تھی۔ ہر منظر پہ، ہر شے پہ دودھیا سی تہہ دیکھنے والے کی آنکھ کو بھلی محسوس ہوتی۔ رات سرد ہونے کے باوجود رحیمہ احمد نماز عشاء ادا کر کے اپنی صحن میں جائے نماز پہ بیٹھی رہیں۔

گرمیوں میں یہاں چارپائیاں اور پھر دانیاں بھی نظر آتی تھیں۔ کچھ افراد تو چارپائیوں پہ صحن میں ہوتے ہی تھے اور کچھ رات گئے نکل چلے جاتے ہونے کی صورت میں باہر آنے پہ مجبور ہو جاتے تھے۔ سردیوں میں یہاں صرف دور گیٹ کے پاس ان کے دیور چوہدری حیدر یعقوب کی چارپائی نظر آتی تھی جو سردی میں بھی یہیں سوتے تھے۔ مال مویشی کی حفاظت کے لیے مستقل ایک بندہ رکھنے کے باوجود وہ رات میں دو ایک بار اٹھ کر ڈنگروں کو دیکھنے ضرور جاتے۔

آج ان کی چارپائی پہ بستر نہیں بچھا ہوا تھا کیونکہ آج وارہ (پانی کی باری) تھا۔ وہ وہیں زمینوں پہ تھے۔ جب سے ہمایوں نے زمین داری شروع کی تھی، وارے پہ وہی جاتا تھا۔ باپ اور تایا کے کندھوں پہ سے بہت سا بوجھ اتار کر اپنی کمر پہ لاد لیا تھا۔ وہ اس گھر کا سب سے ذمہ دار لڑکا تھا۔

آج کل گنے کا سیزن تھا۔ وہ کماد لے کر مل گیا ہوا تھا اور چوہدری صاحب وارے پہ۔ کنال بھر کا صحن سونا سونا تھا۔

رات کے اس پہر وہ تھیں اور یادیں تھیں۔ یادیں جو دن بھر سینے میں چھپائے رکھتی تھیں، اچانک ہی اک آہ کی صورت خارج ہوتیں اور ہر سو پھیل جاتیں۔

آج کچھ زیادہ ہی ٹوٹ کر اس کی یاد آئی۔ عروہ اور حریم عمر کے اسی دور میں تھیں۔ وہ کوئی نہ کوئی ایسی بات کر دیتی تھیں جو وہ بیٹھے بیٹھے کئی سال پیچھے چلی جاتیں۔ آج عروہ کچھ کپڑے کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے لے کر ارم کے پیچھے گھومتی رہی تھی کہ وہ اس کی گڑیا کے لیے فراک اور ٹراؤزر شرٹ سی دے۔

رحیمہ احمد کی نگاہ میں وہ چھوٹی چھوٹی فراکیں گھوم گئی تھیں، جو انہوں نے بھی ایسی ہی فرمائشوں پہ سی کر دی تھیں۔ ارم مصروف تھی، اس نے عروہ کو جھڑک کر پرے ہٹا دیا تھا۔ وہ رونے لگی تھی۔

"ادھر آؤ میری بچی۔ ماما کام کر رہی ہیں نا بیٹا۔ لاؤ میں سی دیتی ہوں۔" انہوں نے عروہ کو اپنے پاس بلایا اور اپنی ادھ کی تسبیح چھوڑ کر اس کی گڑیا کے لیے کپڑے سینے لگیں۔ سینے سے آہ نکلی جاتی، ہاتھ چلتا جاتا اور آنکھ بھری جاتی۔

عروہ کی گڑیا کے کپڑے سل گئے، اس نے پہن بھی لیے، اور شام تک ایک ادھڑ بھی گیا، اسے پھینک بھی دیا گیا۔ اور یادوں کی صورت ان کے زخم جو ادھڑنے پہ آئے تو گھائل ہو گئیں مگر انہیں پھینک نہیں سکتی تھیں۔ وہ یادیں تو متاع حیات تھیں۔

دن بھر خود کو بری طرح مصروف رکھا تا کہ رات کو تھک کر گہری نیند آئے۔ من بھر گندم دھو ڈالی۔ آسیہ کو دو دن سے بخار تھا، ان کے حصے کا سارا کام نمٹایا۔ انجمن آج آئی نہیں تھی تو گل چہرہ اور بابر کا یونیفارم دھونے لگیں اور پھر مشین میں پڑے سارے ہی کپڑے دھو ڈالے۔ شام کو مویشیوں کے احاطے میں جا کر گوری کو بہت دیر تک پیار کرتی رہیں۔ بچوں والی بھینسوں کو کھل بھگو دیا۔ ہر کھرلی میں پٹھے خود ڈالے۔ اتنے انتظامات کرنے کے بعد بھی نیند نہ آئی۔

وہ بھی چاندنی رات تھی۔ پوہ کے دن تھے۔ سرد بہت سرد۔ اس رات کا ہر منظر واضح تھا۔ سات سال، سات سال پورے ہوئے، دن اوپر گزر گئے، پھر بھی اس رات کا ہر منظر اپنی تمام تر جزئیات کے ساتھ یاد تھا۔

اس چہرے پہ پھیلا خوف، ان آنکھوں کی التجا، وہ کپکپاتے ہونٹ۔

انہوں نے اس منظر کو بھلانے کے لیے اپنا دھیان ہٹانے کے لیے نگاہوں کو بھٹکایا۔ سامنے دھریک پہ لگی پینگ ساکت تھی۔ پھر انہیں وہ ہلتی محسوس ہوئی، اور پھر اس پہ بیٹھی وہ نظر آئی جس سے تعلق اب خیالوں خوابوں تک کا رہ گیا تھا۔ جو اتنی بڑی دنیا میں کھو گئی تھی اور کہیں ملتی نہ تھی۔ دنیا

کے اس میلے میں اس کی انگلی بھی تو خود انہوں نے ہی چھوڑی تھی ناں۔ اب وہ کیسے ملتی۔

چاندنی رات میں ایک گاڑی دور۔ بہت دور ہوتی جا رہی تھی۔ اس کے پیچھے گاڑیوں کی قطار بھی تھی مگر ان کی آنکھیں صرف اسی سیاہ گاڑی کو تک رہی تھیں جس کے شیشے سے ایک چہرہ چپکا ہوا تھا اور اس چہرے پہ تھیں وہ آنکھیں اور آنکھوں میں آنسو۔

اُف۔ وہ منظر۔ وہ قیامت سے لمحے۔

تکلیف حد سے بڑھنے لگی تو رحیمہ احمد بے اختیار سجدے میں گرتے ہوئے گڑگڑا ئیں۔

"میرے رب! مجھے صبر دے۔ مجھے امت الصبور بنا۔ مجھے امت الشکور بنا۔"

☆☆☆

ملیر کی ماروی اپنے دیس بھاگ جانا چاہتی تھی مگر وہ کیسے عمر کوٹ کے اونچی فصیل والے اس قلعے سے نکلتی۔

کئی برس وہ سوچتی رہی، راہیں کھوجتی رہی مگر ناکام رہی اور پھر ایسا ہوا کہ اسے یہ موقع مل گیا۔

ماروی اپنے ملیر تو نہ گئی مگر اتنا ہوا کہ چار ماہ پہلے اس زندان میں ایک روزن دکھائی دیا تھا۔ یہ روزن اس کے بائیں ہاتھ کی تیسری انگلی میں پڑی، ہیرے کی انگوٹھی کی چوڑیڑھ سال سے وہ اس لیے پہنے رکھتی تھی کہ بھاؤ کا حکم تھا۔ اس انگوٹھی سے اس کا کوئی جذباتی ربط نہ تھا۔ چار ماہ پہلے اسے اس انگوٹھی کی قدر ہوئی۔ وہ پہلی بار اپنے منگیتر کی ممنون ہوئی۔ پہلی بار اسے احساس ہوا کہ ان چاہے شخص سے منگنی بھی سود مند ثابت ہو سکتی ہے۔

فارم جمع کروانے سے لے کر انٹری ٹیسٹ تک، پھر رزلٹ سے لے کر داخلہ ہونے تک انتظار نے سولی چڑھائے رکھا۔ اتنے دن اور..... بس اتنے دن اور ..... سوتے جاگتے اور اس کا کاؤنٹ ڈاؤن جاری رہتا۔

جانے سے پہلے بھاؤ نے اسے بلا کر ہدایات بلکہ احکامات کا ایک پتا (صفحہ) پڑھا دیا تھا۔ اس کے پاس "شیڈز" کی کوئی فہرست نہ تھی۔ وہ دوسروں کے لیے صرف "ہٹلر" کی زبان جانتا تھا، ڈو اور ڈونٹ کی بولی بولتا تھا۔

"تمہیں یہ کرنا ہے، تمہیں وہ کرنا ہے۔"

بھاؤ بولتا رہا اور وہ سر جھکائے سنتی رہی۔ اپنی بھابی کی طرح وہ بھی کوئی زیادہ فرماں بردار نہ تھی مگر بہت پہلے یہ جان چکی تھی کہ سامنے بیٹھے لال آنکھوں والے مرد کے سامنے چپ رہنا بہتر ہے۔ منہ کھولنے کی صورت میں لفظوں کی قیمت ادا کرنی پڑ سکتی ہے۔ ماتھا پھٹ سکتا ہے، رخساروں کی ہڈی پہ نیل پڑ سکتا ہے، ہونٹوں سے خون نکل سکتا ہے۔ اور اور بازو بھی ٹوٹ سکتا ہے۔ اس لیے چپ رہی، بس سنتی رہی۔

کمرے میں واپس آئی تو ممی نصیحتوں کی پوری کتاب کھولے بیٹھی تھیں۔

"اب آپ تو میری جان چھوڑ دیں پلیز۔ آپ کا بیٹا کافی نہیں۔" اس نے ممی کے آگے ہاتھ جوڑے۔ ایسے موقع پر ممی چپ سی ہو جاتی تھیں مگر آج پورا انصاب پڑھ کر دم لیا۔ وہ پھر نہیں بولی۔ لب بھینچے سنتی رہی۔

"چار دن کی تو بات ہے پھر نہ کسی کے حکم پہ صبح ہوگی نہ کسی کی ہدایت پہ رات۔" وہ ممی کے جلتے ہوئے لبوں کو دیکھ کر سوچتی رہی مگر دو دن بعد یہ خوش فہمی بھی ہوا ہوئی۔

صیاد نے پر کتر کر پنجرہ کھولا تھا۔ وہ ادھر سے ادھر چکر کاٹتے ہوئے کھولتی رہی۔ تلملاتے ہوئے مٹھیاں بھینچتی رہی، کھولتی رہی اور جیسے ہی وہ نظر آیا۔ اس کے عین سامنے آ کھڑی ہوئی۔ وہ جو اپنے دھیان میں جا رہا تھا۔ ٹھٹک کر رکا اور اسے سامنے پا کر ہلکا سا مسکرایا۔ بخار کی حالت میں بھی چہرے پہ بشاشت لوٹ آئی۔

"تم۔ تم میری جان چھوڑ کیوں نہیں دیتے۔" وہ تلملا رہی تھی۔

وہ مسکراتا رہا اور سوچتا رہا۔

"ہیلا رنگ اس لڑکی پہ کتنا اچھا لگتا ہے۔"

"تمہارا ہے تمہیں۔ مجھے۔ مجھے تم اتنے ہی برے لگتے ہو جتنے اس گھر کے لوگ۔" اس کی سیاہ آنکھوں سے شعلے لپک رہے تھے۔

وہ مسکراتا رہا اور سوچتا رہا۔

"سیاہ بالوں کی سادہ سی چٹیا بنا کر جب آگے ڈال دیتی ہے تو کتنی اچھی لگتی ہے۔"

"تم تو لاء پڑھنے والے تھے ناں۔ کچھ ایسے ہی ارادے بیان کر رہے تھے ناں ممی کے سامنے۔ اب راتوں رات کیمسٹری کا دورہ کیوں پڑ گیا؟ تم بھی انٹری ٹیسٹ میں اپیر ہوئے تھے۔ مجھے بتایا کیوں نہیں؟"

وہ مسکراتا رہا اور سوچتا رہا۔

"اس کی سیاہ آنکھوں میں اپنا عکس دیکھنا کتنا اچھا لگتا ہے۔"

"کہاں گئے تمہارے خواب۔ تمہارے شوق؟" وہ چبھتی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

اس کی مسکراہٹ غائب ہوئی اور وہ گہرا سانس لے کر رہ گیا۔

"غلاموں کے شوق، خواب کچھ بھی نہیں ہوتے۔" اس نے نظریں جھکا کر دھیمی آواز میں کہا۔ اس کا عکس اب یاسمین کے نینوں کے بجائے سنگ مرمر کے شفاف فرش پہ جھلملا رہا تھا۔

وہ ایک دم ٹھنڈی پڑ گئی، اسے اپنے سامنے کھڑا اونچا لمبا، چوڑے شانوں والا کسرتی جسم کا مالک یہ خوب صورت مرد اتنا ہی بے بس نظر آیا جتنی وہ خود تھی۔

"خواب دیکھنے اور شوق پالنے کا حق تو اکثر مالکوں کے پاس بھی نہیں ہوتا۔" غور سے اسے دیکھتے ہوئے اس نے سوچا تھا۔

"تم۔ تم واپس چلے جاؤ۔ اپنے گوٹھ (گاؤں) اپنے گھر۔ اپنے ماں باپ کے پاس۔" اسے مسئلے کا ایک اور حل نظر آیا۔

مہران کا حسن اداس ہوا۔ چہرے پہ حزن کی کیفیت آٹھہری۔ جانا اتنا آسان ہوتا تو اسے تیز بخار میں ساری رات خوار ہونے کے بجائے ماں کی گود میں سر رکھ کر پڑا ہوتا۔

"کوٹھ نہیں جا سکتے۔ اپنے ماں باپ کے پاس نہیں جا سکتے۔ مر تو سکتے ہو ناں۔" وہ پھنکاری۔

وہ پھر مسکرا اٹھا اور سوچنے لگا۔

"غصے میں تو اور بھی اچھی لگتی ہے۔"

☆☆☆

"اسود کے آنے کی خوشی تائی سے زیادہ انجمن کے چہرے پہ نظر آ رہی ہے، ہے کہ نہیں؟" ہمایوں نے مالٹا چھیلتے ہوئے فاطمہ سے تائید چاہی تو وہ مسکرا انجمن کو دیکھنے لگی جو "پی دشمن میں" ماہی آوے گا "گنگناتے ہوئے فرش پہ پوچا لگا رہی تھی۔

"انجمن! تم پوچیاں گاؤ۔ ماہی آوے گا تے گٹ پوچیاں لاواں گی" مالٹے کی پھانک منہ میں رکھتے ہوئے ہمایوں نے مشورہ دیا تو انجمن شرما سی گئی۔ انگلی منہ میں داب کر اور ویٹنگ کا دل بھی چاہا مگر جلد یاد آ گیا کہ ہاتھ میں فینائل والا پوچا پکڑ رکھا ہے۔

"کتنے بجے شہر آنے کو کہا ہے تمہیں اسود نے؟" رحیمہ احمد نے کمرے سے باہر آتے ہوئے پوچھا۔ رت جگے کی سرخی ابھی بھی آنکھوں میں نمایاں تھی۔ جس کی وجہ سب کو نزلہ زکام بتائی گئی۔ یہ اور بات کہ سب ان کے رت جگوں اور ان کے اندر لگی رہنے والی ہر دم کی آہ و بکا سے واقف تھے۔

"چھ بجے۔" ہمایوں ایک دم سیدھا ہو بیٹھا۔

"تم پانچ بجے پہنچ جانا۔" انہوں نے تاکید کی تو ہمایوں نے بے اختیار امڈ آنے والی مسکراہٹ کو چھپانے کی کوشش کی۔ اسود نے اسے پانچ بجے ہی شہر پہنچنے کو کہا تھا۔ اگر ماں کو صحیح وقت بتاتا تو وہ اسے چار بجے بس اسٹاپ پہ پہنچا کر دم لیتیں۔

"مرغی ذبح کر دینا جانے سے پہلے۔" ان کی ہدایت پہ ہمایوں نے تابعداری سے سر ہلایا۔

"ہم نے نہیں کھانی دیسی مرغی۔" مومنہ اسود کے استری شدہ کپڑے اس کی الماری میں ہینگ کرنے جا رہی تھی، مرغی کا نام سنتے ہی احتجاج پیش کیا۔

"تم کچھ اور کھا لینا۔" رحیمہ احمد نے نرمی سے کہا۔

"ہاں کچھ اور کھا لوں۔ یعنی کہ ساگ کھا لوں۔ ساری سردیاں ساگ ہی کھاتی رہوں۔"

"نعمتوں کی قدر نہ کرنا بھی۔" سنہری نرم گرم سی دھوپ میں بیٹھی رفعت جہاں نے اون سلائیوں میں الجھے الجھے وہیں سے ڈانٹا تو اس نے سر جھٹکا۔

"امی! صبح ناشتے میں ساگ کھایا ہے ناں میں نے۔ اب پھر نہیں کھاؤں گی اور پلیز آپ یہ مت کہیے گا کہ اپنے لیے انڈا بنا لوں۔" امی کو بولنے کے لیے ہونٹ کھولتے دیکھ کر اگلے آپشن کو بھی رد کیا۔

"کلیجہ پکا لو پھر میرا۔" امی کے تو آج تک سمجھ نہ پائی کہ ان کی یہ اولاد کس پہ چلی گئی۔ بہت سوچنے پہ یہی سمجھ میں آتا تھا کہ دادکوں (ددھیال) پہ ہی گئی ہے۔

مومنہ پاؤں پٹختے ہوئے کمرے میں چلی گئی۔ اب امی نے اس سے زیادہ توجہ سویٹر کے نمونے کو دینی مناسب جانی۔

اس کا تو روز کا کام یہی تھا۔ جو پکا لو، اس نے نہیں کھانا۔

ہمایوں بے چین سا ادھر ادھر پھرا۔ دوپہر کا کھانا بھی اس نے نہیں کھایا۔ حالانکہ رحیمہ احمد نے اس کے لیے مٹر پلاؤ بنایا تھا۔ یہ وہ ڈش تھی جو وہ لال مرچوں والے پلاؤ والے، رائتہ اور سلاد کے ساتھ بہت شوق سے کھایا کرتی تھی۔ چار دفعہ بلانے کے بعد جب "کمرے" سے باہر نکلی تو اتنے سارے افراد پہ مشتمل اس گھرانے میں پلاؤ کہاں گیا، پتا ہی نہ چلا۔ پھر پھوپھو فردوس کے اطہر، مظہر اور مہرتاب بھی پلاؤ کی خوشبو پا کر آ گئے تھے۔

رحیمہ احمد نے مومنہ کے لیے سب سے پہلے الگ سے جو ایک پلیٹ نکال کر رکھی تھی، اس نے وہ پلاؤ بھی نہ کھایا۔

جو ڈش خاص طور پر صرف اس کے لیے بنی، وہ اس کے کھانے سے پہلے سب نے کھا لی اور اس کے لیے بس یہ ایک پلیٹ۔

نیا احتجاج شروع ہوا اور وہ پھر سے کمرے میں گم۔ سب کو عادت سی تھی یہ منظر دیکھنے کی سو اس لیے اطمینان سے کھاتے رہے۔

"باجی! آپ فکر مند نہ ہوں۔ خود ہی جب بھوک لگے گی تو کھا لے گی۔" رفعت جہاں نے روٹی کے اوپر ساگ اور ساگ کے اوپر مکھن کی ڈلی رکھ کر کھاتے ہوئے رحیمہ احمد کو تسلی دی مگر وہ بے چین رہیں۔

آسیہ نے پلاؤ، رائتہ اور سلاد ایک ٹرے میں سجا کر مومنہ اور فاطمہ کے مشترکہ کمرے کی طرف جانے لگیں تو فاطمہ نے ٹرے ان کے ہاتھ سے لی۔

"اس کے تو روز کے نخرے ہیں۔ آپ کیوں پریشان ہو رہی ہیں۔ آپ کھانا کھائیں ماں۔ میں اسے دے کر آتی ہوں۔" کمرے میں آ کر اس نے مومنہ کی خوب کلاس لی۔ وہ منہ دوسری طرف کیے پڑی رہی۔

"کھانا کھاؤ۔ میں کہہ رہی ہوں۔ تمہاری وجہ سے ماں بھی کھانا نہیں کھا رہیں۔" فاطمہ نے اسے ڈھیٹ بنے دیکھ کر جھنجلا کر کہا۔

"تمہیں پرواہ ہے ناں ماں کی تو تم کھا لو۔"

"ہاں مجھے پرواہ ہے۔ جو میری پروا کرتے ہیں، میں ان کی پروا کرتی ہوں۔ کھانا ہے تو کھاؤ ورنہ میں ولی کو دینے جا رہی ہوں پلاؤ۔" فاطمہ نے تنگ آ کر دھمکی دی۔

"دے دی ہو تو دو۔ اس گھر میں میرے لیے بنا ہی کیا ہے۔ جنجال پورہ میں سو ہاتھ پہلے آگے آ جاتے ہیں۔" جوائنٹ فیملی سسٹم اس گھر میں سب سے زیادہ اسے برا لگتا تھا۔

"مل جل کر رہنے اور کھانے سے برکت آتی ہے۔" فاطمہ نے نرمی سے سمجھانا چاہا۔

"تم دفع ہو جاؤ یہاں سے۔" وہ چلائی تو فاطمہ ٹرے اٹھا کر کمرے سے باہر چلی آئی۔

ایک اور بھی بندہ تھا جسے اس کے کھانے پینے کی فکر رہتی تھی۔ وہ تھا چوہدری ہمایوں سلیمان۔ بس اسٹاپ سے اسود کو لینے کے بعد وہ بیکری سے سموسے اور چکن رولز پیک کروائے اور آ کر فاطمہ کے ہاتھ میں شاپر پکڑایا۔ بچے اسود کے گرد جمع تھے ورنہ شاپر اس کے ہاتھ میں دیکھ کر کچن میں جانے سے پہلے سموسے، رولز اور چٹنی پلیٹوں میں سجنے تک وہ فاطمہ کو پاگل کر دیتے۔

"پہلے جو وہ اپنے لیے نکالے، اسے دو۔ بعد میں سب میں بانٹنا۔" ہمایوں کی آہستہ آواز میں کی گئی اس نصیحت پہ فاطمہ نے اسے گھورا اور پھر دور اسود کے پاس کھڑی مومنہ کو۔

"تم نے اور ماں نے ہی خراب کی ہیں اس کی عادتیں۔"

وہ ہنس کر بڑبڑایا۔

"محبت کرنے والے ہی خراب کرتے ہیں عادتیں۔"

☆☆☆

چوہدری ہاؤس کے سرمئی گیٹ والے بڑے سے گھر میں رات کے اس پہر چھائی خاموشی میں دور چارپائی پہ سوئے چوہدری صاحب کے خراٹے خلل ڈال رہے تھے۔ گرمیوں میں جب باہر صحن میں سونا ہوتا تو ابا جی چارپائی کافی دور ڈلواتا۔

"ابو کے خراٹے مجھے سونے نہیں دیتے۔" وہ کہتا۔

رحیمہ احمد کی نیند میں یہ خراٹے خلل نہ ڈالتے تھے، وہ ان کی سوچوں میں بھی خلل نہ ڈالتے تھے۔ کمرے میں دم سا گھٹنے لگا تو صحن میں برآمدے کے پاس پڑے تخت پہ آ بیٹھیں۔ رات کے اس پہر انہوں نے تنہائی کو زیادہ محسوس کیا۔

سب اپنے اپنے کمروں میں تھے۔ اپنے اپنے بچوں کے ساتھ تھے اور وہ تنہا۔

اس گھر میں ان کے تین دیور رہتے تھے۔ چوہدری حیدر یعقوب، چوہدری سلیمان یعقوب اور چوہدری سفیان یعقوب۔

بڑے دیور چوہدری حیدر یعقوب کی بیوی رفعت جہاں تھیں اور ان کے چار بچے تھے۔ یاسر، اسود، فاطمہ اور مومنہ۔

یاسر ایم کام کے بعد کراچی میں ایک بینک میں نوکری کر رہا تھا۔ اس کی بات اپنی پھوپھو فردوس کی بیٹی رباب کے ساتھ طے ہو چکی تھی۔ اس سے چھوٹا اسود تھا جو سندھ یونیورسٹی سے ایم بی اے کر رہا تھا۔ تیسرے نمبر پہ فاطمہ تھی جو بی ایس سی کر چکی تھی اور اس سال اس کی شادی طے تھی۔ اس کی منگنی خالہ زاد خرم سے ہوئی تھی جو کہ جرمنی میں ہوتا تھا۔ سب سے چھوٹی مومنہ نے اسی سال انٹر کیا تھا۔ یونیورسٹی جانے کی شدید خواہش رکھتی تھی جس کی اجازت نہیں ملی تو احتجاجاً ابھی تک اپنے شہر کے ڈگری کالج میں بھی بی اے، بی ایس سی میں داخلہ نہ لیا تھا۔

چوہدری سلیمان یعقوب اور آسیہ کے دو بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔ ہمایوں بی کام کے بعد باپ دادا کی زمینیں سنبھال رہا تھا جبکہ بابر فرسٹ ایئر کا طالب علم تھا اور گل چہرہ کلاس نہم میں تھی۔

سب سے چھوٹے دیور چوہدری سفیان یعقوب اور دیورانی ارم کی دو بیٹیاں تھیں عروہ اور حبہ اور ایک بیٹا تھا ولی۔ ساڑھے چار سال کی عروہ نے اسی سال اسکول جانا شروع کیا تھا جبکہ حبہ ساڑھے تین برس کی تھی اور ولی دو سال کا۔

اس گھر میں اتنے افراد تھے اور وہ تنہائی محسوس کرتی تھیں۔

ان کی دو نندیں تھیں۔ فردوس اور یاسمین۔ یاسمین شہر میں رہتی تھیں جبکہ آپا فردوس کے اور ان کے گھر کی ایک دیوار سانجھی تھی۔ ان کے پانچوں بچے مظہر، اطہر، رباب، مہرتاب اور طاہر بھی اکثر یہیں پائے جاتے تھے۔ یاسمین بھی اپنی تینوں بیٹیوں

شاہانہ، حدیقہ اور سلیمانہ کے ساتھ ہفتہ دس دن بعد چکر لگاتی تھیں۔
اتنے لوگ تھے آس پاس۔ پھر بھی وہ تنہا تھیں۔
اس گھرانے کی سب سے اہم شخصیت تھیں رحیمہ احمد خود۔ ان کے شوہر چوہدری احمد یعقوب پانچ سال پہلے وفات پا چکے تھے اور۔
"آپ یہاں کیوں بیٹھی ہیں ماں؟"
رحیمہ احمد نے چونک کر نگاہ اٹھائی۔ سامنے اسود کھڑا تھا۔ جانے کب کمرے سے نکل کر آیا تھا، انہیں پتا ہی نہیں چلا۔
"بس یونہی۔ کمرے میں گھٹن سی ہو رہی تھی تو باہر کھلی فضا میں آ بیٹھی۔"
"طبیعت ٹھیک ہے ناں آپ کی؟" وہ فکرمندی سے پوچھ رہا تھا۔
رحیمہ احمد نے اثبات میں سر ہلا کر اسے مطمئن کیا اور خود شرمندہ سی ہوئیں۔
"اتنی پرواہ کرنے والے، اتنی محبت کرنے والے بچے ہیں میرے پاس اور میں ناشکری۔ تنہائی محسوس کرتی ہوں۔"
اسود کمرے میں گیا، فریج میں سے پانی کی بوتل نکالی اور وہاں پڑی پلاسٹک کی کرسیوں میں سے ایک اٹھا لایا اور ان کے سامنے بیٹھ کر باتیں کرنے لگا۔ رحیمہ احمد چاند کی چاندنی میں اس کا چمکتا چہرہ دیکھے گئیں۔
کتنا وجیہہ ہو گیا تھا وہ۔ قد کاٹھ تو شروع سے اچھا تھا، شکل و صورت میں بھی کسی سے کم نہ تھا۔ یونیورسٹی جا کر شخصیت میں مزید نکھار آیا تو نظر لگ جانے کی حد تک پیارا لگنے لگا تھا۔
"کیسا شروع ہوا نیا تعلیمی سال؟"
"زبردست ماں۔ اب سینئر ہو گئے ہیں۔ عزت ملنے لگی ہے۔"
رحیمہ احمد نے پیار سے اس کی صورت دیکھی۔
"ماں! شعیب کو بہت شوق ہے گاؤں دیکھنے کا، زمینوں پہ گھومنے کا، پکھیوں کا شکار کرنے کا۔ سوچ رہا ہوں، کبھی اسے لے آؤں۔ زیرو پوائنٹ بھی لے جاؤں گا۔" اپنا ارادہ بیان کرتے ہوئے اس نے پانی کی بوتل منہ کو لگائی۔
"موسم کا مزا تو یہاں ہے۔ حیدر آباد کے کچھ گنجان آباد علاقوں میں یہ عالم ہے کہ گاڑیوں کا شور، ان سے نکلنے والے دھوئیں، ٹریفک جام کے باعث اس موسم میں بھی اس طرف جاؤ تو گرمی لگنے لگتی ہے۔"
پانی کا گھونٹ گھونٹ بھرتے وہ اور بھی بہت سی باتیں کرتا رہا۔ یونی ورسٹی کی، دوستوں کی، جامشورو کی، حیدر آباد کی۔
وہ اسے تکتی گئیں، تکتی گئیں اور پھر ایک دم اس کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام کر وہی سوال پوچھ ڈالا۔ وہی سوال۔ جس پہ پہلے وہ شرما جاتا تھا، پھر ایسا وقت آیا کہ وہ ساکت سا ہو جاتا تھا۔ اب بھی اپنی جگہ پہ منجمد ہوا۔
رات کے اس پہر خاموشی ہی خاموشی تھی۔ اس خاموشی میں خلل ڈالتے تھے تو صرف دور گیٹ کے پاس پڑی چارپائی پہ سوئے چوہدری صاحب کے خراٹے۔

☆☆☆

ڈھلتی دوپہر کی دھوپ اچھی لگ رہی تھی۔ دیوار کے پاس پڑی چارپائی پہ بیٹھی رفعت جہاں نے ہاتھ سے سلائیاں رکھیں اور تکیہ سیدھا کرتے ہوئے لیٹ گئیں۔ کچھ دیر میں ان کی آنکھ لگ گئی اور کچھ ہی دیر میں کھل بھی گئی۔ ارم کے بچوں نے وہ ادھم مچا رکھا تھا کہ ان کا شور، شرارتیں اور ارم کے کوسنوں نے شور سا برپا کر ڈالا تھا۔ کمرے میں ڈائجسٹ پڑھتی مونہ نے بے مزا ہو کر دروازہ بند کیا تھا مگر بند دروازے کھڑکیاں ارم کے والیوم پہ کچھ خاص اثر انداز ہونے والے نہ تھے۔
"آنے دو اپنے باپ کو۔" ارم نے بے حال ہوتے ہوئے آخری دھمکی دی جو کہ کارگر ہرگز ثابت نہ ہوئی۔ عروہ اور حبہ کی کارروائیاں وہی کی وہی۔
"ماما! اس نے میرا بازو مروڑ دیا۔"
"ماما یہ میری طرف دیکھ کر ہنسی کیوں؟"
"ماما! اس نے مجھے دھکا دیا۔"
ان کے کسی خوشی شروع ہونے والے ہر کھیل کا اختتام یونہی ہوتا تھا۔ اب حبہ روتی ہوئی ارم کی طرف جو آئی تو اس سے ایک تھپڑ مزید کھا لیا۔ اس کے سر بلند ہونے لگے تو رحیمہ احمد اپنا کام چھوڑ کر کمرے سے نکلیں۔
"ایسی ذہنیت اولاد تو نہ ہی ہوتی تو اچھا تھا۔" ارم ہاتھ پہ ہاتھ مار کے روتے بچے کو مزید کستے ہوئے بے زاری سے کہہ رہی تھی۔ رحیمہ احمد نے تڑپ کر بچوں کو دیکھا۔ ولی کو گود میں لیتے ہوئے عروہ اور حبہ کو بیگ لانے کے لیے کمرے میں بھیجا اور اس کے پاس چارپائی پہ بیٹھیں۔
"ناشکری نہ کیا کرو ارم۔"
"آپ دیکھتی ہیں تو پالی! کتنا ستاتے ہیں۔ سوچا تھا دو گھڑی لیٹ جاؤں گی مگر ان کو تو جیسے ماں کو آرام کرتے دیکھ کر ہر کسی کی کوئی یاد آ جاتی ہے۔ ایک منٹ جو سکون سے بیٹھ جائیں۔" ارم نے دکھڑا سنانے کے ساتھ ساتھ رفعت پالی کو رشک سے دیکھا جن کے بچے جوان ہو گئے تھے۔
"سب بچے اس عمر میں ایسے ہی کرتے ہیں۔"
"ہم تو ایسے نہ تھے۔"
"سب ماں باپ ایسا ہی کہتے ہیں۔"
ارم کھلکھلا کر ہنس دی۔
"ویسے سچ پوچھیں پالی! بڑا کھپایا ستایا ہے اپنی ماں کو میں نے۔ مجھے لگتا ہے یہ میرے ہی کرتوتوں کی سزا ہے۔"
"نہ ارم! اولاد کو کبھی سزا نہیں کہتے۔ جن کے پاس یہ نعمت نہیں، ان سے پوچھو۔ اولاد کیا ہے۔"
ارم چپ رہی۔ رحیمہ احمد نے ولی کو گود میں تھپکتے ہوئے عروہ کو ہوم ورک کروانا شروع کر دیا تھا جبکہ حبہ بھی شوق شوق میں ڈرائنگ بک میں رنگ بھرنے لگی تو ارم نے سکھ کی سانس لے کر آنکھیں موندتے ہوئے سوچا۔
"ماؤں کو کتنا ستاتے ہیں یہ بچے اور دوسروں کے پاس سیدھے رہتے ہیں۔"
رحیمہ احمد سب ماؤں کی نظر میں "دوسری" اور سب بچوں کے لیے "ماں" تھیں۔ باہر سے لے کر ولی تک ہر بچے کی پرورش میں ان کا بڑا کردار رہا۔ بچے کو کس عمر میں گھٹی دی جاتی ہے۔ کس عمر میں چاول۔ اسے بکری کا دودھ [illegible]۔ کس تیل کی مالش کرنی ہے۔ دانت نکال رہا ہو تو کیا احتیاطی تدابیر اختیار کرنی چاہئیں۔ بچے کے پیٹ میں درد ہے تو کیا کرنا ہے، کان میں درد ہے تو کیا ڈالنا ہے۔
دیورانی ہو یا نند۔ ہر ماں اپنے روتے بلکتے بچے کو اٹھا کر ان کے پاس لاتی۔ اپنے کام نمٹانے کے لیے ان کی گود میں ڈالتی۔ اپنی نیند پوری کرنے کے لیے ان کی جھولی نظر آتی۔
وہ بھی ممتا لٹانے میں کمی نہ رکھتیں۔ بیوہ ہونے کے بعد بھائیوں کے کہنے کے باوجود وہ ان کے ساتھ نہیں گئیں، اسی گھر میں ہمیشہ رہنے کا فیصلہ کیا تو ان میں سے ایک وجہ یہ بچے تھے۔ وہ انہیں چھوڑ کر کہیں نہیں جا سکتی تھیں۔
فاطمہ آنکھیں ملتی ہوئی سوئی جاگی سی ان کے پاس آ کر بیٹھی اور ولی کے گال کھینچے۔ پھر حبہ کو بتانے لگی کہ کلرز کس طرح سے کرتے ہیں کہ تصویر سے باہر نہ نکلیں۔ اتنی توجہ پا کر وہ اس کی گود میں ہی آ بیٹھی۔
مہر تاب بھی کھانے کی ترکیبوں والا رسالہ لیے آ گئی تھی۔ بے دھڑک اس گھر میں کسی بھی وقت آنے جانے والی یہ لڑکی اسود کے آنے پہ چوری چھپے ان کے یہاں آنے کے بہانے ڈھونڈنے لگی تھی۔
فاطمہ کو یہ بتاتے ہوئے کہ آج رات وہ کون سی ڈش ٹرائی کرنے کا ارادہ رکھتی ہے، اس کی نگاہیں

اسود کے کمرے کے بند دروازے کا تو کبھی گیٹ کا طواف کر رہی تھیں۔ اسے اندازہ نہ تھا کہ وہ گھر میں ہی ہے یا کہیں گیا ہوا ہے۔ کسی سے پوچھتے جھجک آ رہی تھی۔

رحیمہ احمد نے برآمدے میں لگے ٹائم پیس کی طرف دیکھا اور بچوں کو نماز کی تاکید کرتے ہوئے خود وضو کرنے کی نیت سے اٹھنے لگیں جب گیٹ سے اسود اور ہمایوں داخل ہوئے تھے۔ مہرتاب نے جلدی سے اپنی لٹ کو سنوارا اور دوپٹے کو ٹھیک کرتے ہوئے ان کے قریب آنے پہ سلام کیا۔

"وعلیکم السلام۔ کیسی ہو مہر؟" اسود نے سلام کا جواب دیتے ہوئے اس کا حال پوچھا۔

"ٹھیک ہوں۔" اس نے آہستہ سے جواب دیا۔

"تو آج شام کی دعوت تمہاری طرف ہے؟" ہمایوں نے اس کے ہاتھ میں موجود کھانے کی ترکیبوں والے رسالے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا تو وہ جھینپ گئی۔ اسود ہنس کر رحیمہ احمد کی طرف بڑھا اور دونوں کا قافلہ ان کی طرف بڑھ چلا۔

"اپنا خیال رکھا کریں۔ دوا وقت پر لیا کریں۔" اسود نے تاکید کرتے ہوئے ان کی طرف دیکھا تو رات کا منظر ان کی نگاہوں میں گھوم گیا۔ وہ شرمندہ سی ہو گئیں۔

جانے کیوں اسود کو دیکھ کر ان کی خواہشیں ایک ایک کر کے سامنے آ کھڑی ہوتیں۔ ان کے جذبات انہیں مجبور کرنے لگتے اور وہ بے اختیار ہونے لگتیں۔ رات اسود نے نگاہیں چرائی تھیں اب انہوں نے اس سے نظریں چراتے ہوئے بچوں کو ایک بار پھر نماز کی تاکید کی۔

☆☆☆

"بڑے مزے کے۔"

"کمال کر دیا مہر تم نے تو۔"

"مزا آ گیا بادشاہو۔"

سب تعریف کر رہے تھے اور مہرتاب کا دل چاہ رہا تھا کہ نیچے زمین پر آلتی پالتی مار کر رونا شروع کر دے۔ جو کباب اس نے بہت چاؤ کے ساتھ ساری شام لگا کر بنائے تھے، وہ ایک ایک کر کے ہر کسی کے ہاتھ میں جا رہے تھے اور جس کے لیے بنائے گئے تھے، وہ اطمینان سے بیٹھا ماں کے ہاتھ کی پکی کڑھی کھا رہا تھا۔

جوائنٹ فیملی میں محبت بڑی مہنگی پڑتی ہے۔ مرد کے دل تک معدے کے رستے پہنچنے کی خواہش اور کوشش میں کئی مرحلے درپیش ہوتے ہیں۔ بیچ میں کئی ہاتھ آتے ہیں، کئی سوال آتے ہیں۔ اس کا اندازہ اسے ابھی سے ہونے لگا تھا۔ یہ محبت تو ویسے ہی ہزار خدشوں میں گھری ہوئی تھی۔ رفعت مامی بہت بار سنا چکی تھیں۔

"ایک ہی گھر سے دو بہوئیں نہیں لانی چاہئیں ورنہ سسرال کے خلاف محاذ بنا لیتی ہیں۔"

"ایک بہو حیدر کی بھانجی ہے تو دوسری میں اپنی بھتیجی لاؤں گی۔"

خیر مامی کا مسئلہ نہ تھا۔ ماں باپ تو منہ دیکھتے رہ جاتے ہیں جب اولاد سامنے کھڑی ہو جائے۔ اسود اس کا ہو جاتا تو مامی بے چاری نے کیا کر لینا تھا اور مسئلہ یہ تھا کہ اسود اس کا کیسے ہوتا۔

آج کی محنت ہی حال بیان کر رہی تھی۔ مومنہ، بگل چیرو، بابر، ہمایوں، ارم مامی، آسیہ مامی سب نے کباب کھا لیے۔ ارم مامی کے بچوں نے تو ایسا رولا ڈالا کہ دو اور کباب ان کی پلیٹ میں رکھ کر دینے پڑے۔ پھر ارم مامی نے یاد دلایا کہ سفیان کو بھی بڑے پسند ہیں یہ کباب۔ تو ایک اور نکالنا پڑا۔ اوپر سے ہمایوں صاحب کا فرمان۔

"کوئی چیز بنائی ہو تو کچھ زیادہ ہی بنا لیا کرو۔ ایک کباب میں تو ذائقہ بھی پتا نہیں چلا۔"

وہ جل بھن گئی۔ اپنی طرف سے تو وہ پلیٹ بھر کر ہی لائی تھی۔ اس سے پہلے کہ پلیٹ میں بچے آخری دو کباب بھی جاتے، وہ جلدی سے رحیمہ مامی

اور اسود کی طرف بڑھی۔ مامی نے منع کر دیا۔

"بھئی بڑا گوشت راس نہیں آتا۔"

اسود نے ماں کی طرف بہت غور سے دیکھا۔

"آپ لیں۔" مہرتاب اس کے سامنے پلیٹ بڑھائے کھڑی تھی اور وہ ماں کی بھری بھری آنکھیں دیکھ رہا تھا۔

"سوری مہر! میں بھی بڑا گوشت نہیں کھاتا۔" کڑھی کی پلیٹ میں بڑا پکوڑا لقمے کے ساتھ توڑتے ہوئے اس نے کہا اور پھر نوالہ منہ میں ڈال لیا۔

رحیمہ احمد اسے دیکھ کر رہ گئیں۔ مہرتاب سے مزید وہاں ٹھہرا نہ گیا۔ پلیٹ مومنہ کے ہاتھ میں دے کر وہ چلی گئی۔ بچی روٹی پونے میں لپیٹتے ہوئے رحیمہ احمد نے پھر اس کی طرف دیکھا۔

اسی لیے تو وہ دل سے اتنا قریب محسوس ہوتا تھا اسی لیے تو وہ سب سے جدا لگتا تھا۔ اسی لیے تو وہ اتنا اپنا سا لگتا تھا کیونکہ وہ بھی رحیمہ احمد کی طرح اسے بھولا نہیں تھا جسے شاید سب بھول چکے تھے یا وقت کے ساتھ ساتھ جس کی یاد پہ گرد پڑنے لگی تھی۔

☆☆☆

بھاؤ جانتا تھا کہ اس کا ایک بار کا کہا کافی ہے۔ اس لیے اپنی بات نہیں دہرا رہا تھا۔ ممی بھی جانتی تھیں کہ ان کا ایک بار کا کہا کافی نہیں، اس لیے بار بار بات دہرا رہی تھیں۔

"بس کریں ممی! میں سات سمندر پار نہیں جا رہی۔" پیکنگ کرتے ہوئے وہ جھنجلا کر مڑی۔ ممی چپ ہو گئیں۔ حالانکہ وہ اسے بتانا چاہتی تھیں کہ انہیں لگ یہی رہا ہے کہ ان کی بیٹی سات سمندر پار جا رہی ہے۔

"اور اپنی چیزوں کا خیال رکھنا۔"

جب سے ایک ملازمہ نے اس کے کمرے سے سونے کے ٹاپس اٹھا لیے تھے، سب کو یہی لگتا تھا کہ وہ اپنی چیزیں سنبھال کر نہیں رکھتی۔ حالانکہ ایسی بات ہوتی تو بھلا وہ تھیلے نما بیگ جو ابھی الماری سے نکال کر اس نے ٹرالی سوٹ کیس کے پاس رکھا تھا، وہ آج اتنے برسوں بعد بھی ویسے کا ویسا ہوتا؟

"یہ کیا ہے؟" ممی جانتی تھیں کہ وہ کیا ہے پھر بھی بولے بنا نہ رہ سکیں۔

"آپ جانتی ہیں۔" جواب میں اس نے انہیں جن نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا تھا، وہ نظریں چرانے پہ مجبور ہو گئیں۔

"اس کی وہاں کیا ضرورت ہے؟" انہوں نے دھیمی آواز میں پوچھا۔

"اس کی ضرورت مجھے ہر جگہ ہوتی ہے۔"

اس کی آواز ان سے بھی زیادہ دھیمی تھی مگر ان کے کانوں کو جھنجھناتی ہوئی گئی۔ وہ کچھ دیر کو خاموش ہوئیں مگر صرف کچھ دیر کو۔ ممی بھی پاسباں جیسی تھیں۔ وہ اسے اچھا برا سمجھانا اپنا فرض سمجھتی تھیں اور اپنا فرض خوب نبھاتی تھیں۔ باقی کے دو دن بھی انہوں نے اسے بہت کچھ سمجھانے کی کوشش کی تھی جن میں سرفہرست اس کی حدود تھیں۔

جب گاڑی گیٹ سے باہر نکلی تو اس نے سکون کی سانس لی۔ ایسی سانس اس نے برسوں بعد لی تھی۔

سارا رستہ خاموشی کے ساتھ طے ہوا تھا۔ جیسے جیسے وہ اس گھر سے دور ہوتی جا رہی تھی، آزادی کا احساس بڑھتا جا رہا تھا۔ ان سات سالوں میں پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ اس کے پیروں سے بیڑیاں اتار دی گئی تھیں۔۔۔ ہاں صرف بیڑیاں۔ ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پہ بیٹھا شخص احساس دلا رہا تھا کہ ہتھکڑیاں اب تک جوں کی توں تھیں۔

بیڑیاں کھلنے سے کم سے کم یہ تو ہوا کہ وہ خود سے چل پھر سکتی تھی۔ اتنے سالوں اتنے مہینوں اتنے دنوں بعد ملنے والا یہ احساس بھی کافی تھا۔

ہاسٹل کے اندر پرووسٹ کے آفس تک وہ اس کے ساتھ آیا تھا۔ پرووسٹ نے جس طرح انہیں خوش آمدید کہا، اور خوش دلی سے بٹھاتے ہوئے اس کے بھاؤ کا حوالہ دیا۔ اسے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ بھاؤ نے سارے انتظام کر کے ہی اسے باہر کی ہوا

یہی حال دیوروں کا تھا۔ ان کے لیے بڑی بھابی کا درجہ ماں جیسا تھا۔ ان کی دی ہوئی عزت ہی تھی کہ رحیمہ احمد نے بیوہ ہونے کے بعد یہیں رہنا پسند کیا۔ اور بھائیوں کے کہنے کے باوجود میکے جا کر نہ رہیں۔

دیورانیوں کو بھی کبھی ان کو دی جانے والی یہ غیر معمولی اہمیت بری لگی تھی۔ آپس میں اس بارے میں گفتگو بھی کرتیں، رحیمہ احمد کی چوہدراہٹ پہ کچھ بھی جلا کرتیں۔ مگر جب ان کے بچوں کی تعلیم کے لیے، چھوٹی بڑی خواہشوں کے لیے، ہر موقع پہ دینے دلانے کے لیے رحیمہ احمد کا لاکر کھلتا اور وہ اپنی ذات پہ کچھ بھی خرچ کیے بنا اس گھر پر، ان کے بچوں پر خرچ کرتیں تو ان کا دل صاف ہو جاتا۔

اور اب جب ان کے بچے جوان ہو رہے تھے تو ان کی شادیوں کے لیے بھی کچھ نہ کچھ بنوا کر دے رکھ رہی تھیں۔ کاظمہ کے لیے پچھلے سال گنے کی فصل اترتے سونے کا سیٹ بنوایا تھا۔ یاسر کی ہونے والی بیوی کے لیے کئی سال پہلے چوڑیاں بنوا کر رکھ چکی تھیں۔

"میں نے بھی اس سال ہمایوں کی بات پکی کر دی ہے۔ اس کے لیے جوڑنا شروع کر دیا ہے میں نے۔ اس صدقے جاؤں بچہ بیچارہ اتنی محنت کرتا ہے اور اس کی دلہن کے لیے کچھ بنایا نہیں ابھی تک۔" ... جلدی سے اعلان کیا، مبادا پھر رفعت جہاں کے بچوں پر ہی سب نہ خرچ کر ڈالیں رحیمہ باجی۔ لگتا ہے یہ یاد دلانا ضروری تھا کہ ان کا بیٹا بھی جوان ہو گیا ہے۔

"اس کی دلہن تو جب منظر عام پہ آئے گی تب دیکھا جائے گا۔ میں تو سامنے ہوں ناں۔ ماں مجھے بالیاں چاہئیں شاہانہ جیسی۔" دیوار سے ٹیک لگائے کھڑی مومنہ نے اپنا اصرار جاری رکھا۔

"ہاں اس کو بنوا دیں بالیاں۔" ہمایوں نے ولی کو نیچے اتارتے ہوئے آواز بلند کہا اور پھر مومنہ کی طرف ذرا سا جھک کر سرگوشی کی۔ "میری دلہن کا زیور بنے گا اس کا۔ بات تو ایک ہی ہے۔"

مومنہ کا چہرہ لال ہوا۔

"ہونہہ۔ خوش فہمی۔" سر جھٹک کر بولی تو ہمایوں ہنس کر فیصل کے لیے تیار ہونے والی چھلی کی طرف گیا۔

☆☆☆

"بڑی نمونہ لڑکیاں آئی ہیں اس بار تو۔" کمرہ نمبر ایک سو دس کی لڑکیاں ڈیپارٹمنٹ جانے کے لیے تیار ہو رہی تھیں۔ ان میں سے سرگئی جوڑے والی لپ اسٹک لگاتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"سامنے ونگ میں ایک لڑکی ہے بڑی (پاگل) سی۔ کسی بھی لڑکی کو روک کر اسے کہتی ہے۔ باجی میری روم میٹس ابھی آئی نہیں۔ مجھے ڈر لگتا ہے پلیز میرے ساتھ سو جائیں۔" "اب کوئی لڑکی انسانی ہمدردی میں اس کی مشکل دور کرنا بھی چاہے تو "باجی" سن کر دور بھاگ جاتی ہے۔"

اس کے علاوہ سب نے قہقہہ لگایا۔

"ارے اسے چھوڑو۔ روم ون او سیون کی لڑکی کا سنو۔ دو ہفتے پہلے لوہے کا ٹرنک اٹھا کر جب ہاسٹل آئی تو سب کو بڑی بوگی لگ رہی تھی۔ کل میں نے اسے کینٹین میں ایک لڑکے کے ساتھ بیٹھ کر سموسے کھاتے دیکھا۔" سامنے کے بالوں کو اٹھا کر پف بناتی پیلے اور گلابی پھول دار جوڑے والی بھی ہنس ہنس کر بتا رہی تھی۔

"ارے نا کرو یار۔ وہ لڑکی۔ جس نے شاید خود ہی قینچی پکڑ کر ماتھے سے بال کاٹ رکھے ہیں اور بلیڈ مار کر بھنویں بھی تراشنے کی کوشش کی ہوئی ہے۔" سرگئی جوڑے والی اس کی طرف مڑی۔

"ہاں وہی۔" پف کو مزید ابھارتے ہوئے اس نے تصدیق کی۔

وہ جو خاموشی کے ساتھ تیار ہو رہی تھی، اس کو خاصی کوفت ہو رہی تھی ساری گفتگو سن کر۔

"ارے آج کے دور میں تبت کریم کون لگاتا ہے؟" سرگئی جوڑے والی اب اس کے ہاتھ میں موجود ڈبیہ دیکھتے ہوئے حیرت سے پوچھ رہی تھی۔

"میں لگاتی ہوں۔" اس نے سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا۔ لڑکیوں میں نظروں کا تبادلہ ہوا۔ انہیں دونوں جو دوسری لڑکیوں پہ کھلکھلا رہی تھیں۔ لگا کہ ابھی وہ ایسی ہی نمونہ لڑکی ان کے اپنے روم میں بھی آ گئی ہے۔ وہ نہ جانتی تھیں کہ اس نمونہ لڑکی کی وارڈ روب قیمتی اور خوبصورت جوڑوں سے بھی بھری ہے مگر وہ کاٹن یا لان پہنا کرتی ہے۔ اس کے ڈریسنگ ٹیبل پہ مختلف برانڈز کے آئی لائنر، مسکارے، کاجل دکھائی دیتے ہیں مگر وہ آنکھوں میں سرمہ لگاتی ہے۔ اسی ڈریسنگ ٹیبل پہ مہنگی کریمیں اور فیس لوشن بھی پڑے تھے مگر وہ تبت کریم لگاتی ہے۔

اس نے گھڑی میں وقت دیکھا اور دوپٹہ سر پہ لیتے ہوئے میز پہ رکھا اپنا بیگ اٹھانے کو بڑھی۔

"تمہارا پہلا دن ہے۔ تمہیں ذرا مشکل ہو گی ہر شے سمجھنے میں۔ چلو۔ میں تمہارے ساتھ چلتی ہوں آج۔" وہ اپنے بیگ میں پین رکھ رہی تھی جب پیلے گلابی پھول دار جوڑے والی نے اس کے قریب آ کر کہا۔

"تھینکس۔ میں خود ہی چلی جاؤں گی۔" اس نے رکھائی کے ساتھ جواب دیا۔

"اچھا چلو گیٹ تک میں تمہارے ساتھ چلتی ہوں۔ جہاں پوائنٹ آتے ہیں۔ لڑکیوں کو دھکے دے کر پوائنٹ پہ کیسے چڑھنا ہے، سیٹ کیسے حاصل کرنی ہے اور اگر کوئی سیٹ خالی نہ ملے تو راڈ کو پکڑ کر کھڑے کیسے ہونا ہے۔ اور اگر پوائنٹ کے اندر جانے کا موقع ہی نہ ملے تو دروازے پہ کیسے لٹکنا ہے۔ یہ سب سیکھنے کے لیے تمہیں ایک استاد کی ضرورت ہے۔"

"میں نے کہا ناں۔ مجھے کسی کی مدد کی ضرورت نہیں۔" وہ اس کی طرف مڑی اور درشت لہجے میں کہہ کر دروازے کی طرف بڑھی۔

"سنو میری جان۔" اس کو پیچھے سے اپنی تیسری روم میٹ کی آواز سنائی دی۔ اس آواز کو وہ بہت اچھی طرح سے پہچانتی تھی۔ جب وہ یہ آواز سنتی تھی، جب جب وہ یہ چہرہ دیکھتی تھی اسے اپنے جسم پہ پڑے نیل یاد آتے تھے۔ جڑوں سے اکھڑے اپنے بالوں کا گچھا نظر آتا تھا۔

"اس کی مدد تم لو نہ لو۔" وہ اس کے سامنے کھڑے ہو کر پھول دار جوڑے والی کی جانب اشارہ کر رہی تھی۔ "میری مدد تمہیں لینی ہو گی۔ یہ تمہارے بھاؤ کا حکم ہے۔ اس نے کہا تھا کہ اس کی بہن کو ہاسٹل یا یونیورسٹی میں کوئی مشکل پیش نہیں آنی چاہیے۔ تمہارے آنے جانے کا، تمہارے کھانے پینے کا خیال رکھنا ہے۔ تم جانتی ہو ناں کہ تمہارے بھاؤ کا حکم ٹالتی نہیں۔"

"میرے بھاؤ کا حکم تم ٹال بھی کیسے سکتی ہو۔ جتنا وہ تمہیں نوازتا ہے، کوئی اور بھلا کیا نوازتا ہوگا۔" اس نے تلملاتے ہوئے کہا۔

باقی دونوں روم میٹس نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور زیر لب مسکرا دیں۔ اس نئی آنے والی لڑکی کے لیے پہلے یہاں ان کی چوتھی روم میٹ کا روم چینج کروا کر ایک لڑکی کی گنجائش بنائی گئی۔ اور ان کی سینئر روم میٹ پری نے ان دونوں کو خاص ہدایات جاری کی تھیں کہ آنے والی اس کی بڑی خاص الخاص دوست ہے۔ اور یہ دونوں بھی اس کا خیال رکھیں۔

پری کی خاص الخاص دوست دو ہفتے تاخیر سے آ تو گئی تھی مگر اس سے پری کی دوستی کا دعویٰ کل سے کچھ سچ ثابت ہوتا نظر نہیں آ رہا تھا۔ اور کل آنے والی لڑکی کے منہ سے یہ جملہ سن کر انہیں کچھ کچھ سمجھ میں آ رہا تھا کہ لڑکی نہیں بلکہ لڑکی کا بھائی پری کا خاص الخاص دوست ہے۔

"خیر یہ بات تو تم چھوڑو۔ نوازنے والے بہت۔ بس تھوڑا ویٹ کرو۔ میں سنگھار کر لوں پھر چلتے ہیں۔ میں تمہیں تمہارے ڈیپارٹمنٹ چھوڑ کر اپنی کلاسز کے لیے جاؤں گی۔" پری نے جیسے کسی بات کو سیریس ہی نہ لیا تھا۔

"نہیں۔ اپنی کلاسز کے لیے بھی کیوں جاؤ

گی۔ وہاں بھی میرے ساتھ جڑ کر بیٹھنا۔ مجھے کہیں آنے جانے، کچھ کھانے پینے میں تمہاری مدد کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔"

"نہیں۔ مجھے تمہارے ساتھ جڑ کر بیٹھنے کی ضرورت نہیں۔ وہاں کوئی اور ہے تمہارا خیال رکھنے کے لیے۔" اس کے طعنے کا اثر سکارا لگانی پر کچا پہ بالکل نہ ہوا۔ وہ ہنس کر کہہ رہی تھی۔

بے بسی کے احساس سے اس کی سیاہ آنکھیں بھیگنے لگیں۔

عمر کوٹ کا محل ہی نہیں ساری دنیا اس کے لیے قید خانہ تھی۔ اسے لگتا تھا، اسی قید خانے میں ایڑیاں رگڑتے رگڑتے وہ کسی دن سسک سسک کر مر جائے گی۔

☆☆☆

بقول امیوں کے ساری ہی لڑکیاں پتا نہیں کن چکروں میں وقت ضائع کر رہی تھیں۔ بقول لڑکیاں ساری عمر کام ہی کرنے ہیں کیا، زندگی کا کچھ تو لطف لیا جائے۔ اور زندگی سے خوبصورتی کشید کرنے کے کچھ ہی طریقے تھے ان کے پاس۔ آم کا باغ، امرود کا باغ، دھریک پہ پڑی پینگ، پھوپھو فردوس کی بہو کے کمرے میں ڈیوائیڈر کے اندر رکھے ٹی وی کے ساتھ پڑا سی ڈی پلیئر اور سب سے بڑھ کر ماہانہ ڈائجسٹ۔

لڑکیوں کے لیے یہ ماہانہ ڈائجسٹ انمول خزانہ تھے۔ جو ایک تو شہر سے ملتے پھر بڑی منت سماجت کے بعد منگوائے جاتے۔ ہمایوں اور اسود تو چلغوزی میں لا دیتے تھے۔ پھوپھو فردوس کا اطہر تو بڑا تھا (لڑکیاں اس خالی جگہ کو وقتاً فوقتاً مختلف القابات سے پُر کرتی تھیں)، وہ سو سو لیے بنا ڈائجسٹ لا کر نہیں دیتا تھا۔ باقی لڑکے تو سو سو کے لالچ میں بھی نہیں لا کر دیتے تھے۔ ان کے نزدیک یہ ڈائجسٹ پڑھنا لڑکیوں کے لیے ٹھیک نہیں تھا۔ "غلط" کی بھی تشریح کی نہ کی انہوں نے۔

چھپ کر کر کے رسالہ ہاتھ آتا تو پھر فاطمہ کے ہاتھ سے مومنہ جھپٹ لیتی، اس کے ہاتھ سے مہرتاب اور مہرتاب کے ہاتھ سے رباب اچک لیتی۔ کبھی کبھی اس کھینچا تانی کا حصہ پڑوس کی ذکیہ اور فرح بھی بن جاتیں۔ اسی جنگ میں کئی بار سرورق کا جنازہ بھی ہوا۔

اس ساری چھینا جھپٹی میں یہ کوشش بھی ہوتی کہ ارم نہ دیکھ لے۔ کیونکہ ان کے پڑھنے سے پہلے اس کے ہاتھ میں رسالہ چلا جاتا تو چاچی امی کے علاوہ میں چاروں لڑکیاں اس کے ہاتھ سے جھپٹ نہ پاتیں۔ وہ پورا پڑھ کر ہی واپس کرتی۔ اور کئی بار پورا پڑھ کر آدھا واپس کرتی۔ باقی کوئی صفحہ اس کی جیب کے ہاتھ ہوتا، لوٹی اس کے کمرے میں پنکھے کی ہوا سے اڑتا پھرتا یا پھر فرش۔ گھومتے گھماتے کسی کونے میں پہنچ جاتا، کوئی ولی کے حلق منہ سے برآمد ہوتا۔

تو بات ہو رہی تھی کہ بقول امیوں کے ساری بھی لڑکیاں پتا نہیں کن چکروں میں وقت ضائع کر رہی تھیں۔ اور پھر یہ تھا کہ آج چاروں مصمم ارادہ کیے بیٹھی تھیں کہ ادارے کو خراج تحسین پیش کیا جائے، اس لیے کاغذ قلم ہاتھ میں لیے بیٹھی تھیں۔ اور بقول ان کے یہ وقت کا ضیاع ہرگز نہ تھا۔

پہلا جھگڑا تو یہی ہو گیا کہ پہلا نام کس کا لکھا جائے۔

"میں خط لکھ رہی ہوں، اس لیے میرا نام پہلے ہوگا۔" رباب کا موقف۔

"تم ان ہی چالاکیوں کی وجہ سے تم میرے معصوم بھائی کی منگیتر بن بیٹھی ہو۔" مومنہ نے گھور کر کہا۔

"میں نہ کرتی اس سے منگنی تو کسی اور لڑکی نے کرنی بھی نہیں تھی۔ یہ تو میں ہی سادہ لوح ہاں کر بیٹھی۔"

"سادہ لوح۔" مومنہ کے ساتھ ساتھ رباب کی اپنی سگی بہن کی آنکھیں بھی باہر آ گئیں۔

"تم جھگڑ لو پہلے۔ یہ کام تو اگلے مہینے بھی کیا جا سکتا ہے۔" فاطمہ نے کاغذ پین کی طرف اشارہ کیا تو

دونوں سنجیدہ ہو کر اس کی طرف متوجہ ہوئیں۔

"اچھا بتاؤ۔ کیا لکھنا ہے؟" رباب سیدھی ہو کر بیٹھی۔

"سب سے پہلے ادارے کے تمام ممبران کو سلام لکھو۔ پھر ان کا شکریہ ادا کرو کہ خواتین کے لیے اتنے معیاری رسائل کے پیچھے ان کی محنت اور کاوشیں ہیں۔" فاطمہ بتا رہی تھی۔

"ہاں۔ امل کو پیار بھرا اسلام بھی کہو۔"

امل۔ نام کو نہیں اداس ہوئیں۔ انہیں اپنی وہ ساتھی یاد آئی جو ادارے سے بچھڑ گئی تھی۔

"نہیں یہ بھی بتاؤ کہ ہمارے ہاتھ میں یہ ڈائجسٹ کتنے پاپڑ بیلنے کے بعد آتے ہیں، ماؤں اور بھائیوں کی ڈانٹ الگ سنتے ہیں پھر بھی ہمیں ان سے اتنی محبت ہے کہ پڑھنا چھوڑ نہیں سکتے۔" مہرتاب نے سب کو اداسی سے نکالنے کی کوشش کی۔

"سنو۔ ہم اپنے چوہدری گھر کا مختصر سا تعارف بھی کرواتے ہیں۔" فاطمہ نے گہرا سانس خارج کر کے مشورہ دیا۔

"رہنے دو، اس نے اس تعارف میں چار صفحے لگا دینے ہیں اور پھر ہمارا خط چھپنا نہیں۔" مومنہ نے آئیڈیے کو ریجیکٹ کیا۔

اس پہ دس منٹ بحث چلی۔ رباب کا بس چلتا تو ہر جملہ لکھا جاتا۔ کبھی کاٹا جاتا۔ خیر کافی حد تک خط مکمل ہونے کو آیا تو مومنہ کو یاد آیا۔

"یہ بھی لکھو کہ ہم نے ان رسالوں سے بہت کچھ سیکھا ہے۔"

رباب نے ایک دم ہاتھ روک کر مومنہ کی طرف دیکھا، باقی دونوں بھی اسے گھورنے لگی تھیں۔

"کیا ہوا؟" اس نے آنکھ کے اشارے سے پوچھا۔

"تم نے کیا سیکھا ہے آج تک اس ڈائجسٹ سے؟" مہرتاب کمر پہ ہاتھ رکھے پوچھ رہی تھی۔

"جلد کو نرم و ملائم کیسے رکھا جا سکتا ہے۔ سردیوں میں ہونٹوں اور ایڑیوں کو پھٹنے سے کیسے بچایا جا سکتا ہے۔ بالوں کا روکھا پن۔"

"اچھا۔ اچھا۔ اچھا۔ ہم نے سمجھا تم کہو گی کہ تم نے عقل، ادب، تہذیب، تمیز سیکھی۔" رباب نے سکون کا سانس لیتے ہوئے کہا۔ باقی دونوں بھی خوب ہنسیں۔

"سب کچھ میں تھوڑی سیکھوں گی، کچھ چیزیں تم لوگوں کو بھی تو سیکھنی چاہئیں۔" خوب تلملانے کے بعد بال سنوارتے ہوئے اطمینان سے کہا تو وہ تینوں سنجیدہ ہو کر پھر سے گھورنے لگیں۔

"اتنے پیارے مت گھورو نظر لگ جاتی ہے مجھے۔ یہ بتاؤ کہ کس رائٹر کے سلسلہ وار ناول کی فرمائش کی جائے؟"

لو جی۔ ایک جھگڑے کی ابتدا ہوئی۔

فاطمہ کو رفعت سراج یاد آ رہی تھیں جو جانے کہاں گم ہو گئی تھیں۔ اسے "دل دیا دہلیز" جیسا کوئی شاہکار ناول پڑھنا تھا۔ رباب کو مومنہ خورشید علی کے قلم سے "تیری راہ میں رل گئی ہوں" جیسی رومانوی تحریر کا انتظار تھا۔

"یار۔ فاخرہ جبیں کے ناول کی فرمائش کرو۔ شادی کروا کر ہمیں بھول ہی گئی ہیں وہ۔ انہیں کیا پتا کہ ہم ان کے کتنے دیوانے ہیں۔ کم از کم کوئی مکمل ناول ہی لکھ دیں۔" مومنہ نے اپنی خواہش کا اظہار کیا۔ "راحت جبیں کتنے اچھے ناول لکھ رہی ہیں شادی کے بعد۔"

"فائزہ افتخار سے ایسا ناول لکھوائیں کہ بندہ کسی بھی موڈ میں ہو، پڑھ کر ہنستا چلا جائے۔ اپنے سارے غم بھول جائے۔" یاسر کی جدائی میں تڑپتی رباب نے قلم اپنے ہاتھ میں ہونے کا فائدہ اٹھایا۔ اور جلدی سے لکھ ڈالا۔

اور اس جھگڑے کے اختتام پہ ایک اور جھگڑے کی ابتدا ہوئی کہ کس اداکار یا اداکارہ کا انٹرویو آنا چاہیے۔ ہمایوں سعید، فیصل قریشی، عائشہ خان سے ہو

گھورا۔ دانیال نے تو نظریں ہی پھیر لی تھیں۔ طوطا چشم نہ ہو تو۔ ملا بھی اس کے چاچے کی بیٹی سے تو سارے کرتوت بتاؤں گا اس کے۔
ہوم کرتے ہوئے وہ اسود کے قریب گیا۔
"کیا ہوا چوہدری؟"
مگر وہ اسے سن کب رہا تھا۔ اس وقت اس کی ہر حس دیکھنے کی حس بن گئی تھی۔ وہ جس طرف دیکھ رہا تھا، شعیب نے ڈیلے اس طرف گھمائے اور اور پھر کئی دفعہ آنکھیں جھپکانی پڑیں، اسے لگا کہ وہ کوئی سپنا دیکھ رہا ہے۔
"شکر ہے، تم میں بھی خالص مردانہ اوصاف کی جھلک نظر آئی۔ تم بھی لڑکیوں کو دیکھتے ہو، انہیں دیکھ کر رک جاتے ہو، ان کے چہرے سے نگاہ ہٹانا بھول جاتے ہو۔ او یارو۔ میں بہت خوش ہوں، بہت خوش۔ میرا یار نارمل نکلا۔ اصلی چوہدری نکلا۔" شعیب کے ڈرامے شروع ہو چکے تھے۔
کوئی اور وقت ہوتا تو اسود اسے گھورتا ضرور مگر اس وقت وہ اردگرد سے بیگانہ سا تھا۔ پھر ایک دم ہی اس نے تیزی سے چلنا شروع کر دیا۔
"کہاں؟" شعیب اس کے پیچھے آیا۔
"تم رکو۔ میں آتا ہوں۔" اسے اپنے پیچھے آنے سے منع کر کے وہ آگے چلتا چلا گیا۔ اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔
اس کا ملنا سب کو معجزہ ہی لگتا تھا اور آج ایسا لگتا تھا کہ معجزے کا دن ہے۔
اسے احساس ہی نہ ہوا کہ وہ اس کا پیچھا کرتا سڑک کے بیچوں بیچ آ گیا تھا۔ پیچھے سے آتی گاڑی کے ہارن کی آواز نے بھی اسے نہ چونکایا۔ پھر کسی نے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کر اسے بتانے کی کوشش کی تھی کہ وہ پاگل ہو گیا ہے شاید۔ وہ معذرت کرتا ایک طرف ہوا مگر نگاہ نہ ہٹائی تھی۔ شاید ڈر تھا کہ پھر سے نہ کھو جائے۔
وہ کیمسٹری ڈیپارٹمنٹ کے اندر چلی گئی تھی۔
"وہ وہی تھی۔" وہ پر یقین تھا۔
"مجھے غلط فہمی بھی تو ہو سکتی ہے نا۔" وہ بے یقین بھی تھا۔
شعیب اور دانیال سڑک پار کر کے اس کے قریب آئے۔
"کیا ہوا۔ کون تھی وہ؟" شعیب اب تجسس بھرے لہجے میں دریافت کر رہا تھا۔
"نہیں پتا۔" اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ابھی وہ خود یقین و بے یقینی کی کیفیت میں تھا انہیں کیا بتاتا۔
شعیب نے دانیال کی طرف دیکھا، وہ بھی کندھے اچکا کر رہ گیا۔
"تم لوگ چلو۔ میں آتا ہوں۔" وہ انہیں کہہ کر ڈیپارٹمنٹ کے اندر چلا آیا۔
ڈیپارٹمنٹ کے اندر لانز، کلاس روم اور لیب میں وہ اس لڑکی کو ڈھونڈنے لگا جس نے سیاہ قمیص کے اوپر ڈینم جیکٹ پہن رکھی تھی، جس کے پاؤں میں سیاہ کینوس شوز تھے۔ لیکن سیاہ لباس، ڈینم جیکٹ، کالے کینوس شوز اس کی پہچان نہ تھی، اس کی پہچان کچھ اور تھی۔ وہی اس نے دیکھنا تھی۔
وہ اسے ہر طرف ڈھونڈ رہا تھا جب ایک لڑکی کے ساتھ وہ کامن روم سے باہر نکلی، کتابوں کو سینے سے لگائے وہ ایک کلاس روم کی طرف بڑھنے لگی۔
اسود دھڑکتے دل کے ساتھ اس کے قریب چلا آیا۔

☆☆☆

سامنے سڑک کے پار آئینے ہی آئینے تھے۔ ہر ڈیزائن کے، ہر سائز کے۔ کوئی فریم کے ساتھ تھا اور کوئی اس کے بنا۔
روز ان آئینوں میں وہ اپنا عکس دیکھتا تھا اور ان آئینوں کی دکان کے ساتھ ہی پچھلی صدی کے پہلے عشروں میں بنے لال اینٹوں والے گھر میں رہتی لڑکی پہلے سوچا کرتی تھی کہ فلیٹ کے باقی لڑکوں کی طرح وہ بھی اس کے لیے آ کر بالکونی میں کھڑا ہوتا ہے۔ اس کی یہ خوش فہمی ختم ہونے میں زیادہ دن نہ لگے۔ اب وہ جانتی تھی کہ وہ اسے کہیں اپنے آپ کو دیکھا کرتا تھا۔
"خود پسند نہ ہو تو۔" وہ بڑبڑایا کرتی تھی۔
"اسے معلوم نہیں تھی کہ آج دوسرا دن ہے، وہ خود پسند کو پیچھے چھوڑ چکا اسے ہر شیشے میں کسی اور کا عکس نظر آنے لگا ہے۔"
"اوئے چوہدری۔ کل آخری دن ہے اسائنمنٹ سب مٹ کروانے کا۔ اور تم اسے کمپلیٹ کرنے کے بجائے تارے گن رہے ہو۔" شعیب پیچھے ہوئے اس کے سر پہ آ کھڑا ہوا تو وہ چونکا۔ "جاؤ، جا کر کمپلیٹ کرو اسائنمنٹ۔ جاؤ شاباش۔"
"تم نے کر لی کمپلیٹ؟" اسود نے اسے گھورا۔
"میں نے؟" اس نے ہاتھ سے اپنی طرف اشارہ کیا۔ "تجھے شرم آنی چاہیے ایسا سوال پوچھتے ہوئے۔ تو جانتا ہے کہ تیرا جگر کوئی کام ادھورا چھوڑے بنا نہیں سوتا۔" پھر کان کی لو کھجائی۔ "ویسے ہی تو بنانے لگا اسائنمنٹ، دیکھنا اگلے پانچ منٹ میں میری بھی تیار ہوگی۔ کاپی پیسٹ میں وقت ہی کتنا لگتا ہے میرے دوست۔"
"تمہاری وجہ سے مجھے بھی کم نمبر ملتے ہیں۔" وہ چڑ کر دوبارہ سڑک کی طرف دیکھنے لگا۔ "ایک ایک لفظ کاپی کر لیتے ہو۔ کوئی لفظ تو چینج کر لیا کرو۔"
"کرتا ہوں ناں۔ ٹائٹل پیج پہ جہاں چوہدری اسود حیدر لکھا ہوتا ہے، ادھر شعیب ندیم کر دیتا ہوں۔"
اسود اسے گھورتے گھورتے مسکرا دیا۔ اور پھر سے آئینوں کی طرف دیکھنے لگا، جہاں ایک عکس ابھرا تھا۔
"چل اندر چل۔ شاباش وقت ضائع نہ کر۔ مغرب کے بعد عالیہ بالکونی میں نہیں آتی۔"
"کون عالیہ؟" اسود نے پھر اسے گھورا۔
"وہی زمانہ قدیم کے بنے اس گھر میں بھٹکنے والی روح۔" شعیب نے لال اینٹوں سے بنے گھر کی طرف اشارہ کیا، جس کی اینٹوں کے بیچ کا سیمنٹ اب بھربھری مٹی بننے لگا تھا اور اس میں کہیں کہیں سے جھانکتے خودرو ننھے سبز پتے دیکھ کر اسود زمیں دار گھرانے کا سپوت ہو کر بھی تعجب میں آتا تھا کہ وہ کیسے وہاں نمو پاتے تھے۔
"اس کا نام تو تم نے راحیلہ بتایا تھا۔"
"ہاں راحیلہ ہی ہو گا پھر۔" اس نے پھر کان کی لو کھجائی۔
اسود اسے گھورتے ہوئے کمرے میں آیا اور کمپیوٹر کے سامنے بیٹھ گیا۔ شعیب نے اسے اسائنمنٹ بناتے دیکھا تو اطمینان کے ساتھ خود موبائل پہ گیم کھیلنے بیٹھ گیا لیکن اس کا اطمینان بھلا دشمنوں سے ہضم کب ہوتا تھا۔
"اسائنمنٹ میں بناؤں گا تو کوکنگ تم کرو گے۔ اور برتن بھی تم دھوؤ گے۔"
"تیرے منہ میں نوالہ بنا کر بھی میں ہی ڈال دوں۔"
"نہیں۔ کھا میں خود ہی لوں گا۔" اسود نے مسکراتے ہوئے اسے چڑایا۔
"ذرہ نوازی ہے آپ کی۔ ورنہ سوچ رہا تھا کہ آج رات چوہدری صاحب کے پیر بھی دبا کر سونا پڑے گا۔"
اسود ڈھٹائی کے ساتھ ہنس دیا تو وہ دانیال کو فون پہ اس کی شکایتیں کرتے ہوئے کچن میں چلا گیا اور اسود نے پوری دل جمعی کے ساتھ اسائنمنٹ بنانے کی کوشش کی مگر دھیان اس رات پچھلی بار حیدرآباد کی سرحد سے نکل کر جامشورو کی ایک یونیورسٹی کے ایک ڈیپارٹمنٹ کے چکر لگا رہا تھا جہاں ایک لڑکی پڑھنے آئی تھی۔
وہ وہی تھی۔ کھوئی ہوئی راجکماری۔
زندگی کئی سال آگے بڑھ گئی تھی مگر اسی رات پہ رکی سی تھی جب اس نے اسے آخری بار دیکھا تھا۔ اس کے بعد شہزادی کو ایک دیو لے گیا تھا۔ وہ ہر

ان کا اپنی طرف دیکھ کر تبسم پایا۔ بڑے فخر کی بات ہے۔ بڑے فخر کی۔"

چوہدری صاحب کے فخریہ لہجے پہ بابر سیدھا ہو بیٹھا۔ ہاں اس کے پاس دوستوں یاروں میں بیٹھ کر جتانے کو اور فخر کرنے کے لیے بہت کچھ تھا۔

اسود نے چائے کے گھونٹ بھرتے ہوئے رجبہ احمد کی طرف دیکھا۔

کیا اسے ماں کو بتانا چاہیے؟

وہ چائے کی چسکی لیتے ہوئے سوچ میں پڑ گیا تھا۔

"ماموں۔ فخرے آیا ہے۔ آپ کو اوطاق میں بلایا جا رہا ہے۔" طاہر نے اطلاع دی۔

چوہدری صاحب نے گھڑی دیکھتے ہوئے بچوں کو ٹیلو پیش کرنے کو کہا۔

عروہ کی نظریں آ جا کر گل چہرے کے کشمیری لباس پہ رک سی جاتیں جو اس نے اسکول کے اینول فنکشن میں "کشمیری لڑکی" بننے کے لیے بنوایا تھا۔ صبح سے رو رو کر سوجی آنکھوں میں پھر پانی سا آنے لگتا۔ اس کے پاس کیوں نہیں تھا ایسا ڈریس۔ اس کے ماما بابا بہت ظالم تھے۔ اوپر سے تیر یہ ہوا کہ آج اسے کچھ خاص پرفارم کرنے کا موقع بھی نہ ملا تھا۔ اس نے جیسے ہی فنکشن ختم ہوا وہ فوراً اپنی جگہ سے اٹھی۔

"میں ایڈریس سناؤں اور فون نمبر بھی۔"

"آج نہیں۔ بعد میں۔" چوہدری صاحب نے اس کے سر پہ ہاتھ رکھا اور سلام کرتے ہوئے گھر سے نکل گئے۔

☆☆☆

حویلی کے بڑے دالان میں وہ چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ چارپائیوں کے سرہانے کی طرف گول تکیے رکھے تھے اور پائنتی کی جانب کھیس بچھے ہوئے تھے۔ سامنے ہی چار کرسیاں قطار میں لگی ہوئی تھیں۔ چارپائیوں اور کرسیوں کے بیچ ایک درمیانے سائز کی چٹائی بچھی ہوئی تھی۔ ذرا پرے رکھے اسٹینڈ پہ کولر اور اسٹینڈ کی سائیڈ پہ بنے گول بڑے سوراخ میں [illegible]

اسٹیل کے گلاس رکھے تھے اس کولر سے ہر ملنے آنے والے اجنبی کو ٹھنڈا پانی پینے کو ملتا تھا۔

"چوہدری صاحب۔" چٹائی پہ بیٹھے دونوں مرد دور ہی سے انہیں دیکھ کر اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

تین عشرے پہلے جب یہ خاندان یہاں آ کر آباد ہوا تھا تو اللہ بخشے چوہدری یعقوب بڑے رعب داب والے تھے اور آس پاس کے زمین داروں کے لیے اپنے رکھ رکھاؤ اور دبدبے کی بدولت "چوہدری صاحب" کہلانے لگے تھے۔ ان کی وفات کے بعد یہ لقب ان کے بڑے بیٹے چوہدری احمد یعقوب کو ملا اور جب وہ دنیا سے رخصت پا گئے تو چوہدری حیدر یعقوب کے سر پہ "چوہدری صاحب" کی دستار رکھ دی گئی۔

"تایو۔ سمجھایا ہے مگر کہتا ہے کہ چوہدری صاحب سے بات کروں گا۔" کرسی پہ بیٹھا ہمایوں بھی ان کے احترام میں اٹھ کھڑا ہوا تھا اور اب دھیمی آواز میں انہیں بتا رہا تھا۔

"ہوں۔ کیسے ہو غلام علی؟" چوہدری صاحب نے سر ہلاتے ہوئے غلام علی کی طرف دیکھا اور ساتھ ہی کرسیوں کی طرف اشارہ کیا مگر غلام علی اور اس کے ساتھ کھڑے مرد چوہدری صاحب کے چارپائی پہ بیٹھنے کے بعد چٹائی پر ہی بیٹھے تھے۔ انہیں لگتا تھا کہ کرسیاں، چارپائیاں، تخت، پلنگ ان کے لیے بنے ہی نہیں تھے۔

"چوہدری صاحب۔ ایک منت کی تھی آپ سے؟"

"دیکھو غلام علی! تم لوگوں نے ہم سے جھوٹ بولا کہ اپنا تمام معاملہ اپنے پچھلے زمین دار سے کلیئر کر کے آئے ہو، مگر ہمیں پتا چلا ہے کہ تم بھاگ کر آئے ہو۔ غلام علی! یہ ہمارا اصول نہیں کہ ہم کسی ایسے خاندان کو ہاری رکھیں جو اپنے پچھلے زمین دار سے بھاگ آئے ہوں۔" چوہدری صاحب نے متانت سے کہتے ہوئے غلام علی اور اس کے بھائی کی طرف دیکھا جو دو ماہ پہلے ہی ان کے پاس ہاری ہوئے تھے۔

"سائیں! ہمارا [illegible] (چھوٹا) [illegible]"

[illegible] غلام علی نے ان کے آگے اپنا دامن پھیلا دیا۔

[illegible] آپ نے تو سیدھا کر دیا [illegible] یا پھر آزادی کا پروانہ [illegible] چوہدری صاحب کے مطالبے پہ غلام علی کے [illegible] چپ کی [illegible] وہ نظریں نیچی کیے بیٹھا رہا [illegible] اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

[illegible] کے لیے دکھی ہوا۔

[illegible] ہمیں غلام علی سے بات کرنی چاہیے [illegible] اعتراض نہ ہو تو۔"

"[illegible] ہمایوں! حاکم علی کوئی چھوٹا موٹا زمین دار نہیں، بڑا جاگیردار ہے۔ سنا ہے اس نے نجی جیل بنا رکھی ہے جہاں انسان، انسان نہیں بس غلام ہوتے ہیں۔ ایسا جاگیردار کیا برداشت کرے گا کہ اس کی رعایا بھاگنا شروع کر دے اور پناہ بھی کہاں لے۔ ایک دوسرے زمین دار کے پاس۔ اس کی انا بھی اجازت نہیں دے گی۔ وہ ہمارے دشمن ہو جائیں گے اور ان کو تو جان سے ہی مار ڈالیں گے۔" چوہدری صاحب نے اس دشت کی سیاحی میں عمر گزاری تھی وہ بچے سے زیادہ تجربہ کار تھے۔

"سائیں۔ سائیں۔ ہمیں پناہ دو سائیں۔ وہ ہاری بائیں، ہماری لڑکیوں (عورتوں اور بچیوں) کے ساتھ زیادتی کرتے ہیں سائیں۔" غلام علی چوہدری صاحب کے پیروں میں آ گرا۔ ہمایوں بے قراری سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"اٹھو غلام علی! انسان کے پیروں میں گرنے سے عزت نہیں ملتی۔ اٹھو۔" چوہدری صاحب نے اس کا کندھا تھپتھپایا۔ لیکن وہ سیدھا نہ ہوا۔ اسے پتا تھا انسان کے پیروں میں گرنے سے عزت ملے نہ ملے وقت کی روٹی تو ملتی ہے ناں۔

"غلام علی۔" ہمایوں نے اسے سیدھا کیا اور سامنے بیٹھنے کو کہا۔ وہ چہرہ صاف کرتے ہوئے اپنے بھائی کے پاس جا بیٹھا۔

چوہدری صاحب ابھی "کشمیر کی آزادی" پہ بابر [illegible]

والوں کے لیے دل میں ہمدردی اور محبت محسوس کر رہے تھے۔ اور اب سوچ رہے تھے کہ جو آزاد خطے پہ رہ کر بھی آزاد نہ ہو اس کے لیے کیا محسوس کریں۔ کبھی کبھی زمین کا ٹکڑا آزاد ہو جاتا ہے مگر انسان نہیں۔

"ٹھیک ہے، میں کرتا ہوں بات حاکم علی سے۔"

چوہدری حیدر یعقوب کو اپنے سر پہ رکھی "چوہدری صاحب" کی دستار کبھی بہت بھاری لگی تھی۔ اس وقت بھی لگی۔

☆☆☆

"مجھے بتاؤ۔ یہ ڈریس اچھا لگے گا مجھ پہ، ویکم میں پہنوں تو اوور تو نہیں لگے گا؟"

"یار۔ بھوک لگی ہے، اٹھ جاؤ کوئی میرے ساتھ۔"

"جی مما۔ ابھی میری فرینڈ آئی ہوئی ہے۔ بعد میں بات کرتی ہوں۔"

کمرے میں آوازیں ہی آوازیں تھیں لیکن وہ گم صم سی اپنے سامنے نوٹ بک کھولے بیٹھی تھی۔ وہ پچھلے کی کلاسز اس نے نہیں لی تھیں۔ اس لیے اب یکسوئی چاہتی تھی جو کہ اس کمرے میں تو ممکن نہیں تھی۔ خیر وجہ تو ایک اور بھی تھی جو آج اس کا دھیان بھٹک بھٹک جاتا۔ اور نوٹ بک پہ بکھرے لفظ ادھر ادھر اڑنے لگتے۔ وہ اس وقت یکسوئی ہی نہیں تنہائی بھی چاہتی تھی۔

وہ اٹھی۔ نوٹ بک، کتابیں، فولڈر اور پین سمیٹے، موبائل اٹھایا اور کمرے سے نکل گئی۔ باہر نکل کر ادھر ادھر دیکھا۔ دو لڑکیاں ہاتھوں میں مگ تھامے گپ شپ کر رہی تھیں۔ دور کچھ سینئر لڑکیوں کا گروپ نئی لڑکیوں کو تنگ کرنے میں لگا ہوا تھا۔ ایک غیر ملکی لڑکی بڑا سا دوپٹا اٹھائے کچن کی طرف جا رہی تھی۔ کاریڈور بھرا ہوا سا لگ رہا تھا۔ وہ ان سب کے بیچ میں سے ہوتے ہوئے سیڑھیوں کی طرف آ گئی۔ چھت کی طرف جانے والی

بچے نہیں ہوتے۔
ٹیوشن دے کر علی کے گھر سے باہر نکلا تو موڈ خوش گوار تھا۔ وہ پیدل ہی چلنے لگا تھا اور گنگنانے بھی لگا تھا۔ آج اس کا بے سبب مسکرانے کا، یونہی گنگنانے کا دن تھا۔ آج کسی کا گنگنانا، رکنا، تکنا نہال کر گیا تھا۔ رات ہو گئی تھی مگر چوہدری اسود حیدر بھری دوپہر میں وہیں جامعہ سندھ کے ایک درخت سے ٹیک لگائے کھڑا رہ گیا تھا۔
قصہ یوں تھا کہ سر جمال سلیم کی کلاس لے کر باہر نکلے تو شعیب کا موڈ بنا کیمسٹری ڈپارٹمنٹ جا کر گنے کا رس پینے کو۔ اسے کیا چاہیے تھا، فوراً اپروول دے دیا۔ شعیب اور دانیال کو حیرت تو ہوئی۔ کیونکہ زمین دار گھرانے کا یہ سپوت دیکھ کر ہی بتا دیا کرتا تھا کہ گنا کیڑے والا ہے۔ خود پتا نہیں تھا، ان کا دل بھی خراب کرتا تھا۔ اور آج فوراً "اوکے" کر دینا اچنبھے کا باعث تو بنتا ہی تھا ناں۔
"مجھے شک سا ہونے لگا ہے۔" دانیال نے اسے غور سے دیکھا۔
"مجھے یقین سا ہونے لگا ہے۔" شعیب نے اسے گھور کر دیکھا۔
جواباً اس نے کچھ کہا نہیں، اور جینز کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر چلنے لگا۔ وہ دونوں بھی مستی مذاق کرتے ہوئے اس کے ساتھ ساتھ تھے۔ کیمسٹری ڈپارٹمنٹ پہنچ کر دونوں گنے کا رس آرڈر کرنے گئے جبکہ وہ ایک درخت کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا تھا۔ اس کی نگاہیں ڈپارٹمنٹ کے خارجی گیٹ پر تھیں جب وہ باہر نکلی تھی ایک لڑکی کے ساتھ۔
چوہدری اسود حیدر کا دل دھڑکنا بھولا۔
وہ نگاہیں جھکائے ساتھ والی لڑکی کی باتیں سنتی چلتی آرہی تھی۔ یہی وہ لمحہ تھا جب دانیال نے دور سے "اسود" کہہ کر اسے پکارا تھا۔
وہ ٹھٹک کر رکی تھی۔
اپنے نام پہ اسے یوں ٹھٹکنا اور پھر رکنا دیکھ کر وہ بے اختیار سیدھا ہوا۔ اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا تھا۔
وہ اب اس طرف دیکھ رہی تھی جہاں سے "اسود" پکارا گیا تھا۔ وہ جیسے چہروں میں اس کا چہرہ کھوج رہی تھی۔ پھر اس نے اپنی دائیں جانب دیکھا پھر بائیں اور پھر گھوم گھوم کر ہر چہرہ دیکھنے لگی۔ اسود کو اس کی اس کیفیت نے عجیب سی خوشی دی اور پھر جانے کیوں اس نے دوبارہ درخت کے ساتھ ٹیک لگا کر سوبا کل سامنے کرلیا۔ پتا نہیں وہ کیا دیکھنا چاہتا تھا۔
اور جو وہ دیکھنا چاہتا تھا، وہی ہوا تھا۔ چند لمحوں بعد اس نے نگاہ اٹھائی تو وہ اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ اور دیکھتی ہی چلی گئی تھی۔ ان لمحوں میں چوہدری اسود حیدر نے مسرت اور شادمانی کی جس کیفیت میں خود کو پایا تھا، وہ لفظوں میں بیان نہ کر سکتا تھا۔
وہ اسے پہچان گئی تھی۔
اس وقت وہ دونوں حقیقتاً دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گئے تھے۔ اس وقت دھرتی پہ وہی تھے صرف وہی۔
یہاں دانیال اس کے قریب آ کر کچھ کہہ رہا تھا، وہاں وہ لڑکی اس سے کچھ کہہ رہی تھی۔ پھر اس لڑکی نے اس کا بازو پکڑ کر جھنجوڑا مگر وہ تو جیسے کسی خواب میں تھی۔ اسی خواب کے عالم میں اس نے اپنا ہاتھ لڑکی سے چھڑایا اور ایک قدم اس کی طرف بڑھایا۔ پھر دوسرا قدم۔ وہ اس کی طرف بڑھ رہی تھی جب اس کے سامنے کوئی آ کھڑا ہوا تھا۔
رات کے اس سمے گھر کی جانب پیدل چلتا ہوا، مسکراتا ہوا گنگناتا ہوا اسود اب سنجیدہ ہو کر سوچنے لگا تھا کہ کون تھا وہ خوبصورت سا جوان جو ایک دم آ کر اس کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔ جس نے اسے چوہدری اسود حیدر کی طرف بڑھنے نہیں دیا تھا۔ اور وہ ناگواری سے اس کے کسی سوال کا جواب دے کر پلٹ گئی تھی۔
ہاں۔ آج وہ اس سے بات نہیں کر سکا تھا لیکن کیا ہوا۔ اب راجکماری مل گئی تھی۔ اس نے شہزادے کو پہچان لیا تھا۔ کہانی کے کچھ صفحے باقی تھے۔ وہ بھی لکھ پڑھ لیے جائیں گے۔ انجام تو "اور پھر ہنسی خوشی رہنے لگے" ہی ہونا تھا۔
☆☆☆
"امت اللہ احد!"
ایک اپنائیت بھری، نرم آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی اور اسے پتھر کا کر گئی۔ قدم رک گئے، دھڑکن تھم گئی اور پلکیں جیسے جھکی تھیں ویسے کی ویسی جھکی رہ گئیں۔
"احل۔"
کوئی پھر بہت قریب سے پکار رہا تھا۔ اب کے اس پکار میں بے تکلفی کا عنصر بھی شامل تھا۔ دل جیسے یک دم کنپٹیوں میں، عارضوں میں اور ہتھیلیوں میں بھی دھڑکنے لگا۔ جھکی پلکیں جھکی پلکوں سے یوں لگی تھیں جیسے اب جدا ہونے کا ارادہ نہ ہو۔ قدم ساکت رہے۔ نہ پلٹ سکی نہ آگے بڑھ سکی۔ پلٹتی تو سپنا ایک بار پھر ٹوٹ جاتا کہ پکارا اس کو گیا تھا۔ آگے بڑھتی تو عمر بھر پچھتاتی کہ شاید پکارا اسی کو گیا تھا۔
"احل!"
اسے لگا کہ کوئی اس کے عین سامنے کھڑا ہوا ہے۔ وہ سر راہ کس ابہام میں مبتلا ہو رہی تھی۔ جھکی پلکیں اوپر کو اٹھیں اور پھر جیسے جھکنا بھول گئیں۔ دن مہینے سال گزرے، قد کاٹھ بدلے، چہرے مہرے بدلے، آواز و انداز بدلے مگر وہ اپنائیت، وہ اپنائیت جس سے اسے پکارا گیا تھا، آنکھوں سے چھلکتی وہ نرمی جس سے اسے دیکھا جا رہا تھا، وہ تو وہی کی وہیں وہی تھی۔
اس کی آنکھ کے سامنے ایک منظر جھلملایا۔
اسکول یونیفارم میں ملبوس گھبرائی ہوئی سی بچی اور اس کے ساتھ کھڑا اس کو حوصلہ دیتا لڑکا۔
"احل! ڈرو نہیں۔ اسکول میں، میں تمہارا خیال رکھوں گا۔"
وہ آج برسوں بعد اسے پکار رہا تھا۔ حقیقت اتنی دل آویز، اتنی خوش رنگ بھی ہو سکتی ہے یہ یقین کرنے میں ابھی وقت درکار تھا اور سامنے والے کو وقت کی پروا کب تھی، وہ تو بڑے مزے سے اس کے چہرے کے پل پل بدلتے رنگوں کا جائزہ لے رہا تھا۔
"اس۔ اسود۔" بہت دیر بعد بمشکل اس کے لبوں سے یہ لفظ ادا ہوا۔
اسود احمد نے اپنے سر کو ذرا سا خم کیا جیسے کہہ رہا ہو "صحیح پہچانا۔"
وہ بنا پلکیں جھپکائے اسے دیکھتی چلی گئی کل والی بے خودی اس پہ طاری ہونے لگی۔
"کیسی ہو؟" وہ اس کی سیاہ آنکھوں سے جھلکتی بے یقینی کو پڑھ کر ہولے سے مسکرایا اور یوں بے تکلفی سے پوچھنے لگا جیسے وقت نے برسوں کے روپ میں ان کے درمیان دوری کی کوئی فصیل تعمیر ہی نہ کی تھی۔ اس کے پاس جواب نہیں تھا۔ وہ بس اسے تکے جا رہی تھی جو ماروی کے ملیر کا باسی تھا۔
"کل تم۔"
"تم نے۔ اسود تم نے۔ تم نے مجھے پہچان لیا تھا کیسے؟" وہ اس کی بات کاٹ کر پوچھ رہی تھی۔
"جیسے تم نے مجھے پہچان لیا احل۔"
اس پگلی لڑکی کی سماعتیں سجدہ ریز ہوئیں۔
"ہاں۔ میری ماں کہاں ہیں اسود۔" ذرا حواسوں میں آئی تو سب سے پہلے اس ہستی کا خیال آیا، خیالوں ہی خیالوں میں جس کی گود میں سر رکھ کر روز ڈھیروں باتیں کیا کرتی تھی۔ خوابوں ہی خوابوں میں جس سے لپٹ کر بہت راتیں سویا کرتی تھی۔
"وہ گھر پہ ہیں۔ یونیورسٹی میں صرف اسٹوڈنٹس ہوتے ہیں۔" اس کے معصوم سے سوال پہ شرارت سے کہا۔ وہ جو ادھر ادھر تلاش میں نظریں گھما رہی تھی، جھینپ گئی۔
"کیسی ہیں وہ؟"
"تمہارے بغیر کیسی ہو سکتی ہیں؟" اسود نے اسی سے سوال کیا۔ اس کی پانی سے بھری آنکھیں چھلکنے کو ہوئیں۔ اس کی تھوڑی کپکپا رہی تھی۔ اور چہرے کی کیفیت بتاتی تھی کہ وہ فرط جذبات سے بے قابو ہو کر رونا چاہتی ہے، ساتھ ہی ساتھ خوشی سے چلانا چاہتی ہے۔ اسے پہلی بار ادراک ہوا کہ سات سال میں وہ یہ سب بھول چکی ہے۔ وہ غم میں رو سکتی

ہے، غصے میں جا سکتی ہے مگر خوشی کی اس صورت حال میں کچھ بھی نہیں کر سکتی۔

"تم بڑے ہو گئے ہو اسود۔"

"پھر بھی تم نے پہچان لیا؟"

وہ مسکرا دی۔

بھیگے سیاہ نین اور مسکان سجے لب۔ چوہدری اسود حیدر مسحور سا ہوا۔

"اچھا۔ سچ بتاؤ تم نے مجھے دیکھتے ہی پہچان لیا تھا؟" وہ حیران بھی، پر اشتیاق بھی۔

اسود کو اس کے چہرے کا ہر تاثر اچھا لگ رہا تھا۔ وہ ویسی کی ویسی تھی۔

"ہاں۔ پہچان لیا تھا، یقین اس نشانی سے ملا۔" اسود نے اس کے بائیں کان کی لو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

اس نے سر ہلایا۔ اس شناخت نے اس سے بھی اس کی شناخت چھین لی۔ اور آج۔

وہ ہلکا سا مسکرائی۔

"میں نے تو تمہیں بغیر کسی نشانی کے ہی پہچان لیا تھا۔" وہ اترائی۔ وہ انداز، وہ ادا جو وہ بھول چکی تھی واپس اس کے اندر خود بخود لوٹنے لگے۔

وہ ہنس دیا۔

"ماں کو پتا ہے؟"

"نہیں۔ ابھی تک تو میں نے انہیں نہیں بتایا۔ سوچا کہ پہلے خود مل لوں اور دیکھوں کہ تمہیں ہم یاد بھی ہیں یا۔" کہتے کہتے آخر میں اس کا لہجہ کچھ شرارتی ہوا۔

"جو لوگ دل بن کر میرے اندر دھڑکتے ہیں ان کو کیسے بھول سکتی ہوں اسود۔"

اسود نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ آج بھی گڑیا سی دکھائی دیتی تھی بس وقت سنجیدگی کا تحفہ دے گیا تھا شاید۔

"احتل اماں کو پتا چلے گا تو وہ تو بہت۔"

"اسود اماں کے ہاتھ میں اب بھی سونے کا وہ چھلا ہوتا ہے کیا؟" اس کی بات کاٹ کر پوچھا۔

"ہاں۔"

"ابھی بھی وہ بالوں میں سیدھی مانگ نکالتی ہیں؟"

"ہاں۔"

"ابھی بھی انہیں سفید رنگ پسند ہے؟"

"ہاں۔" وہ مسکراتا رہا، بتاتا رہا۔

"اب بھی وہ کانوں میں موتیا کی کلیاں۔"

"احتل!" اسود نے ہلکے سے ہنستے ہوئے اسے پکارا۔

اس لمحے اس لڑکی کا دل بھی سجدے میں جھک گیا۔

"سب یوں ہی کھڑے کھڑے پوچھ لو گی کیا؟"

اس سیاہ نینوں والی لڑکی نے پہلی بار ارد گرد کو محسوس کیا۔ ورنہ ابھی تک تو وہ تھی اور اس کے عین سامنے کھڑا چوہدری اسود حیدر۔

"آؤ۔ وہاں بیٹھتے ہیں۔" اسود نے ہاتھ سے سامنے اشارہ کیا اور دونوں ڈیپارٹمنٹ جانے والے راستے کے بینچوں سے ہٹ کر سامنے والے لان کی طرف بڑھ گئے۔

"تم بھی یہیں ہوتے ہو کیا؟" وہ اس کے ساتھ چلتے پوچھ رہی تھی۔

"ہاں! میں آئی بی اے میں ہوتا ہوں۔ تیسرا سال ہے آنرز کا۔" اس نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔

"اب جلدی سے مجھے ماں، امی، چاچی، بابو، سیفی بھاؤ اور سب کے بارے میں بتاؤ اور ان کی تصویریں بھی دکھاؤ۔" اس کے بیٹھتے ہی وہ بولی۔ اس کے لہجے کی بے تابی محسوس کر کے اسود بے اختیار مسکرا دیا لیکن اگلے ہی پل وہ سنجیدہ تھا۔

"کیا بتاؤں احتل!"

اس سلونے پیکر کا سر سجدے میں گرنے کے لیے مچلنے لگا۔

"سب ہیں اور سب کچھ ہے لیکن تمہارے بنا سب ادھورے ہیں، سب کچھ نامکمل ہے۔" اسود نے گمبھیر لہجے میں کہا۔

وہ ایک گہرا سانس لے کر رہ گئی یعنی کہ دوری کی تلف ہوا کیے نہیں سہہ رہی۔ اس کرب کی بھٹی میں کیا کیا نہیں تپ رہی۔ پھر بھی۔ پھر بھی ایک آگ وہ کیا جو صرف اسے ہی جلاتی تھی۔

"تم نہیں جانتے اسود! میرے بنا تو سب ادھورے ہیں مگر میں۔ میں ادھوری تو کیا سرے سے ہوں ہی نہیں۔ امت الاحد تو کہیں رہی ہی نہیں۔ اس کو تو۔"

وہ ایک دم چپ ہو گئی۔ باقی لفظوں کو سامنے بینچ پہ بیٹھے اس شخص نے چھین لیا جس کی نظریں اسی پر جمی تھیں۔ اس نے لب بھینچ کر فوراً فائل اور بیگ اٹھایا اور کھڑی ہو گئی۔ اسود حیران رہ گیا۔

"میری کلاس ہے۔" وہ بمشکل کہہ پائی اور قدم بڑھا دیے۔

"احتل!" پیچھے سے پڑنے والی اس پکار پہ اس نے آنکھیں میچ لیں۔

کاش۔ اے کاش وہ ارد گرد سے یوں بے نیاز ہوتی کہ اس کا عضو عضو وہیں جھک جاتا اور یہ سجدے عمر بھر پہ محیط ہو جاتے۔

"کیا ہوا۔ یوں اچانک۔" وہ اٹھ کر اس کے قریب آ گیا تھا اور پوچھ رہا تھا۔ اس نے آنکھیں کھول دیں۔

"مجھے ابھی یاد آیا کہ میری کلاس ہے۔" اس نے پیشانی مسلتے ہوئے کہا اور مسکرانے کی کوشش بھی کی۔ اسود نے بہت غور سے اسے دیکھا۔

"تم کہہ رہی ہو تو مان لیتا ہوں۔ ورنہ تمہارے ٹائم ٹیبل کے مطابق تمہاری اگلی کلاس شروع ہونے میں ابھی پندرہ منٹ باقی ہیں۔" اس نے کلائی پہ بندھی گھڑی پہ نظریں دوڑاتے ہوئے جتایا، وہ خاموشی سے لب کاٹتی رہی۔

"کوئی مسئلہ ہے؟" وہی اسکول کے پہلے دن اس کو حوصلہ دینے والا، اور پھر ہر روز گھر سے نکلنے سے لے کر گھر میں واپس قدم رکھنے تک اس کا خیال رکھنے والا چوہدری اسود حیدر اپنائیت سے پوچھ رہا تھا۔

"نن۔ نہیں تو۔" اس نے نگاہوں کو بمشکل بینچ کی طرف اٹھنے سے روکا تھا۔

"اچھا ٹھیک ہے، پھر ملیں گے۔ اپنا خیال رکھنا۔ اللہ حافظ۔" اس نے اس وقت مزید رکنا مناسب نہیں جانا اور اس پہ الوداعی نظر ڈالتے ہوئے دوسری سمت مڑ گیا۔ وہ منہ ہی منہ میں اسے "اللہ حافظ" کہہ کر ڈیپارٹمنٹ کی طرف آ گئی۔ داخلی دروازے پہ آ کر اس نے مڑ کر دیکھا۔

کتنا بڑا ہو گیا تھا وہ۔ دراز قد، چوڑے شانے اور متوازن چال۔

اس کی نگاہیں کافی دور تک اس کے ساتھ ساتھ گئیں۔ پھر ان ہی نگاہوں نے بینچ تک کا سفر کیا جو اب خالی ہو چکا تھا۔ ایک گہری سانس لے کر وہ ڈیپارٹمنٹ میں داخل ہو گئی۔

☆☆☆

برسوں سے جو آگ تن من میں بھڑک رہی تھی، جو اس کے وجود کو، اس کی شناخت کو، اس کی روح کو جلا کر راکھ کر دینے کے درپے تھی، کانوں کے رستے اس پہ پھوار برسا رہی تھی۔ ان کانوں میں پچھلے دو گھنٹوں سے ایک ہی گیت گونج رہا تھا

وہ گیت جو اس وقت درختوں کے پتوں کی سرسراہٹ میں تحرک رہا تھا۔

وہ گیت جو ہوا کی اٹکھیلیوں میں مچل رہا تھا۔

وہ گیت جو چاروں اور بکھری لڑکیوں کے ہلتے ہوئے لبوں پہ رقصاں تھا۔

"امت الاحد۔ احتل۔ امت الاحد۔"

وہ اپنے سر کو ذرا سا پیچھے کر کے ہنس دی تھی۔ آنکھوں میں قندیلیں روشن تھیں، چہرہ ماہتاب کی چاندنی مستعار لیے ہوا تھا۔ اس کا پورا وجود روشنیوں کا مرکز تھا۔ وہ خود سراپا روشنی تھی۔ اس نے امت الاحد کے نام کی اوڑھنی جو اوڑھ رکھی تھی۔

اس کا موبائل گنگنانے لگا تھا۔ وہ چونک گئی۔ اسے لگا وہ بھی "امت الاحد، امت الاحد" گنگنا رہا ہے۔ وہ پھر سے ہنس پڑی اور موبائل اٹھا کر کانوں سے لگا لیا۔

"ہیلو۔"

"کیسی ہیں آپ؟" اس نے لب بھینچ لیے۔ اس وقت یہ آواز سننے کی وہ قطعی خواہش مند نہ تھی۔

"کوئی کام تھا کیا؟" اس کا لہجہ خود بخود سخت ہو گیا۔

"نہیں۔ مجھے آپ سے پوچھنا تھا کہ آپ کو کوئی کام تو نہیں۔"

"مجھے کوئی کام نہیں۔"

"کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتا۔"

"کہا ناں۔ کوئی کام نہیں، کوئی ضرورت نہیں۔" وہ چلائی۔ "اور تم فکر نہ کرو، کوئی کام ہوا تو تمہیں ہی بتاؤں گی۔ آخر کام غلاموں ہی سے تو کروائے جاتے ہیں۔" وہ سلگ کر بولی۔ دوسری جانب خاموشی چھا گئی۔

"کچھ اور کہنا ہے یا فون بند کر دوں۔" وہ اکتائے ہوئے لہجے میں بولی۔ اور تھوڑی دیر انتظار کرنے کے بعد کال ڈس کنیکٹ کرنے ہی والی تھی کہ دوسری جانب سے اس نے اس کا نام لے کر پکارا تھا۔ اسے لگا تار جہنم پھر اس کے اندر بھڑک اٹھی۔ اس کے دانت اتنی سختی سے نچلے ہونٹ پہ جمے کہ لال رنگ ابل پڑا تھا۔

"میری ریکویسٹ ہے۔ پلیز ایسا کچھ مت کیجیے گا جو آپ کے لیے مشکلات پیدا کرے، جو مزید۔"

وہ کیا کہہ رہا تھا، وہ کہاں سن رہی تھی۔ وہ تو بہری ہو چکی تھی۔ اس کے کان جو ابھی کچھ دیر پہلے گیت سن رہے تھے اب سننے کی ہر صلاحیت سے محروم ہو گئے تھے بلکہ وہ تو شاید اپنی بصارت بھی کھو رہی تھی جب ہی تو کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ جو روشنیاں ابھی اس کے ارد گرد تھرک رہی تھیں انہیں اندھیرا کسی اژدھے کی طرح نگلتا جا رہا تھا۔ اور اب چاروں اور اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ مہیب اندھیرا۔

وہ بہت دیر یونہی ساکت وصامت وہاں بیٹھی رہی۔ پھر اس کے اندر حرکت پیدا ہوئی۔ وہ آہستہ سے کھڑی ہوئی اور چل پڑی۔

واش بیسن کے سامنے آ کر وہ اپنی جلتی آنکھوں اور سلگتے چہرے پہ بہت دیر تک پانی چھڑکتی رہی۔ نچلے ہونٹ کے دائیں جانب بہا وہ سرخ قطرہ بھی اپنے پیچھے ہلکا سا نشان اور گہری جلن چھوڑتا ہوا پانی کے ساتھ گھل گیا۔ اس نے اپنے ہونٹ پہ ہاتھ رکھتے ہوئے سامنے لگے آئینے میں دیکھا۔

وہاں اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔

پیچھے واش روم سے ایک لڑکی بالوں میں تولیہ لپیٹے، ہاتھ میں بالٹی تھامے نکلی تھی۔ اسے دیکھ کر وہ اس کے نزدیک آئی۔

"فرسٹ ائیر۔ نیو کمر؟" اس نے اشتیاق سے پوچھا۔ وہ یونہی خالی ذہن اس کی طرف دیکھتی رہی۔ اس نے اپنا سوال دہرایا تو آہستہ سے سر اثبات میں ہلا دیا۔

"کیا نام ہے تمہارا؟" اس نے بالٹی نیچے رکھتے ہوئے گویا انٹرویو کا آغاز کیا۔

"جانے لوگ اتنا مشکل سوال کیوں پوچھتے ہیں؟" اس نے لب کاٹے۔

"ہیلو میم! اپنا نام بھول گئیں کیا؟" لڑکی نے اس کی آنکھوں کے سامنے ہاتھ ہلایا۔

"بھولتا ہی تو نہیں ہے۔" اس نے گہرا سانس لیا۔ اب سوال کیا گیا تھا تو جواب تو دینا ہی تھا اور یہ موت سی گھڑی اس کی زندگی میں کوئی پہلی بار تو نہیں آئی تھی۔ ہمیشہ کی طرح جواب دینے سے پہلے اس کی نظروں کے سامنے ممی کے جڑے ہوئے ہاتھ آ گئے۔

"درگا دیوی۔"

ایک بار پھر۔ اور ایک بار پھر جیسے اس نے اپنا نام نہیں بتایا تھا بلکہ اپنے آپ کو نار جہنم میں جھونکا تھا۔

"اوہ۔" لڑکی نے ہونٹ سکیڑے۔ "میرا نام افشاں ہے میں باٹنی کی۔" اپنے بارے میں کچھ بتا کر کچھ اس کے بارے میں مزید پوچھ کر وہ بالٹی اٹھا کر چل دی۔ اس نے اپنے آپ کو پہچاننے کے لیے پھر آئینے میں دیکھا۔

وہاں تو اندھیرا تھا۔ مہیب اندھیرا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاءاللہ)

☆☆

مکمل ناول

نمرہ احمد

نمل

چودہویں قسط

اسے اب وہ کتاب ڈھونڈنی تھی جس کے ورق کا وہ ٹکڑا تھا۔

اگر وہ اس کتاب کو تلاش کرے تو وہ ہلال تک پہنچ جائے گا۔

☆☆☆

"یعنی تمہارے کوئی پچھتاوے نہیں ہیں؟"

وہ دونوں ابھی تک لاؤنج کے صوفے پہ بیٹھی تھیں۔ کھڑکیوں کے باہر شام اتر رہی تھی۔ زیاد کے

آنے کا وقت ہونے والا تھا۔ رامین کے شوہر کی واپسی بھی متوقع تھی۔

"نہیں۔ زیاد ایک اچھا شوہر ہے۔ ہاں وہ انسٹاگرام والے ناولوں کی طرح نہیں ہے۔ وہ میرے لیے ہر روز پھول نہیں لا سکتا۔ اس کا موڈ خراب بھی ہوتا ہے اور ہماری کھٹ پٹ بھی ہو جاتی ہے۔"

"یعنی وہ نارمل شوہر ہے۔ حقیقی شوہر۔ جیسے شوہر ہوتے ہیں۔" رامین اس کے بولی تو وہ بھی مسکرا دی۔

"ہاں۔ ہم ایک نارمل کپل ہیں اور مجھے اس سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ میں نے اپنی ماں کی بیماری اور ڈپریشن کا دورانیہ بہت وقت سے کاٹا ہے اور اب میں سب کو... اس جادوگر اور تعاقب کار سب کو پیچھے چھوڑ کے آگے بڑھ گئی ہوں۔ میں نے نئی زندگی شروع کر لی ہے۔"

"ویسے زیاد سے باہر فرید کو کیا مسئلہ ہو سکتا ہے؟" رامین کی سوئی وہیں اٹکی ہوئی تھی۔

"معلوم نہیں۔ لیکن اس کی منگیتر کے گھر والوں نے اس کے خلاف پروٹیکشن آرڈر لیا تھا۔ یعنی وہ لوگ چاہتے ہیں کہ قانون ان کو باہر فرید سے تحفظ دے۔"

"تم نے کبھی زیاد کی منگیتر کے گھر والوں سے بات کرنے کی کوشش نہیں کی؟ آخر ان کی کیا کہانی تھی؟" اسے تجسس ہوا۔

"نہیں رامین۔ یہ غیر اخلاقی حرکت ہے کہ میں زیاد کے پیٹھ پیچھے اس کی پرانی منگیتر کو کھوجوں۔ زیاد کو جو بتانا ہوگا خود بتا دے گا۔ پھر وہ زیاد کا ماضی تھا۔ مجھے اس کا تجسس نہیں کرنا چاہیے۔ اور کیف..." رک کے سوچ کر...

"بھئی باہر... تو میں نے اسے معاف نہیں کیا لیکن میرا دل اس کی طرف سے بےزار ہے۔ ویسے بھی اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ وہ استنبول میں رہتا ہے۔ ہم دو مختلف ممالک میں رہنے والے لوگ ہیں۔ سمندروں کا فاصلہ ہے ہمارے درمیان۔ میرا نہیں خیال کہ اب ہماری زندگی میں کبھی سامنا ہوگا۔"

فون بجنے لگا تو اس نے چائے کا کپ رکھا اور موبائل نکالا۔ معید کی کال آ رہی تھی۔ اس نے فون سائلنٹ کر کے ایک طرف ڈال دیا۔ وہ دوست کے گھر آئی تھی۔ معید سے بعد میں بات کرے گی۔ دوبارہ رامین کی طرف متوجہ ہوئی کہ سلسلہ وہیں سے شروع کرے جب میسج ٹون سنائی دی۔

معید کا ایک میسج آیا تھا۔

"کیا تم اور ماہی اگلے ماہ کے وسط تک استنبول آ سکتی ہو؟"

وہ حیران رہ گئی۔

"کیوں؟ کیا ایمرجنسی ہے؟" انگلیاں ٹائپ کرنے لگیں۔

"میں شادی کر رہا ہوں۔"

اس کے ابرو استعجاب میں اٹھے اور لب کھل گئے۔ اس سے پہلے کہ وہ اگلے الفاظ ٹائپ کرتی' سماعتوں میں وہی آواز گونجی۔ بنا نغمے کے میوزک۔

وہی ایک دھن۔

ہیپی برتھڈے ٹو یو۔

وہ چونک کے دائیں بائیں دیکھنے لگی۔ رامین اس آواز سے بےخبر چائے کے برتن اٹھا رہی تھی۔

یہ آواز قریباً پانچ ہفتوں بعد سنائی دی تھی۔

ہیپی برتھڈے ٹو یو۔

☆☆☆

وہ کمرہ سفید دیواروں سے بنا تھا۔ اس میں ایک کیبن کے کراؤن والا سنگل بیڈ رکھا تھا۔ سامنے ایک چھوٹی سی الماری اور اسٹڈی ٹیبل بنی تھی۔ اس کا رنگ گلابی اور ہلکا جامنی تھا۔ بک شیلف کے خانے خالی تھے۔ سوائے چند کتابوں کے وہاں کچھ نہ تھا۔ دیواریں بھی کسی قسم کی سجاوٹ سے خالی تھیں۔ تین دیواروں میں کوئی کھڑکی' کوئی روشن دان نہ تھا۔ چوتھی دیوار میں ایک دروازہ تھا جس کے اندر کی طرف کوئی چٹخنی نہ تھی۔ چٹخنی کا نشان البتہ موجود تھا جیسے اسے نکال دیا گیا ہو۔ صرف ایک ہینڈل اس کا تھا جو باہر سے بند ہوتا تھا۔

پلنگ اس وقت نفاست سے بنا اور خالی تھا۔ پیڈ اسٹڈی ٹیبل کی کرسی البتہ خالی نہیں تھی۔

سامنے اسٹڈی ٹیبل پہ وہ بیٹھی تھی۔

اس نے دونوں کہنیاں میز پہ رکھی تھیں اور اس کا چہرہ کسی شے پہ ہلکا سا جھکا تھا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے کچھ کر رہی تھی۔

اس کی جسامت کافی دبلی پتلی تھی۔ لمبے گھنگریالے بال کمر سے نیچے تک آتے تھے۔ بالوں میں کوئی پن نہیں تھی۔ کوئی بینڈ نہیں تھا۔ وہ بس کھلے تھے۔

اس کی عمر گیارہ برس کے لگ بھگ تھی۔ اس نے پینٹس کے اوپر ٹاپ پہن رکھا تھا۔ جو اس پہ قدرے ڈھیلا تھا۔

دفعتاً وہ گہری سانس لے کر سیدھی ہوئی۔ گردن دائیں طرف موڑی جہاں دروازہ تھا۔ اس کا چہرہ واضح ہوا۔

اس کی آنکھیں بھوری تھیں۔ پلکیں لمبی اور مڑی ہوئی۔ ٹھوڑی پہ زخم کا ایک نشان تھا جو اب مندمل ہو چکا تھا۔ اس نے ایک نظر بند دروازے کو دیکھا۔ باہر سے قدموں کی آواز آ رہی تھی۔ وہ دم سادھے بیٹھی رہی۔ یہاں تک کہ آواز دور چلی گئی۔ وہ پیچھے کو ہو کر بیٹھی۔

اب اس کے سامنے میز پہ رکھی شے واضح ہوئی۔

وہ ایک ننھا سا میوزک باکس تھا جس کا ڈھکن کھلا تھا۔ اس کی چابی ٹوٹ گئی تھی لیکن پانچ ہفتے کی محنت کے بعد بالآخر اس نے اسے جوڑ لیا تھا۔

اس نے ایک نظر دروازے کو دیکھا۔ پھر دھیرے سے چابی گھمائی۔

میوزک باکس میں ایک چھوٹا سا ٹاور بنا تھا جس کے اوپر ریپنزل اپنے بال لٹکائے بیٹھی تھی۔ چابی چھوڑتے ہی ٹاور گول گول گھومنے لگا۔ اور دھن بجنے لگی۔

ہیپی برتھڈے ٹو یو۔

ہیپی برتھڈے ٹو یو۔

اس نے بیٹھے بیٹھے بازو پھیلا لیے۔ اب وہ آرام سے بیٹھی ریپنزل کو گول گول گھومتے دیکھ رہی تھی۔

اسٹڈی ٹیبل پہ دیوار کے ساتھ چند سلے کینوس رکھے تھے۔ ان کی موم کاری نیچے تک بہہ چکی تھی۔ ساتھ رنگ کا پیالہ اور تین پنسلیں بھی موجود تھیں۔

اوپر بک شیلف میں چند بےترتیب کتابوں کے ساتھ ایک سرخ رنگ کی پتلی سی کتاب رکھی تھی جس کے سرورق پہ بہت سے پھول بوٹے بنے تھے۔

اس کے سرورق کا کونا پھٹا ہوا تھا۔

وہ بچوں کا نورانی قاعدہ تھا۔

☆☆☆

"شک عموماً پنپتا ہے تبدیلی سے ذرا پہلے
جب ہر شے تجزیہ ہو رہی ہوتی ہے
اور دنیا عجیب ویران سی لگنے لگتی ہے۔
شک تمہیں آدھی رات کو جگاتا ہے۔
شک تمہیں تب تک جھنجھوڑتا ہے
جب تک تم جان نہ پاؤ کہ کیا غلط ہے۔
شک ایک آواز ہے
پراسرار سا۔
منطق کے ذریعے تمہارا مذاق اڑاتی ہوئی
تمہیں خود کو نادان محسوس کرواتی ہوئی۔
شک کو پروا نہیں ہوتی کہ
وہ کب اور کہاں ضرب لگاتا ہے۔
الفاظ ہتھیار بن جاتے ہیں
اور خیالات تیز
شک تمہارا دل توڑ دیتا ہے
اور تمہارا سانس روک دیتا ہے
اور تم کہتے ہو کہ
مجھے نہ بتاؤ معجزوں کے بارے میں
میں یقین نہیں کر سکتا
جب تک میری آنکھیں دیکھ نہ لیں۔
(نامعلوم)

کئی برس پہلے... ایک دفعہ کا ذکر ہے...

وہ سرما کی ایک یخ بستہ رات تھی۔ کنٹری سائیڈ کے درخت برف باری کے باعث سفید ہو رہے تھے۔ ان کے درمیان میں ایک لکڑی کا کاٹیج (چھوٹا سا گھر) دکھائی دیتا تھا جس کی کھڑکیاں روشن تھیں اور چمنی سے دھواں نکل رہا تھا۔

اس کی کھڑکی سے اندر جھانکو تو سٹنگ روم میں ایک بڑا سا آتش دان بنا تھا جس میں آگ جل رہی تھی۔ لکڑیوں کے سلگنے کی بو میں براؤنیز کے گیلے آمیزے کی مہک بھی شامل ہو گئی تھی۔ آتش دان کے قریب ایک کارنر لیمپ جل رہا تھا جس کے ساتھ ایک سیاہ ونگ چیئر رکھی تھی۔ ماہر اس پہ یوں بیٹھا تھا کہ پیر لمبے کر کے اوٹومن پہ رکھے ہوئے تھے۔ گھٹنوں پہ کمبل ڈال رکھا تھا اور ہاتھ میں ایک موٹی کتاب تھی۔ اس کے سگار کا ایش ٹرے میز پہ رکھا تھا۔

دفعتاً اس نے کتاب چہرے کے آگے سے ہٹائی۔ نگاہیں کچن کاؤنٹر کی طرف بلند ہو گئیں۔

"میں نے تمہاری نینی کا بندوبست کر لیا ہے، لالی۔"

کچن کاؤنٹر پہ بیٹھی ہلال کی اس طرف پشت تھی۔ لمبے گھنگھریالے بال کھلے تھے۔ وہ گود میں رکھے ایک باکس کا گفٹ ریپر اتار رہی تھی۔ اس بات پہ چونک کے گردن موڑی۔ بھوری آنکھوں میں حیرت در آئی۔

"نینی؟ لیکن ماما اور پاپا نے منع کر دیا تھا۔" وہ اداس ہوئی۔ ریپر کھینچتے ہاتھ سست ہوئے۔

"ہلال کا نام لالی کب سے ہوا اور اس کو نینی کیوں چاہیے؟"

کچن میں "پوائی بنائے" جھک کے براؤنیز کا آمیزہ مکس کرتی بیریل پلٹی اور اچنبھے سے باری باری دونوں کو دیکھا۔

"پارک میں سب بچوں کے نک نیم ہیں اور سب کے پاس نینی ہوتی ہے۔ مجھے بھی چاہیے۔" وہ اداسی سے کہتی دوبارہ اپنا گفٹ کھولنے لگی۔ بیریل نے ماہر کو دیکھا۔ اس نے کندھے اچکا دیے۔

"ہلال کو جو چاہیے، وہ ہم اس کو لے دیں گے۔" واپس کتاب چہرے کے سامنے۔

"اگر میں نے یہ فرمائش کی ہوتی تو ماہر فرید کا جواب ہوتا کہ اپنا پارک بدل لو۔" وہ جل کے کچھ اوون کی طرف بڑھ گئی۔ کچن میں بنی چھوٹی کھڑکی کے باہر سفید رات پھیلی تھی۔ برف کے ننھے گالے گرتے دکھائی دے رہے تھے۔ اور آس پاس بھی دور تک برف پھیلی تھی۔ یہ شہر سے دور مضافات میں بنا ایک چھوٹا سا لکڑی کا ویکیشن ہاؤس تھا۔

"یہ کیا ہے، ماہر بھائی؟" آرائشی کاغذ اتار کے اس نے اندر موجود ڈبا نکالا اور ناسمجھی سے اسے دیکھا۔

"پچھلی دفعہ ماہر آفندی نے اپنی بہن کو کینڈل کے علاوہ کچھ دیا ہے، ہم بھی دیکھیں۔" وہ شدید جلا کٹا لگ رہا تھا۔ ایک افسوس بھری نظر اپنے گفٹ پہ ڈالی جو ایک طرف رکھا تھا۔ ایک بہت خوب صورت اور قیمتی گڑیا۔ ہلال نے اسے دیکھ کے ٹھنڈی سانس بھری اور ملامتی نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

"ہلال اب ڈولز سے نہیں کھیلتی۔ ہلال بڑی ہو گئی ہے۔"

تب سے بیریل فرید کا صدمہ کم نہیں ہو رہا تھا۔

ہلال سر جھکائے اب باکس کھول رہی تھی۔ کاؤنٹر سے اس کے پیر نیچے لٹک رہے تھے اور بال چہرے کے دائیں بائیں گر رہے تھے۔

"میوزک باکس۔" اس کی آنکھیں چمکیں۔

وہ ایک میوزک باکس تھا۔ نادر کے اوپر ایک سنہری چوٹی والی لڑکی بیٹھی تھی۔ اس کے بال نادر کی بنیاد کو چھو رہے تھے۔ ہلال نے انگلی اس کے بالوں پہ پھیری۔ آنکھوں میں چمک در آئی۔ پھر اس نے چابی گھما کے چھوڑی۔

"ہیپی برتھ ڈے ٹو یو..."

نادر گول گول گھومنے لگا اور دھن سنائی دینے لگی۔ اس نے مڑی ہوئی پلکوں والا چہرہ اٹھا کے ونگ چیئر پہ نیم دراز کتاب پڑھتے ماہر کو دیکھا۔

"یہ راپنزل ہے نا؟"

کتاب پڑھتے ہوئے جھکی آنکھوں سے ماہر نے گردن کو جنبش دی۔ لبوں پہ مسکراہٹ تھی۔

"یہ گھٹیا سی بھی ایک ڈول ہے۔" بیریل جتا کے پھر آگے بڑھ گئی۔

"کیا آپ مجھے راپنزل کی کہانی سنائیں گے؟" وہ کاؤنٹر پہ رخ موڑ کے بیٹھی ماہر کو دیکھ رہی تھی۔

"Just watch Tangled"

(ٹینگلڈ دیکھ لو) بیریل کی جلی کٹی بڑبڑاہٹ ابھری تھی۔

"وہ ڈزنی ورژن ہے۔ میں تمہیں اصل ورژن سناتا ہوں۔" اس نے کتاب لہرائی۔ ہلال کی آنکھیں چمکیں۔ اس نے میوزک باکس کاؤنٹر پہ رکھا اور جست لگا کے نیچے اتری۔ پھر بھاگ کے اس کی ونگ چیئر تک آئی۔ ماہر نے کمبل ہٹایا۔ اس کے لیے جگہ بنائی۔ وہ صوفے کے بازو اور اس کے کندھے کے درمیان فٹ ہو کے بیٹھ گئی اور سر اس کے کندھے پہ رکھ لیا۔

"برادرز گریم کا ورژن قدرے تلخ ہے۔ سنو گی؟" اس نے کتاب دونوں ہاتھوں میں پکڑ رکھی تھی ایسے کہ ایک بازو ہلال کے گرد سے گزار رکھا تھا۔ اس نے جھٹ سر اوپر نیچے ہلایا۔

"کئی برس پہلے... ایک دفعہ کا ذکر ہے..."

"ساری کہانیاں ایسے کیوں شروع ہوتی ہیں؟"

"کیونکہ رائٹرز ہمیں یہ نہیں بتانا چاہتے کہ وہ واقعہ کب پیش آیا۔" اس نے کتاب کا صفحہ پلٹایا۔ "راپنزل کی کہانی شروع ہوتی ہے کسی خواہش سے..."

"کس کی؟ ماہر فرید؟" آمیزہ مکس کرتے بیریل نے سر اٹھا کے اسے گھورا۔ لیکن وہ اس کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ وہ کتاب سے پڑھ کے سنا رہا تھا اور ہلال انگلی پہ گھنگھریالی لٹ لپیٹتی چھت کو دیکھ رہی تھی جہاں آتش دان سے جلتی آگ کا سایہ پڑ رہا تھا۔

"ایک عورت اور اس کے شوہر کو ایک بچے کی خواہش تھی۔ لیکن ان کی یہ خواہش پوری نہیں ہو رہی تھی۔"

"اس جنگل بیابان میں سالگرہ منانے کی کیا ضرورت تھی؟ یہاں بیکنگ کا مکمل سامان تک نہیں ہے۔" اب وہ بڑبڑاتے ہوئے کیبنٹس کھول بند کر رہا تھا۔

"ان کے گھر کی عقبی کھڑکی سے ایک باغیچہ دکھائی دیتا تھا جو خوب صورت پھولوں اور جڑی بوٹیوں سے بھرا تھا۔ وہ ایک جادوگرنی کا باغ تھا۔"

"جادوگرنی کیا ہوتی ہے؟"

"ایک ایسی عورت جو جادو کر کے لوگوں کی زندگیاں خراب کرتی ہو۔"

"کیا جادو واقعی ہوتا ہے؟" اس نے ماہر کو دیکھتے ہوئے پلکیں جھپکائیں۔

"نہیں۔ صرف کہانیوں میں ہوتا ہے۔" وہ دھیرے سے ہنس دیا۔ یہ سیاہ گھوڑے کے قصے سے بہت پہلے کی بات تھی۔

"ایک روز اس عورت نے دیکھا کہ جادوگرنی کے باغ میں ایک خوب صورت راپنزل اگا ہے۔ راپنزل ایک پودے کا نام تھا۔ اس کے اندر اس ممنوعہ پودے کو کھانے کی خواہش بیدار ہوئی اور اس نے اپنے شوہر سے کہا کہ اگر اسے راپنزل کھانے کو نہ ملا تو وہ مر جائے گی۔"

"کیا وہ واقعی مر جاتی؟" وہ اس کے کندھے پہ سر رکھے نگاہیں چھت پہ ناچتے سائے پہ جمائے ہوئے تھی۔

"نہیں۔ انسان کسی کے لیے نہیں مر سکتا۔ بس اس کی خواہش جب حد سے بڑھ جائے تو وہ بڑی ہو کے دکھائی دینے لگتی ہے۔"

بیریل نے آمیزہ بیکنگ ڈش میں انڈیلتے ہوئے ایک افسوس بھری نگاہ اس پہ ڈالی۔

"اور برادر آف دی ائیر کا ایوارڈ ماہر فرید کے

نام ہو۔"

"پھر کیا ہوا؟"

"شوہر نے جادوگرنی کے باغ سے ریپنزل توڑ کے اسے لا دیا۔ کچھ دن بعد اس نے پھر وہی خواہش کی۔ اس دفعہ شوہر باغ میں دیوار پھاند کے گیا تو سامنے جادوگرنی کھڑی تھی۔"

"وہ پکڑا گیا؟" ہلال نے افسوس سے دائیں بائیں سر ہلایا۔ وہ اب بھی چھت کو ہی دیکھ رہی تھی۔

"اس نے جادوگرنی کی منت کی کہ ریپنزل کے بغیر اس کی بیوی مر جائے گی۔ اس پہ جادوگرنی نے کہا کہ وہ جتنے چاہے ریپنزل توڑ کے کھالے' بدلے میں انہیں اپنا بچہ اس کو دینا ہوگا۔ اپنی جان بچانے کے لیے اس نے جادوگرنی سے ڈیل کر لی۔"

"ڈزنی ورژن میں بچی اغوا ہوئی تھی۔" بیریل کھنکھارا لیکن وہ دونوں اس کی طرف متوجہ نہ تھے۔

"جب ان کے ہاں ایک بچی پیدا ہوئی تو جادوگرنی اس کو لینے آ پہنچی اور ان میاں بیوی نے خود اپنی بچی اس کو دے دی۔"

بیریل کمر پہ ہاتھ رکھے کھڑا افسوس سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"بچوں کو برادرز گریم کا ورژن کون سناتا ہے؟"

"جادوگرنی نے اس کا نام ریپنزل رکھا۔ وہ سورج تلے رہنے والی لڑکیوں میں سب سے خوب صورت لڑکی تھی۔" وہ کتاب سے پڑھ رہا تھا۔ ہلال کی آنکھیں کاؤنٹر ٹاپ پہ رکھے میوزک باکس پہ جمی تھیں۔ "اس نے ریپنزل کو ایک ٹاور میں قید کر دیا جس کی کوئی سیڑھی یا دروازہ نہ تھا۔ صرف ایک کھڑکی تھی۔"

"ریپنزل ٹاور میں قید کیا کرتی تھی؟"

"وہ چیٹ کرتی تھی اور کھڑکی میں بیٹھ کے گنگناتی تھی۔"

"کیونکہ وہ بور ہوتی تھی اور اس کے پاس انٹرنیٹ نہیں تھا۔" بیریل کا ایک اوون میں تھا اور وہ کاؤنٹر سے ٹیک لگائے کھڑا کینہ توز نظروں سے ماہر کو دیکھ رہا تھا۔

ہلال نے پہلی دفعہ نظروں کا رخ موڑ کے بیریل کو دیکھا۔

"وہ بور نہیں ہوتی تھی۔ وہ گنگنا کے اپنی ماں کو بلا رہی تھی۔"

ماہر نے کتاب کے صفحے پلٹے۔ پھر نفی میں سر ہلایا۔ "نہیں۔ کہانی میں اس کی ماں کا ذکر نہیں ہے۔"

"وہ اپنی ماں کو بلا رہی تھی۔" وہ زور دے کر بولی۔ کچھ تھا اس کے انداز میں جو ماہر چونک کے اسے دیکھنے لگا۔

"ایسے کیوں کہہ رہی ہو؟"

ہلال اپنی عنری ہوئی پلکوں والی آنکھوں سے چند لمحے اسے دیکھتی رہی۔

"میری نگی کون ہے؟" اس کا سوال غیر متوقع تھا۔ ماہر نے کتاب کا صفحہ موڑا اور گہری سانس لی۔

"وہ جھیل کے کنارے ایک چھوٹے سے گھر میں مقیم ہے۔ اس شہر میں جہاں میں رہتا ہوں۔ وہ تمہارے سب کاموں کی ذمہ دار ہوگی۔"

☆☆☆

موجودہ دن۔

سفید اور گلابی کمرے کی دیواریں خاموشی سے اسے دیکھ رہی تھیں۔ وہ اسٹڈی چیئر پہ بیٹھی میوزک باکس پہ سر جھکائے' ریپنزل کے بالوں پہ انگلی پھیر رہی تھی۔ دفعتاً قدموں کی آواز سنائی دی۔ وہیل چیئر کے پہیے... مانوس خوشبو۔ اس نے رخ پورا موڑ لیا۔ اب اس کی دروازے کی طرف پشت تھی اور میوزک باکس ہاتھ میں اٹھا رکھا تھا۔

لاک کھلنے کا کلک سنائی دیا۔ پھر دروازہ پورا کھلتا چلا گیا۔

"کیسی ہو' ہلال؟" چوکھٹ سے نگینہ بیگم کی وہیل چیئر اندر آتی دکھائی دی۔ اندرانی اسے دھکیل رہی تھی۔ ساتھ ایک شلوار قمیص اور واسکٹ والا آدمی تھا جس کی سیاہ مونچھیں تھیں اور گال پہ ایک موٹا سا تل تھا۔ جب وہ تینوں اندر داخل ہو گئے تو آدمی نے دروازہ بند کر دیا۔

"میوزک کیوں بجاتی ہو؟" نگینہ بیگم سر کے نیچے ہاتھ میں تھامے مسکرا کے نرمی سے پوچھ رہی تھیں۔ اس نے جواب نہیں دیا۔ سر جھکائے ریپنزل کی کسی چوٹی انگلی پہ لپیٹے گئی۔

"کتنے اچھے طریقے سے رہتی ہو۔" نگینہ بیگم نے اطراف میں نگاہیں دوڑائیں۔ "کتنی اچھی بچی ہے' کتنی صاف ستھری' اتنی پیاری۔ میوزک کیوں بجاتی ہو؟" ہلال نے میوزک باکس گود میں رکھ لیا اور ہاتھ اس پہ لپیٹ لیے۔ اس کی آنکھیں باکس پہ جھکی تھیں۔

"مجھے یہ باکس مشکوک لگتا ہے' سرکار یہ کچھ بلا کر رہی ہے۔"

تل والا آدمی ناپسندیدگی سے اس کی کرسی کی پشت کو دیکھ رہا تھا۔

"وہ اپنی ماں کو بلا رہی ہے۔" نگینہ بیگم نے وہیل چیئر کا بٹن دبایا۔ وہ چند قدم آگے سرک آئی۔ اندرانی نے چیئر کے ہینڈل کو چھوڑ دیا۔

"لیکن تمہاری ماں تو مر چکی ہے' ہلال! کیا فائدہ میوزک بجانے کا؟" انہوں نے نرمی سے اس کے گھنگریالے بالوں پہ ہاتھ پھیرا۔

"اور رہے تمہارے بھائی تو وہ بھی تمہیں بھلا کے اپنی زندگیوں میں مصروف ہو چکے ہیں۔"

ہلال خاموشی سے اب دیوار کو دیکھ رہی تھی۔ چہرے پہ کوئی تاثر نہ تھا۔

"لیکن ایک بات تم نے مجھے کبھی نہیں بتائی۔" وہ اس کی گھنگریالی لٹوں کو ہاتھ میں لیے دیکھ رہی تھیں۔ "تمہاری نگی کون تھی؟"

ہلال کی بھوری آنکھیں دیوار پہ جمی تھیں۔ ان میں کوئی جذبہ نہ تھا۔

"وہ تمہارے ساتھ کھوئی تھی۔ یہ تمہارے بھائی نے کہا ہے۔ لیکن مجھے اس کے الفاظ کا بھروسہ نہیں ہے۔" وہ دھیرے دھیرے کہہ رہی تھیں۔ اندرانی اور وہ آدمی ناگواری سے کرسی پہ رخ موڑے بیٹھی ہلال کو دیکھ رہے تھے۔

"تمہاری نگی کے ساتھ ہم نے کچھ نہیں کیا۔ پھر وہ کہاں گئی؟ میرے اندازے کے مطابق اس کو تمہارے بھائی نے چھپا رکھا ہے۔ کہاں؟ تم مجھے بتاؤ گی۔"

تل والے آدمی نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

"آپ نرمی کر رہی ہیں۔ سختی سے کام لیں تو یہ ایک منٹ میں...."

"نہیں' ولایت۔"

"سب سے پہلے ریش (خارشیں) شروع ہوئی تھی۔" دیوار کو دیکھتی ہلال کے لب پھڑپھڑائے۔ وہ تینوں چونک کے اسے دیکھنے لگے۔

"پھر بازوؤں پہ سرخ نشان ابھرنے لگے۔ سوجن۔"

اندرانی اور ولایت نے الجھن سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ لیکن نگینہ بیگم کی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ ان کا بایاں ہاتھ بے اختیار اپنے دائیں بازو پہ رینگ گیا۔

"پھر تم راتوں میں اچانک بیدار ہونے لگیں۔ ایسے کہ تم پسینے میں نہائی ہوتی تھیں۔ تمہیں سانس چڑھنے لگا اور ہر وقت جسم پہ خارش رہنے لگی۔" اس کے لب مل رہے تھے۔ آنکھیں خلا میں کچھ دیکھ رہی تھیں۔

"تمہاری ہڈیوں میں درد رہنے لگا۔ کیونکہ وہ تمہاری ہڈیوں کے اندر تھا۔" اس نے گردن ذرا سی موڑی۔ ایسے کہ نگینہ بیگم اس کا نیم رخ دیکھ سکی تھیں۔

"کینسر۔"

اندرانی نے برہمی سے اسے گھورا لیکن وہ یک ٹک اسے دیکھ رہی تھیں۔

"وہ اب بھی تمہاری ہڈیوں میں ہے اور وہ بڑھتا جائے گا۔ تمہارا جسم ٹھنڈا پڑنے لگے گا۔ ہر وقت خارش ہوگی۔ بھوک نہیں لگے گی۔ تمہارا سانس

مشکل ہو جائے گا۔ اور پھر۔ اسی طرح تم مر جاؤ گی۔"

اس کے لہجے کا سرد پن نگینہ بیگم کے خون کو منجمد کر رہا تھا۔

"تمہاری بچی کہاں ہے ہلال؟" وہ بولیں تو آواز کپکپائی تھی۔

ہلال نے چہرہ واپس دیوار کی طرف موڑ لیا۔ اب اس کے لب بند تھے۔

"یہ باہر فرید کی کوئی چال ہو سکتی ہے۔ ہو سکتا ہے وہ بچی مر چکی ہو۔" ولایت نے سر جھکا کے ناپسندیدگی لیکن تعظیم سے کہا۔

"موکل کیا کہتے ہیں سرکار؟" اندرانی نے سوال داغا۔ نگینہ بیگم نے گہری سانس لی۔

"اگر وہ کم عقل اس قابل ہوتے تو آج ساری دنیا پہ ہماری حکومت ہوتی۔" انداز میں افسوس تھا۔ "وہ اتنا جانتے ہیں جتنی ان کی عقل اور سمجھ ہوتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہلال کے پاس ایک بچی تھی۔ وہ کون ہے' کہاں ہے' وہ نہیں جانتے۔ صرف ہلال جانتی ہے یا باہر۔ اس کا پورا نام جانے بغیر وہ کچھ نہیں بتا سکتے۔"

پھر انہوں نے ہلال کے سر کی پشت کو دیکھا۔ "ہلال... صرف تم میری مدد کر سکتی ہو۔ مجھے اس کے بارے میں بتاؤ۔"

کمرے میں سرد سی خاموشی چھائی رہی۔ چند لمحے یونہی گزر گئے۔ صرف ان چار افراد کے تنفس کی آواز سنائی دیتی رہی۔ پھر نگینہ بیگم نے اندرانی کو اشارہ کیا۔ وہ ان کی وہیل چیئر موڑنے لگی۔

"وہ اس شہر میں رہتی ہے جہاں میرا بھائی رہتا ہے۔"

وہیل چیئر چلاتی اندرانی رک گئی۔ ولایت نے بھی چونک کے دیکھا۔

"جھیل کے قریب ایک چھوٹے سے گھر میں ساکن تھا۔" وہ اب کرسی کو موڑ کے اسٹڈی ٹیبل تک لے آئی۔ اور میوزک باکس میز پہ رکھا۔

اس نے ابھی تک آنکھوں کا رخ ان کی طرف نہیں کیا تھا۔

نگینہ بیگم کے لبوں پہ مسکراہٹ در آئی۔ انہوں نے اثبات میں سر ہلایا۔

"میں اسے ڈھونڈ لوں گی۔ ولایت...!" تحکم سے آواز دی۔ وہ فوراً جھکا۔

"جی سرکار۔"

"ہلال سچ بول رہی ہے۔ اس لیے آج سے تم ہلال کا دروازہ لاک نہیں کرو گے۔ اگر وہ ان لوگوں کے پاس واپس جانا چاہے جو اس کو بھلا چکے ہیں تو اس کی مرضی ہے۔ ہلال آزاد ہے۔"

ہلال اب سر جھکائے میوزک باکس کے تار پہ انگلی پھیر رہی تھی۔

"اگر وہ بھاگ گئی تو؟"

دروازہ باہر سے بند کرتے ہوئے ولایت کا ہاتھ لاک تک گیا۔ پھر اس نے ہاتھ نیچے کر دیا۔ انداز میں فکرمندی تھی۔

"بے فکر رہو۔ ہلال کبھی نہیں بھاگے گی۔" نگینہ بیگم مسکرا کے بولیں۔ وہ مطمئن تھیں۔

اندر سے ایک دفعہ پھر سے میوزک کی آواز سنائی دینے لگی تھی۔ اندرانی ان کی وہیل چیئر دھکیلتی اب دور جا رہی تھی اور ولایت تشویش سے کھڑا ان کو جاتے دیکھ رہا تھا۔

☆☆☆

ہیپی برتھ ڈے ٹو یو کی ٹون اب دم توڑ چکی تھی۔ البتہ موبائل اسکرین پہ معید کا میسج ہنوز جگمگا رہا تھا۔

"کیا اچانک سے شادی کا کیا قصہ ہے معید؟" گھر واپس آتے ہی معید کو کال کرنے سے پہلے اس نے تین گہرے سانس لیے تھے۔ اس وقت معید پہ بے انتہا غصہ آ رہا تھا لیکن سانسوں نے غصے کو دبا دیا۔ جب مالا نے اسے کال ملائی تو لہجہ نرم اور پرسکون تھا۔

"وہ میری کلاس فیلو ہے بشریٰ۔ اس کی وجہ سے پھر بھی آ گئی تھی۔" وہ قدرے گھبرایا ہوا سا تھا۔

"تم نے ملوایا ہوتا تو مجھے یاد ہوتا۔"

"وہ ہمارے گروپ کے ساتھ فیلوشپ کے لیے ہی آئی تھی۔ اب اس کے دادا بہت بیمار ہیں اور وہ چاہتے ہیں کہ اس کی شادی ہو جائے۔ ایمرجنسی میں سب کچھ ہو رہا ہے۔ اس کی فیملی آ رہی ہے نکاح کے لیے۔"

"تم لوگ پاکستان کیوں نہیں جا رہے؟ وہ یہاں کیوں آ رہے ہیں؟"

"یار ہمارا سنگل انٹری ویزا ہے۔ فیلوشپ درمیان میں نہیں چھوڑ سکتے۔" وہ قدرے زچ ہوا۔ "اس کی فیملی کو یہی بہتر لگا تھا۔"

"اور تمہاری فیملی؟ ان کو بلانا ہے یا ان کے بغیر ہو جائے گا نکاح؟" اس کی آواز میں درشتی در آئی۔

"ماما یار کیوں اتنی مشکل ہو رہی ہو؟" وہ جھلا گیا۔ "خود تم اور بابا اپنی اپنی زندگیوں میں سیٹ ہو۔ تم دونوں نے اپنی مرضی سے شادی کی۔ اب تمہیں مجھے سپورٹ کرنا چاہیے۔"

"معید! ہماری شادیاں ہمارے بچوں کو سامنے رکھ کے ہوئی تھیں۔ ایسے نہیں کہ فون پہ اطلاع دے دی۔ ہم سپورٹ تب کریں جب تم ہمیں کچھ بتاؤ تو سہی۔ تم نے ہمیں اعتماد میں لیے بغیر سب طے کر لیا۔"

"یار بتا رہا ہوں نا۔ مجبوری ہے۔" وہ دھیما پڑا۔ "بابا غصہ کریں گے۔ جانتا ہوں لیکن مجھے تمہاری سپورٹ چاہیے۔"

مالا نے گہری سانس لی۔ بہت سا غصہ سانس کے ساتھ فضا میں غائب ہوا۔

"میرے پاس تمہاری سپورٹ کے سوا کیا آپشن ہے معید؟"

"یعنی تم آؤ گی؟" وہ جیسے خوش ہوا۔

"ظاہر ہے ہم آئیں گے۔ اب تم بابا سے بات کرو۔" تاکید کر کے اس نے فون رکھ دیا۔ سر میں درد ہونے لگا تھا۔

اپارٹمنٹ میں خاموشی چھائی تھی۔ زیاد ابھی گھر نہیں آیا تھا۔ وہ وہیں لاؤنج میں بے چینی سے چکر کاٹنے لگی۔

معید آج سے بیس دن بعد کی تاریخ کا کہہ رہا تھا۔ شکر ہے کہ اس کے پاس امریکی ویزا تھا۔ جس کی بنا پہ وہ ترکی کا ای ویزا آدھے گھنٹے میں لے سکتی تھی لیکن زیاد کو ویزا اپلائی کرنا ہو گا۔ اسے یاد تھا کہ جب ماں کی زندگی میں نگینہ آنٹی ان کے گھر آئی تھیں تو انہوں نے باتوں باتوں میں زیاد کی منگیتر بہن کی موت کا ذکر کرتے ہوئے بتایا تھا کہ زیاد اس وقت یو کے نہیں جا سکا تھا کیونکہ اس کے پاس یو کے کا ویزا نہیں تھا۔ وہ اس وقت ڈائننگ روم میں کھانا لگاتے ہوئے ان کی گفتگو سن رہی تھی۔ یہ بات ذہن میں رہ گئی تھی۔ ترکی کا ویزا لگنے میں دو ہفتے لگ ہی جاتے ہیں۔ اگر زیاد کا ویزا نہ آیا تو؟

وہ ٹہلتے ٹہلتے رک گئی۔ اس کا امریکی ویزا کئی برس پہلے لگا تھا۔ وہ پانچ سال کا ویزا تھا۔ اس کی ایکسپائری ڈیٹ آنے میں چھ ماہ سے کم عرصہ ہوتا تو اس کا ترکش ویزا نہیں لگ سکے گا۔

وہ تیزی سے کمرے میں آئی اور الماری کھولی۔ اندر ایک لاکر نصب تھا جس میں زیاد اور وہ اپنے پاسپورٹ رکھتے تھے۔ پاس ورڈ اسے معلوم تھا۔ اس نے جلدی سے ہندسے دبا کے لاکر کھولا۔

اس کا سبز پاسپورٹ پتلا سا تھا۔ زیاد کے تین نئے پرانے پاسپورٹ ایک ساتھ اٹیچ تھے۔ اس نے تیزی سے اپنا پاسپورٹ نکالا اور صفحے پلٹاتے امریکی ویزے کی میعاد دیکھی۔ پھر گہری سانس کھینچی۔ اس کی ایکسپائری میں ابھی بہت وقت تھا۔

مالا نے ایک صفحہ پلٹا۔ اس کا غیر استعمال شدہ کینیڈین ویزا وہاں موجود تھا۔ لبوں پہ اداس مسکراہٹ در آئی۔ ماں اور اس نے ماہی کے بچے کی پیدائش پہ کینیڈا جانے کے لیے یہ ویزا لگوایا تھا لیکن نہ جانے اب وہ اسے کبھی استعمال بھی کر سکے گی یا نہیں۔

اس نے اپنا پتلا پاسپورٹ واپس رکھا۔ پھر نظر زیاد کے پاسپورٹس پہ پڑی۔ تینوں پاسپورٹ ایک

ساتھ ایچ تھے۔ جانا وہ بہت ٹریول کرتا تھا یا اس کے ایکسپائرڈ پاسپورٹس میں کچھ طویل دورانیے کے ویزے ہوں گے۔ اس نے یونہی وہ پاسپورٹ اٹھائے اور صفحے پلٹنے لگی۔ شاید زیاد کے پاس امریکی پاسپورٹ یا ویزا ہو جس کی بنا پہ وہ ترکی کا ای ویزا فوراً حاصل کر سکے۔

اگلے ہی لمحے اس کے ابرو تعجب سے اکٹھے ہوئے۔ اس نے صفحات آگے پیچھے پلٹے۔

زیاد کے پاس امریکی ویزا تھا۔

اس کے پاس شینجن ویزا بھی تھا۔

اور اس کے پاس دس سال کا یو کے کا ویزا بھی تھا۔ جو چھ برس پہلے لگا تھا۔

وہ ایک ایک کر کے صفحات پلٹتی گئی۔ بہت سے ممالک میں دخول اور خروج کے وقت کی لگی مہریں اپنی تاریخوں کے ساتھ درج تھیں۔ زیاد اتنا سفر کرتا ہے اسے معلوم نہ تھا۔ لیکن یہ بات اتنی قابل حیرت نہ تھی۔ وہ یو کے انٹری اور ایگزٹ کی مختلف تاریخیں دیکھ رہی تھی۔

سبرینہ کی موت جس سال ہوئی تھی اس سال زیاد تین دفعہ یو کے گیا تھا۔

وہ الجھنے سے پاسپورٹ دیکھ رہی تھی۔ اس نے مالدیپ یا سعودیہ کی فلائٹس کے دوران بھی زیاد کا پاسپورٹ اندر سے نہیں دیکھا تھا۔ کبھی ضرورت ہی نہیں پڑی تھی۔ نہ کبھی زیاد نے اس کے سامنے پاسپورٹ کھولا تھا۔

بیرونی دروازے کا لاک کھلنے کی آواز آئی تو وہ چونکی۔ پھر تیزی سے پاسپورٹ واپس رکھے۔ جلدی جلدی لاک کر کے بند کیا۔ دل ایک دم زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔ وہ آئینے کے سامنے آ کھڑی ہوئی اور یونہی بالوں میں برش پھیرنے لگی۔ بدقت مسکرانے کی کوشش کی لیکن چہرے پہ چھائی تشویش کم نہیں ہو رہی تھی۔

"السلام علیکم۔" وہ ہشاش بشاش لہجے میں کہتا اندر داخل ہوا۔ اس کے کندھے پہ لیپ ٹاپ بیگ اسٹریپ سے لٹکا تھا۔ آنکھوں پہ گلاسز تھے۔ وہ اسے دیکھ کے زبردستی مسکرائی۔

"کیا ہوا؟ پریشان لگ رہی ہو۔" وہ بغور اس کو دیکھتا آگے بڑھ گیا۔

وہ آئینے میں اپنا عکس دیکھنے لگی۔ برش ابھی تک ہاتھ میں تھا۔

(بنا اجازت کسی کا پاسپورٹ کھول کے دیکھنا ایک غیر اخلاقی حرکت ہے کشمالہ بیگم۔) اس کے دل نے ملامت کیا۔

(شاید مجھے بیگم کو غلط فہمی ہوئی ہو۔ بوڑھی بیمار عورت ایسی تفصیلات بھول سکتی ہے۔)

لیکن دماغ نے سرگوشی کی۔ (وہ دن یاد ہے جب تم نے کیف کے کار سے نکلنے کے بعد اس کا والٹ کھولا تھا؟ دل نے تب بھی ملامت کیا تھا اور تم نے تب بھی درست کیا تھا۔)

(او کیف)... اس کے دل نے تھک کے ہاتھ جوڑے۔ (تم نے میرے اعتبار کو damage (توڑ) کر دیا ہے۔ میں اب کسی پہ بھی اعتبار نہیں کر سکوں گی۔)

وہ ایسے نہیں کیا کرتی تھی۔ اوشن میں کسی ملازم پہ شک ہوتا کہ وہ بے ایمانی کر رہا ہے تو وہ اس کی جاسوسی نہیں کرواتی تھی۔ پیٹھ پیچھے اس کے بارے میں انکوائری نہیں کرتی تھی۔ وہ اس کو اپنے آفس میں بلوا کے اس کی آنکھوں میں دیکھ کے بات کرتی تھی۔ پھر اس کو جسٹس پہ بھیج کے اس کی مکمل انکوائری کرتی تھی۔ اگر وہ سچا ثابت ہوتا تو کام پہ واپس آ سکتا تھا۔ نہیں تو اس کو نوکری سے برخاست کر دیا جاتا تھا۔ اس سے یہ کھیل نہیں کھیلے جاتے تھے۔

لیکن اس ایک شخص نے اعتبار ایسا توڑا تھا کہ سب کچھ بدل گیا تھا۔

☆☆☆

"استنبول میں شادی؟ وہ بھی بیس دن بعد؟ اچھا مذاق ہے بھئی۔" زیاد کا سنتے ہی موڈ آف ہوا۔

"بھائی ہے میرا۔ مجھے جانا ہی ہوگا۔"

وہ اس وقت ڈائننگ ٹیبل پہ بیٹھے تھے جو کچن کا ہی حصہ تھی۔ ان کے سامنے ٹیک آؤٹ کے باکسز میں (چاول مرغی کا ایک پکوان) سجا تھا اور ننھی ڈبیوں میں چٹنیاں اور سلطہ حارہ سا سرخ سلاد رکھا تھا۔ وہ چاولوں اور روسٹ چکن سے اٹھتی مہک سے بے نیاز بغور زیاد کے چہرے کے بگڑے تاثرات کو دیکھ رہی تھی۔

"مجھے چھٹی نہیں ملے گی۔ پہلے ہی اتنے دن مالدیپ میں ضائع ہو گئے۔" زیاد نے چمچ نیچے رکھ دیا۔

"ویک اینڈ پہ ہے شادی۔"

"ترکوں کا ویک اینڈ جمعہ ہفتہ ہوتا ہے۔ شادی اتوار کو ہے۔"

"ہم جمعرات کی رات جا کے اتوار کی رات آ جائیں گے۔ ایک اتوار کی چھٹی تو مل جائے گی۔ ویسے بھی آپ زیادہ تر ورک فرام ہوم کرتے ہیں۔" وہ چمچ جھکائے چاولوں کے کنارے پہ سفید قیمہ ڈال رہی تھی۔ زیاد نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

"سعدیہ کو سمجھنا چاہیے کہ ہر کوئی اتنی ایمرجنسی میں نہیں آ سکتا۔"

"میں جا سکتی ہوں۔ میری کوئی جاب ہے نہ مجبوری۔ جدہ سے استنبول تین گھنٹے کی فلائٹ ہے۔ امریکی ویزے کی وجہ سے مجھے ای ویزا بھی مل جائے گا۔ البتہ آپ کو شاید ویزا اپلائی کرنا پڑے۔" اس نے آنکھیں اٹھا کے بغور زیاد کو دیکھا۔ وہ سر جھکائے چاولوں میں چمچ چلانے لگا۔

"ویزا آنے میں بھی دو ہفتے لگ جاتے ہیں۔" نظر سے بچا لیا۔ مالا رک کے اسے دیکھنے لگی۔ وہ مسلسل مسافرت میں رہتا تھا۔ کیا اسے معلوم نہ تھا کہ ترکی کے فوری ای ویزے کے لیے جو تین ملکوں کے ویزے چاہیے تھے وہ اس کے پاسپورٹ پہ موجود تھے۔ کیا اسے زیاد سے پوچھنا چاہیے؟ انگوٹھی والے واقعے کی طرح وہ پوچھنے پہ ایک صفائی دے دے گا اور وہ مطمئن ہو جائے گی۔ تبھی اسے خاموشی سے انتظار کرنا چاہیے۔

"آپ چھٹی اپلائی تو کریں۔" اس نے سرخ ٹماٹو پیسٹ سے بنی سلطہ حارہ ساس کی ڈبی اس کی طرف بڑھائی۔ زیاد نے اسے نہیں چھوا۔ وہ بنا کسی ساس کے اپنے بھورے چاول کھاتا رہا۔ اس کا ذہن بھی بٹ چکا تھا۔

"آپ جانتے ہیں کہ مجھے ٹریول کا کتنا شوق ہے۔ اس بہانے ہم استنبول بھی دیکھ لیں گے۔"

"میرے مالی حالات ایسے نہیں ہیں کہ میں ہر مہینے تمہیں ایک انٹرنیشنل ٹرپ پہ لے کر جاؤں۔ ہم ابھی مالدیپ سے ہو کے آئے ہیں۔ پھر ایک نیا انٹرنیشنل ٹرپ؟" وہ ناگواری سے بولا۔ مالا چونک کے اسے دیکھنے لگی۔ اس کے پاسپورٹس کے مطابق وہ ہر ایک دو ماہ بعد کسی دوسرے ملک جاتا تھا۔ وہ افورڈ کر سکتا تھا۔ پھر ایسے کیوں کہہ رہا تھا؟

"ہماری ماں نہیں ہے زیاد اور اب میں اس کی ماں کی جگہ پہ ہوں۔"

"ماں کی جگہ پہ ہوتیں تو وہ پہلے بتاتا۔ اسے تمہاری کوئی خاص پرواہ نہیں ہے۔" وہ ایک دم تلخ ہوا۔

"وہ مجھے کیا اور کتنا بتاتا ہے یہ ہم بہن بھائی کا معاملہ ہے۔ آپ کو اس کے بارے میں ایسے بات نہیں کرنی چاہیے۔" اس نے چاولوں کی پلیٹ پرے کھسکا دی۔ اس کا چہرہ بھی بجھ گیا تھا۔

ہنی مون ختم ہو چکا تھا اور حقیقی زندگی شروع ہو چکی تھی۔

"آئی ایم سوری۔ مجھے یوں نہیں کہنا چاہیے تھا۔" وہ دھیما پڑا۔ "جانتا ہوں تم اپنے بہن بھائی کو مس کرتی ہو۔ یہاں اکیلی گھر میں بور ہوتی ہو۔ اس لیے..."

"میں زیادہ دن بور نہیں ہوں گی۔ ڈونٹ وری۔" اس نے اسی انداز میں پلیٹ دوبارہ قریب کی اور سرخ ساس زور سے پلیٹ پہ انڈیلی۔ تلخ

ٹھک۔ ڈلی جھنگی۔ سانس چاولوں پہ منتقل ہوگئی۔ وہ
جھکی آنکھوں سے اب چمچ چلا رہی تھی اور وہ چونک
کر اسے دیکھ رہا تھا۔
"کیا مطلب؟"
"وہی کروں گی جو ہمیشہ سے کرتی آئی
ہوں۔" مالا نے چمچ منہ میں رکھنے سے پہلے اس کی
آنکھوں میں دیکھا۔
"کام۔" زور دے کر بولی۔
زیاد سلطان کے چہرے پہ سایہ سا گزرا۔
کندھے ڈھیلے ہوئے۔
"کام؟ یہاں؟" تھوک نگلا۔
"میں ایک کیریئر وومن ہوں زیاد۔" وہ چکن کا
پیس توڑتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ "اتنے سال اتنی
محنت سے اپنا کیریئر بنایا تھا۔ تیمور نے مجھ سے اوتھن
لیا ہے۔ میرا تجربہ نہیں تھا ماں کی بیماری کے ٹراما اور
پھر شادی کی مصروفیت میں، میں اپنے کام پہ دھیان
نہیں دے سکی لیکن اب مجھے واپس اپنی اصل
ڈائریکشن میں جانا ہے۔ مجھے اپنا کیریئر پھر سے تعمیر
کرنا ہے۔"
"تم جاب کرنا چاہتی ہو؟" اس نے جگ سے
پانی گلاس میں انڈیلا۔
"جاب یا اپنا اسٹارٹ اپ۔ میں کچھ بھی
کرنے کو تیار ہوں۔"
زیاد نے پانی کا گھونٹ بھرا۔ پھر کھنکھارا۔
"ہاں ٹھیک ہے۔ تم جو چاہو کر سکتی ہو۔
لیکن۔" اس نے لہجے کو سرسری بنایا۔ جیسے الفاظ
تلاش کیے ہوں۔
"تم ایک خارجی ہو۔ سعودی نہیں۔ تمہارا
اقامہ بطور میری بیوی کا ہے۔ اس پہ تم جاب نہیں
کر سکتیں۔ بزنس تو وہ بطور ایک خارجی (فارنر)
کے تم شروع نہیں کر سکتیں۔"
مالا نے جواب نہیں دیا۔ وہ اسے دیکھتی توجہ
سے سن رہی تھی۔
"ایک خارجی کا کاروبار شروع کرنے کے
لیے SAGIA کا لائسنس چاہیے ہوتا ہے۔ جس کی
رجسٹریشن بہت مہنگی ہے۔ بہت مہنگی۔" اُلجھا بات
دہرائی۔ اب وہ بہتر محسوس کر رہا تھا۔
"پھر خارجی یہاں بزنس کیسے کرتے ہیں؟"
"وہ کسی سعودی کو اپنا پارٹنر بناتے ہیں اور اس
کے نام پہ کمپنی رجسٹر کراتے ہیں۔ وہ ان کا کفیل ہوتا
ہے۔ ایک پاکستان سے ابھی ابھی آئی لڑکی کی
کفالت کوئی سعودی نہیں کرے گا اور اگر کبھی کسی نے تو
وہ کمپنی اس کی ہوگی۔ پیسہ تم لگاؤ گی اور وہ جب
چاہے تمہیں اس کمپنی سے نکال دے۔ اس کو قانوناً
اس بات کا حق حاصل ہے۔" اس کی بھوک واپس
آگئی تھی۔ اب وہ کبسہ چاول شوق سے کھا رہا تھا۔
"آئی ایم سوری کشمالہ۔ میری جاب کی وجہ
سے تمہیں یہاں سیٹل ہونا پڑ رہا ہے۔ لیکن تم بے فکر
رہو۔ میں تمہیں اتنا اچھا لائف اسٹائل دوں گا کہ۔۔۔"
"آپ سوری کیوں کہہ رہے ہیں؟" وہ بھی
واپس چکن پیس توڑنے لگی۔ زیاد نے چہرہ اٹھا کے
اسے دیکھا۔
"کیونکہ میں نے تمہیں بتایا ہے کہ تم یہاں کام
نہیں کر سکتیں۔"
"آپ نے مجھے دو مسئلے بتائے ہیں زیاد۔" وہ
نرمی سے مسکرائی۔ "میں اس اقامے پہ جاب نہیں
کر سکتی۔ یعنی اقامہ ٹرانسفر کروانا ہوگا اور میں اپنی کمپنی
خود نہیں بنا سکتی۔ یعنی مجھے ایک کفیل ڈھونڈنا ہے
۔ اور اب تک آپ کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ کشمالہ مبین
ہمیشہ کوئی حل نکال لیتی ہے۔"
زیاد سلطان کی بھوک دوسری دفعہ مر
گئی۔ چاولوں کا ذائقہ حلق کو کڑوا کر گیا۔ وہ بے دلی
سے پانی گلاس میں انڈیلنے لگا۔
☆☆☆
کیف کے مرکزی ہال کا منظر آج قدرے
مختلف تھا۔ ایک کونے میں ورکرز اور الیکٹریشن اکھاڑ
پچھاڑ میں مصروف تھے۔ اونچی سیڑھی۔ تاریں۔ ننھے
بلب۔ پینٹ کا سامان۔ سب کچھ ایک ساتھ ہی ہوتا

دکھائی دے رہا تھا۔ رینوویشن کے باعث اس کونے
میں ہوم ڈیسک بنا دیے گئے تھے اور ان کو ہال کے
بیچ کونوں میں منتقل کر دیا گیا تھا جس سے جگہ تنگ اور
ناگوار ہوگئی تھی۔ شبنم کا ڈیسک بھی زد میں آگیا
تھا۔
اس کو لفٹ کے قریب جگہ ملی تھی۔ اب وہ باہر
کے آفس سے کافی دور ہو گئی تھی۔ اس کی نئی سیٹ کے
قریب ایک لکڑی کا زینہ تھا جو اوپر بنے باہر کے
اسٹڈی نما میٹنگ روم میں جاتا تھا۔ اپنے آفس کے
قریب شور کے باعث وہ اوپر بیٹھنے پہ مجبور تھا۔ شبنم کو
بار بار سیڑھیاں چڑھ کے اوپر جانا پڑتا کیونکہ اسٹڈی
روم ہی تھوڑی ایمیٹیشن تھا۔ وہاں لفٹ نہیں جاتی
تھی اور اس ورزش نے اسے سخت کبیدہ خاطر کر رکھا
تھا۔
جس وقت بیرل لفٹ سے باہر نکلا، شبنم بہت
برے موڈ میں بیٹھی تھی۔
"مجھے اپنا جیب خرچ ہونا چاہیے۔" اس نے
کرسی کھینچتے ہوئے بنا سلام کے کہا۔ شبنم نے چہرہ اٹھا
کے اسے دیکھا۔ وہ ڈھٹائی سے مسکرایا۔
"ماہر بے نے میرے ایک جرم کی پاداش میں
اسے آدھا کر دیا تھا۔" وضاحت دی۔
"اور تم اسی آدھے جیب خرچ پہ دو ماہ سے
گزارا کر رہے تھے۔" اس نے ڈیسک کیلنڈر کو
دیکھا۔ "اور ابھی مہینے کا دوسرا ہفتہ بھی شروع نہیں
ہوا۔"
"میرے خرچے بڑھ گئے ہیں۔" وہ اسی
ڈھٹائی سے مسکراتا رہا۔ شبنم نے عینک کے پیچھے سے
خفگی بھری نظروں سے اسے گھورا جو ٹانگ پہ ٹانگ
جمائے بیٹھا لاپروا سا لگ رہا تھا۔
"ماہر بے نے منع کیا ہے۔ میں کچھ نہیں
کر سکتی۔" اس کا انکار دو ٹوک اور صاف تھا۔
بیرل نے گردن موڑ کے اطراف پہ طائرانہ
نگاہ ڈالی۔
"یہ رینوویشن پہ ایکسٹرا خرچہ نہیں ہو رہا؟"
"بارش کا پانی اندر آگیا تھا۔ دیوار خراب ہوگئی
تھی۔ مجبوری ہے۔"
"ہوں۔ معلوم نہیں کس آرکیٹیکچرل فرم نے
اس آفس کو ڈیزائن کیا تھا۔" اس نے طنزیہ ہنکارا
بھرا۔
"ہم نے نہیں کیا تھا۔ ہمیں یہ جگہ ایسے ہی ملی
تھی۔ اب میں کام کروں؟" شبنم نے چبا کے جواب دیا اور
اسکرین کی طرف متوجہ ہوگئی۔
"یعنی مجھے خود ہی کچھ کرنا ہوگا۔" اس نے
افسوس سے گہری سانس خارج کی۔ شبنم نے اچنبھے
سے اسے دیکھا۔
"تم کیا کرو گے؟"
جواباً بیرل فرید جگہ سے اٹھا اور مسکرا کے کنپٹی پہ
دستک دی۔
"اس شیطانی دماغ میں آئیڈیاز کی ایک زرخیز
زمین ہے شبنم جی۔" معنی خیز انداز میں مسکرا کے وہ
لفٹ کی طرف بڑھ گیا۔
"کبھی وہ آئیڈیاز اپنی بیکری کی ترقی پر بھی خرچ
کر لیا کرو۔" اس نے پیچھے سے پکارا۔ بیرل چلتے
ہوئے سر جھٹکا۔ لفٹ میں قدم رکھ رہا تھا۔ ساتھ ہی
اس نے موبائل نکالا اور اس کی طرف پلٹا۔ وہ غور
سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس نے مسکرا کے ایک آنکھ
بند کی اور موبائل پہ چہرہ جھکا دیا۔ لفٹ کے دروازے
بند ہو گئے۔
"کشمالہ مبین۔" بیرل فرید کی نظریں موبائل
اسکرین پہ جھکی تھیں جہاں کشمالہ کا پرائیوٹ
انسٹاگرام اکاؤنٹ کھلا تھا۔ یہ وہی اکاؤنٹ تھا جس
پہ ان دونوں کی لاہور میں بات ہوئی تھی اور اس کی
پاداش میں وہ اپنے آدھے جیب خرچ سے گیا تھا۔
اس نے فالو کا بٹن دبایا۔ ریکویسٹ روانہ
ہوگئی۔ بیرل نے مسکرا کے موبائل جیب میں ڈالا۔
جدہ میں واقع اپارٹمنٹ میں اس وقت خاموشی
تھی۔ شام کا وقت تھا اور زیاد گھر نہیں تھا۔ دونوں
کے درمیان اس کے بعد کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ وہ

اس وقت لونگ روم میں ٹی وی کے سامنے یوگا میٹ بچھائے بیٹھی تھی۔ آلتی پالتی کیے دونوں بازو آسمان کی طرف بلند کیے وہ دائیں گال کو دائیں پہلو پہ جھکا رہی تھی۔ پیچھے دونوں بازو بھی اسی سمت جھک رہے تھے۔ چہرہ پسینے سے تر تھا اور ایسی ہی بوندیں میٹ کے کنارے رکھی پانی کی بوتل پہ بھی تھیں۔

دفعتاً وہ سیدھی ہوئی۔ گہری سانس کھینچی اور ساتھ رکھا موبائل اٹھایا۔ اسکرین دیکھ کے اس کے ابرو تعجب سے اکٹھے ہوئے۔

ہیرمل فرید نے اسے فالو ریکویسٹ بھیجی تھی۔ اس کا انگوٹھا خود بخود مسترد کرنے کے بٹن کی طرف بڑھ گیا۔ لیکن پھر وہ رک گئی۔ چند لمحے لب کاٹتے ہوئے سوچتی رہی۔ پھر قبول کا بٹن دبایا اور ساتھ ہی فالو بیک پہ کلک کیا۔ موبائل واپس رکھا اور ہلکے سے کندھے اچکا دیے۔

☆☆☆

"ہیپی برتھ ڈے ٹو یو..."

وہ گہری نیند میں تھی جب ایک دھن کانوں سے ٹکرائی۔ اس کا ذہن بیدار ہونے میں چند لمحے لگے۔ پھر وہ ایک دم تیزی سے اٹھ بیٹھی۔ دائیں بائیں دیکھا۔ ڈیجیٹل کلاک سائیڈ ٹیبل پہ رکھا تھا اس پہ موٹے موٹے عدد جگمگا رہے تھے۔

03:09 AM

تین بج کر نو منٹ۔ اس نے اچنبھے سے وقت دیکھا۔ وہ آواز اب بند ہو گئی تھی۔ لیکن وہ خواب نہیں تھی۔ وہ خواب سے جگانے والی تھی۔

وہ وہیں بیٹھے بیٹھے چند لمحے گہرے سانس لیتی رہی۔ اب ہر طرف خاموشی تھی۔

نیو کروٹ لیے بے خبر سویا تھا۔ شاید پوری اپارٹمنٹ بلڈنگ سو رہی تھی۔ ابھی فجر ہونے میں بھی دو گھنٹے رہتے تھے۔ لیکن اب اس کی نیند اڑ چکی تھی۔

اس نے نگاہ اٹھا کے ڈریسنگ روم کی الماری کو دیکھا جس کے اندر وہ لاکر نصب تھا۔ اس لاکر میں ان گنت کہانیاں دفن تھیں جن کو وہ پڑھ کے کب بار چکی تھی۔ کیا کرے؟ کہاں جائے؟

وہ واپس لیٹی اور زیاد کی جانب سے کروٹ بدل لی۔ وہ ناراض نہیں تھی۔ وہ الجھن میں تھی۔ عاجزاً موبائل اٹھایا اور نوٹیفکیشنز دیکھنے لگی۔ ہیرمل فرید نے اس کی ریکویسٹ قبول کر لی تھی۔

اس نے ہیرمل کی پروفائل کھولی۔ یہ پرائیویٹ اکاؤنٹ تھا۔ فرینڈز اور فیملی تک محدود۔ وہاں اس کی تصاویر تھیں۔ کہیں وہ کسی دوسرے ملک کا سفر کر رہا ہے۔ کہیں وہ اپنی بیکری میں کوئی نیا کیک بنا رہا ہے۔ کہیں وہ کسی برانڈڈ اسٹور پہ شاپنگ کر رہا ہے۔ ایک ایک تصویر سے اس کی امارت کا اندازہ ہوتا تھا۔ وہ متاثر ہوئے تصاویر پیچھے کرنے لگی۔ چند ایک تصاویر میں اسے ماہر کی جھلک نظر آئی تھی لیکن ہالا نے ان کو نہیں کھولا۔ اسے دلچسپی نہیں تھی۔ اس کا انگوٹھا پیچھے کو سفر کرتا گیا۔

یہاں تک کہ وہ خود بخود ٹھہر گیا۔

وہ ایک چند برس پرانی ویڈیو تھی۔ کسی لڑکی کے گھر کا چھوٹا سا کچن۔ ہیرمل ایک ڈش میں تازہ بیک ہوئی براؤنیز اٹھائے کھڑا تھا۔ ساتھ ہی وہ کچھ کہہ رہا تھا لیکن اس کے فون کی آواز بند تھی۔ وہ اس کی آواز نہیں سن سکتی تھی۔ اس کو دیکھ کے ہمیشہ یہ لگتا تھا کہ وہ اس شخص سے پہلے مل چکی ہے۔ کہاں؟ اسے یاد نہ تھا۔

عقب میں کچن کاؤنٹر پہ ایک میوزک باکس رکھا تھا جس کے ساتھ ایک لڑکی کھڑی تھی۔ اس کے گھنگریالے بال کمر سے نیچے تک گرتے تھے۔ اور وہ کہانیوں کا کردار [illegible] جانے ایک ہاتھ سے مسکراتے ہوئے میوزک باکس کی چابی گھما رہی تھی۔ وہ اس کو پہچانتی تھی۔ ماہر نے اسے اسی لڑکی کی تصویر دکھائی تھی۔ ہالا۔

میوزک باکس میں بنا ناور گول گول گھومنے لگا۔ آواز ہنوز بند تھی۔ اسی پل لڑکی نے نگاہیں اٹھائیں۔ اور کیمرے میں دیکھا۔ ایسے لگا وہ اسے دیکھ رہی ہے۔ اس کی ریڑھ کی ہڈی میں ایک سنسنی دوڑ گئی۔

پھر اس نے مڑی ہوئی پلکیں جھکا لیں۔ کیمرہ واپس ہیرمل پہ چلا گیا جو ہنسی سے کچھ کہہ رہا تھا۔ اسی پل وہ چونکی۔

وہ آج کے ہیرمل سے مختلف تھا۔ اس کے بال لمبے تھے جن کو پونی میں باندھ رکھا تھا۔ اس کا لباس زیادہ پروقار تھا۔ کان کی بالی۔ گردن کی چین۔ ایک جھماکے کی صورت میں اسے کچھ یاد آیا۔

یہ وہی تھا۔ جو اوشن ریسٹوران آیا تھا۔ اس سفید بالوں والے بوڑھے کے ساتھ۔ وہ بیکری چلانے کا کہہ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے نیند اڑ چکی تھی۔ یہ وہی تھا۔

اس کی انگلیاں تیزی سے ٹائپ کرنے لگیں۔

"مجھے اپنا نمبر بھیجیں۔ مجھے آپ سے بات کرنی ہے۔" میسج بھیج کے بیک کیا تو وہی ویڈیو دوبارہ کھل گئی۔ اب پس منظر میں آتش دان کے ساتھ ونگ چیئر پہ نیم دراز ماہر دکھائی دے رہا تھا۔ وہ ایک کتاب پڑھ رہا تھا۔ ہالا نے انسٹاگرام بند کر دیا۔ اسے ان کی ویڈیو دیکھنے میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔

☆☆☆

سڑک کے ایک طرف اپارٹمنٹ بلڈنگز کی قطار تھی اور دوسری جانب باسفورس کا پانی تھا۔ سڑک کنارے بنے ٹریک پہ اس صبح بہت سے لوگ خود بھاگتے یا اپنے کتوں کو بھگاتے دکھائی دیتے تھے۔ آسمان ابھی ہلکا جامنی تھا اور سورج ٹھنڈا۔ البتہ ٹاوروں کے کنارے نارنجی پڑنے لگے تھے۔ ایسے میں ماہر ٹریک پہ تیز قدموں سے چلتا آرہا تھا۔ کانوں میں ائیر پوڈز لگے تھے اور وہ کلائی پہ بندھی گھڑی پہ اپنے قدم گن رہا تھا۔ چہرہ پسینے سے تر تھا اور سانس تیز۔ ایک نظر اپنی ٹانگ کو دیکھا جس میں درد کی ٹیسیں اب بھی اٹھتی تھیں۔ پھر سر جھٹک دیا۔

"پچیٹر کی کال آرہی ہے۔" کان میں سری نے اطلاع دی۔

"آنسر۔" اس نے اتھل پتھل ہوتی سانسوں کے درمیان کہا۔ ٹریک پہ سامنے ایک لڑکی بھاگتی آ رہی تھی۔ بھاگنے سے اس کی اونچی پونی دائیں بائیں جھول رہی تھی۔ وہ اس کی طرف ایک مسکراہٹ اچھال کے آگے بڑھ گئی۔ لیکن وہ نہیں مسکرایا۔ چہرہ سنجیدہ رکھے پچیٹر کو سنتے ہوئے وہ سڑک کی طرف بڑھ گیا۔

"آج پولیس اسٹیشن کا چکر لگا لو تمہارے لیے ایک خوش خبری ہے۔"

"مجھے مایوس مت کرنا۔" تنبیہ کرتے ہوئے وہ سڑک کنارے رکا۔ ٹریفک معمولی تھا۔ البتہ ہر روز سڑک عبور کرنے سے پہلے قدم خود بخود رک جاتے، جھجک جاتے۔ تو وہ سیاہ ایس یو وی یاد آجاتی۔

جب وہ اوپر اپنے اپارٹمنٹ میں داخل ہوا تو اوپن کچن میں ہیرمل فرید اسٹول پہ بیٹھا تھا۔ نیند میں ڈوبی آنکھیں۔ بار بار جمائی روکتا۔

"آج ہماری سلیپنگ بیوٹی اتنی جلدی کیسے اٹھ گئی؟" اس پہ ایک گہری نظر ڈال کے وہ فریج کی طرف بڑھا۔

"میں تو ایک آرڈر کے لیے اٹھا ہوں مجھے صبح میں ڈلیور کرنا ہے۔ تم بتاؤ تمہاری جاگنگ مکمل ہو گئی؟" تڑاخ سے جواب آیا۔ ماہر نے جواب نہیں دیا۔ فریج سے ایک سبز پانی والی بوتل نکالی اور لونگ روم کی طرف بڑھ گیا۔

"مجھے اپنا جیب خرچ بڑھانا ہے۔" اس نے پیچھے سے پکارا۔

"اگلے چار سال تک تم اسی پہ گزارا کرو گے۔"

"اور اگر میں انکار کردوں؟"

"تو چار سال تک اپنا حصہ لینے کا انکار کرو۔"

وہاں بے نیازی ہی بے نیازی تھی۔ ہیرمل نے کینہ توز نظروں سے اس کی پشت کو دیکھا۔ وہ اب لونگ روم کے صوفے پہ جا بیٹھا تھا اور گلاس میں اپنا مشروب انڈیل رہا تھا۔

سیڑھیاں تاریک تھیں اور ہر طرف جالے تھے۔ گرد تھی۔ وہ قدم قدم چلتی نیچے جا رہی تھی۔ دفعتاً اسے کھانسی آئی۔ اس نے لبوں پہ ہاتھ رکھا۔ پھر چونکی۔ سیڑھیوں کے اختتام پہ نیچے ایک ہال کمرہ تھا۔ وہاں کوئی کھڑا تھا۔ کندھوں پہ شال لیے۔ کلائیوں میں سونے کے کنگن۔

"ماں..." اس کی آنکھیں خوشی سے پھیلیں۔ تیزی سے چند زینے عبور کیے۔

وہ ایک دروازے کے پاس کھڑی تھیں۔ ان کی شال سفید تھی۔ پشمینے کی نئی نکور شال۔ اور ان کا جسم فربہ نہیں تھا۔ وہ پتلی تھیں۔ جیسے جوانی میں ہوتی تھیں۔ ان کا رخ دوسری جانب تھا۔ آہٹ پہ وہ پلٹیں۔ اس کو دیکھا۔ ان کا چہرہ مدھم روشنی میں واضح ہوا۔ وہ بھی جوان تھا۔ سپید اور خوب صورت۔ لیکن وہ مسکرا نہیں رہی تھیں۔ وہ بس اس کو دیکھ رہی تھیں۔

"ماں، آپ زندہ ہیں؟" وہ تیزی سے ان کے قریب آئی۔ ان کا ہاتھ تھاما۔ وہ گرم تھا۔ اس پہ جھریاں نہیں تھیں۔

ماں نے جواب نہیں دیا۔ بس دوسرا ہاتھ بڑھایا اور دروازے کا ناب گھمایا۔ وہ کھلتا چلا گیا۔ مالا نے چونک کے اس طرف دیکھا۔

وہ ایک کمرہ تھا۔ اس میں اوپر نیچے بہت سے رول شدہ نقشے بکھرے تھے۔ میز پر۔ شیلف پہ۔ ہر طرف۔ جالوں اور گرد سے اٹے ہوئے نقشے۔

ماں نے چہرہ اس کے قریب کیا۔ دھیرے سے اس کے کان میں سرگوشی کی۔

"فلیش لائٹ ڈھونڈو..."

"فلیش لائٹ؟ کیا مطلب؟" اس نے الجھنے سے انہیں دیکھا۔ وہ کچھ سمجھ نہیں پا رہی تھی۔

اسی پل کانوں میں تیز آواز گونجی۔

ٹی ٹی ٹوں ٹوں...

ایک دم اس کی آنکھ کھلی۔ وہ ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھی۔ نظر الارم کلاک پہ پڑی۔

03:08 AM

تین بج کے آٹھ منٹ۔

وہ چند لمحے بیٹھے کے بیٹھے گہرے گہرے سانس لیتی رہی۔ ماں کو اس نے ان کی وفات کے بعد پہلی دفعہ ایسے خواب میں دیکھا تھا کہ حقیقت کا گمان ہوا تھا۔ ماں کے خواب اس کو اکثر آتے تھے۔ پرانے دنوں کا ری پلے۔ ان کی موت سے پہلے کا کوئی اچھا دن۔ وہ سب خیالات کا ہجوم ہوتے تھے۔ لیکن یہ خواب۔ یہ ایسا تھا جیسے وہ ماں سے ان کے مرنے کے بعد پہلی دفعہ ملی ہو۔ اسے سلیمہ آنٹی کی باتیں یاد آئیں جو انہوں نے ماں کے جنازے والے دن کچن میں کھڑے اس کو کہی تھیں۔

اس نے سر جھٹکا اور موبائل اٹھایا۔ نوٹس کھولے اور ٹائپ کرنے لگی۔

03:09 AM

03:08 AM

آج کی تاریخ ڈالی اور فون رکھ دیا۔ آدھی رات کو یہ آواز ایک ہی وقت پہ کیوں آئی تھی؟ اس کا دماغ سمجھنے سے قاصر تھا۔

زیاد کہاں گیا؟ دفعتاً خیال آیا تو چونک کے دیکھا۔ زیاد کے حصے کا بیڈ خالی تھا۔ اس نے پیروں میں سلیپرز پہنے اور کمرے سے باہر آئی۔

گھر کے دوسرے بیڈروم کو زیاد نے اپنا ہوم آفس بنا رکھا تھا۔ اس کا دروازہ بند تھا اور درز سے روشنی کی لکیر جھانک رہی تھی۔ یقیناً وہ لکھنے میں مصروف تھا۔ کیا اسے دروازہ کھٹکھٹانا چاہیے؟ یا باہر رک کے سننا چاہیے؟ اف مالا۔ اس نے خود کو ڈانٹا۔ اسے تجسس میں نہیں پڑنا چاہیے۔ اسے زیاد کی جاسوسی نہیں کرنی چاہیے۔

وہ واپس کمرے میں آگئی اور بستر پہ لیٹ گئی۔ نیند پھر سے غائب ہونے لگی۔

زیاد سلطان کے ہوم آفس میں کارپٹ بچھا تھا اور ایک ورک ٹیبل رکھی تھی جس پہ اس کا لیپ ٹاپ کھلا تھا۔ اور وہ عینک لگائے اسکرین کو بے توجہی سے دیکھ رہا تھا۔ کمرے میں ایک زرد ٹیبل لیمپ جل رہا تھا جس نے سارے میں روشنی بکھیر رکھی تھی۔ دفعتاً فون زوں زوں ہونے لگا۔ اس نے بے نیازی سے اسکرین کو دیکھا۔ نگینہ بیگم کی کال آ رہی تھی۔

"جی امی؟" گہری سانس لے کر کال اٹھائی۔

"تم تو ماں کو ایسے بھولے ہو جیسے تمہیں کبھی اس کی ضرورت دوبارہ نہیں پڑے گی۔" وہ جیسے مسکرا کے کہہ رہی تھیں۔

"ایسی بات نہیں ہے۔" اس نے سر جھکا دیا۔ "بس میں ایک نئی زندگی شروع..."

"بلال کی ایک بیٹی ہے۔ زیاد! مجھے اس کو تلاش کرنا ہے۔"

وہ چونکا۔ بے اختیار دروازے کو دیکھا۔ پھر آواز مزید دھیمی کی۔

"امی میں ان معاملوں میں نہیں پڑنا چاہتا۔"

"غالب اس کو تلاش کرنے میں ناکام رہا ہے۔"

"غالب کون؟"

"میرا کلائنٹ۔ استنبول میں ہوتا ہے۔"

"ہونہہ۔ میں کیا کر سکتا ہوں؟"

"بلال کہتی ہے کہ وہ جھیل کنارے ایک گھر میں مقیم ہے۔ اس شہر میں جہاں ماہر فرید رہتا ہے۔"

زیاد نے سامنے رکھے کاغذ کو مٹھی میں بھینچا۔ کرب سے آنکھیں بند کیں۔

"میں اس شخص کا نام نہیں سننا چاہتا۔ اور آپ..."

"اس نے اس کے تمام ٹریول ریکارڈز ڈیلیٹ کروا رکھے ہیں۔"

"آپ کے مؤکل کیا کہتے ہیں؟"

"وہ اس کا نام جانے بغیر اس کو نہیں ڈھونڈ سکتے اس لیے مجھے تمہاری مدد چاہیے۔ اگر تمہیں اس کو ڈھونڈنا ہوتا تو کیسے ڈھونڈتے؟"

وہ چند لمحے اسکرین کو سوچتی نظروں سے دیکھے گیا۔ فون کان سے لگا تھا۔

"آپ کو یقین ہے کہ اس نے اسے چھپا رکھا ہے؟" وہ احتیاطاً نام لیے بغیر دروازے پہ بار بار ایک نظر ڈال لیتا تھا۔

"مجھے یقین ہے۔"

"اس عورت کا نام جاننے کا فائدہ نہیں ہے۔ اس نے اسے جس گھر میں چھپایا ہے وہ اس عورت کے نام پہ نہیں ہوگا۔ وہ اس کے اپنے نام پہ ہوگا۔ کرائے کے گھر کا وہ رسک نہیں لے گا۔ غالب سے کہیں کہ اس کے بلکہ اس کے پورے خاندان کی پراپرٹی کا ریکارڈ چیک کرے۔ اسے آسانی سے پولیس ڈیٹا بیس میں یہ سب مل جائے گا۔ کوئی ایسا گھر جو کسی واٹر باڈی (سمندر، جھیل، تالاب) کے قریب ہو، جو اس نے خرید رکھا ہو یا لیز کیا ہو، وہ اس گھر میں ہوگی۔"

وہ دھیمی آواز میں کہہ رہا تھا۔ کال بند کر کے وہ باہر نکلا اور دبے قدموں کمرے میں واپس آیا۔ وہ تب تک سو چکی تھی۔

☆☆☆

"زیاد بھائی استنبول کیوں نہیں جانا چاہتے؟"

رامین اور اس کے شوہر نے ان دونوں کو لنچ پہ بلایا تھا۔ سمندر کنارے کورنش پہ بنے ایک اوپن ایئر ریسٹوران میں وہ چاروں اس وقت موجود تھے۔ سہ پہر کا وقت تھا اور سورج قدرے ٹھنڈا تھا۔ ایک طرف سمندر تھا اور دوسرے طرف ریت پہ دور دور تک بنچ اور میزیں لگی تھیں۔

وہ دونوں اس وقت بفے ٹیبل کے ساتھ کھڑی اپنی اپنی پلیٹس اٹھا رہی تھیں۔ زیاد اور ہارون (رامین کا شوہر) ابھی پیچھے بنچ پہ آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ دونوں موبائلز پہ لگے تھے۔ البتہ وہ کھانا نکالنے اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔

"اس کو چھٹی نہیں مل رہی۔ یا شاید استنبول کا نام سن کے ہی وہ چڑچڑا ہونے لگتا ہے۔"

وہ قدرے اداس لگ رہی تھی۔ اس نے اسکن

کلر کے عبایے پہ ہم رنگ اسٹول یوں اوڑھ رکھا تھا کہ سامنے کے بال اور کانوں کے ٹاپس دکھائی دے رہے تھے۔ آنکھوں پہ سیاہ گلاسز تھے۔

اس کا عبایہ پہننے کا اپنا اسٹائل تھا۔ وہ نیچے سے کھلا ٹراؤزر شرٹ پہن کے اوپر عبایا کیپ کی طرح پہنتی جو سامنے سے کھلا ہوتا۔ آستین پیچھے موڑ لیتی۔ کلائی میں گھڑی، بریسلٹ اور انگلیوں میں انگوٹھیاں دکھتی رہتیں۔

سعودی عرب سخت شریعت کے دور سے نکل کے آہستہ آہستہ ماڈرنائز ہو رہا تھا۔ یہ محمد بن سلمان کا دور تھا اور اب عبایا یا اسکارف نہ اوڑھنے پہ کوئی کسی عورت کو کچھ نہ کہتا تھا۔ جدہ میں ویسے بھی خارجیوں کی کثیر تعداد تھی۔ خارجی عورتیں جو اپنے ملکوں میں عبایا نہیں پہنتی تھیں، وہ کلچر کا احترام کرتے ہوئے سعودی عرب میں اس کو اوڑھ لیتی تھیں۔ اب بہت سی سعودی عورتیں بھی صرف سامنے سے کھلا عبایا پہن کر سر ڈھکے بنا باہر نکلتی تھیں۔ اکثر کے بوائے کٹ بال کٹے ہوتے تھے کیونکہ بہت سی سعودی عورتیں لمبے بال پسند نہیں کرتی تھیں۔ البتہ اسکن دکھانا یعنی بنا آستین کے لباس پہننا وہاں آج بھی معیوب سمجھا جاتا تھا۔ اور سعودی عورتوں کی اکثریت اپنا سیاہ عبایا اور نقاب اسی طرح کرتی آ رہی تھی۔

"آپ لوگوں نے عمرہ بھی نہیں کیا ابھی تک۔" راملین نے جیسے یاد دلایا۔

"زیاد ہی راضی نہیں ہے۔ کب سے کہہ رہی ہوں کہ عمرہ کریں۔ کبھی آج کبھی کل پہ ٹال دیتا ہے۔" وہ اکھڑے اکھڑے انداز میں پلیٹ میں مندی کے چاول ڈال رہی تھی۔ مندی سعودیوں کی پسندیدہ ڈش ہے۔ سفید، زرد چاولوں کے اوپر ریزن، خشک میوے، گوشت کے ساتھ روسٹ ہوئے دنبے کے پیس رکھے ہوتے تھے۔ اس ریسٹورنٹ نے مندی کے ساتھ چرچر کے پتے بھی سرو کر رکھے تھے۔ البتہ اس کا کچھ کھانے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔

"آپ زیاد بھائی سے خفا ہیں؟" راملین نے غور سے اسے دیکھا۔

"اس نے مجھ سے جھوٹ بولا ہے۔ سوا شاید اس کی ماں نے۔"

"کیا وہ بسرینہ کے بارے میں کچھ نہیں بتاتے؟"

"میں نے ایک دو دفعہ ذکر چھیڑا تھا، اس نے سختی سے کہہ دیا کہ وہ اس بارے میں بات نہیں کرنے گا۔"

"پھر آپ کو بسرینہ کے گھر والوں سے بات کرنی چاہیے۔ وہی اصل کہانی بتا سکیں گے۔" وہ سرخ ساس اپنی پلیٹ میں ڈالتے ہوئے سرگوشی میں بولی۔ مالا کے اندر کسی غیر آرام دہ احساس نے پہلو بدلا۔

"میں اپنے شوہر کی پیٹھ پیچھے اس کی جاسوسی نہیں کر سکتی راملین۔"

"جاسوسی کی نیت سے نہ کریں۔ یہ سوچ کر حقیقت معلوم ہونے پہ آپ دونوں کے تعلقات بہتر ہو جائیں گے اور آپ اس شک سے نجات حاصل کر لیں گی۔" پھر وہ کچھ سوچنے لگی۔

"زیاد بھائی استنبول کے نام سے چڑتے کیوں لگے ہیں؟"

"شاید اسے استنبول پسند نہیں ہے۔"

"یا شاید وہاں کوئی پسند نہیں ہے۔" اس نے زور دیا۔ مالا نے چونک کے اسے دیکھا۔ پھر سر جھٹک دیا۔

"اگر تم کیف کی بات کر رہی ہو تو زیاد اس کو ٹھیک سے جانتا تک نہیں تھا۔ نہ وہ اس کے ذہن میں کہیں ہو گا۔ وہ صرف میرا ڈرائیور تھا اور کچھ نہیں۔ اس لیے زیاد کو اس سے کوئی مسئلہ نہیں ہو گا۔"

"ہوں۔ تھینک گاڈ۔ اور آپ کی لپ اسٹک مٹ گئی ہے۔" اس نے اب نوٹ کیا تھا۔

مالا کے چہرے پہ سایہ سا گزرا۔ وہ پھیکا سا مسکرائی۔ "اچھا۔ کوئی بات نہیں۔"

وہ دونوں اب بیتے مخمل پہ کافی آگے پہنچ چکی تھیں۔ مالا نے پلیٹ کے ایک نظر مخمل کے دہانے کو دیکھا۔ زیاد اور ہارون بھی اب اپنی پلیٹیں اٹھا رہے تھے۔ زیاد چپ چپ سا تھا۔ وہ یہاں آنا ہی نہیں چاہتا تھا لیکن اس نے مالا کو انکار نہیں کیا تھا۔ ہارون بات کرنے کی کوشش کر رہا تھا اور وہ ہوں ہاں کر رہا تھا۔

(یہاں آنے سے پہلے جب تیار ہو کے وہ آئینے کے سامنے کھڑی لپ اسٹک لگا رہی تھی تو وہ اس کے عقب میں آ کھڑا ہوا تھا۔ وہ مسکرائی تھی۔ وہ مسکرایا۔)

"اتنی ڈارک لپ اسٹک لگا رہی ہو۔" اس کے لہجے میں ناپسندیدگی تھی۔ مالا چونکی۔ لپ اسٹک والا ہاتھ رک گیا۔

"یہ تو شیڈ ہے۔ اس عبایے کے ساتھ بھی جاتا ہے۔"

"تمہیں اپنی اسکن کا خیال رکھنا چاہیے۔" جتا کے کہتے ہوئے وہ پیچھے سے ہٹ گیا۔ اس نے رک کے آئینے میں دیکھا۔ ہونٹ تلے ایک دانہ نکل رہا تھا۔ یہ صبح تک یہاں نہیں تھا۔ تازہ تازہ چھوٹا سا۔ اس نے دھیرے سے لپ اسٹک رکھ دی۔ پھر ٹشو سے ہونٹ رگڑ دیے۔ لپ اسٹک بہت مدھم ہو گئی۔ جب شوہر کہہ دے کہ اسے بیوی پہ کوئی چیز اچھی نہیں لگ رہی تو پھر ساری دنیا بھی اس کو اچھا کہے، وہ بیوی کے دل سے اتر جاتی ہے۔)

راملین کا شوہر ہارون اس کی تمام برائیوں اور خامیوں کے برعکس کافی خوش مزاج اور باتونی سا انسان لگتا تھا۔ جب وہ چاروں اپنا کھانا لے کر آمنے سامنے آ بیٹھے تو ہارون خوش مزاجی سے کہنے لگا۔

"بھابھی آپ کا ذکر میں کافی عرصے سے راملین سے سن رہا ہوں۔ یہ آپ کے ریسٹورنٹ کی بہت تعریف کرتی تھی۔ کتنے بڑے بڑے کرائسز آئے لیکن آپ نے اس ریسٹورنٹ کو ایک دن کے لیے بھی بند نہیں ہونے دیا۔"

وہ مسکرا دی اور عادتاً زیاد کو دیکھا۔ ان چاروں نے اب سن گلاسز اتار دیے تھے۔ ایسے میں زیاد کی آنکھیں بالکل سپاٹ سی دکھائی دے رہی تھیں۔ وہ سر جھکائے اپنے ہریسہ (سوپ) میں چمچ ہلا رہا تھا۔ مالا کی مسکراہٹ پھیکی پڑی۔ ادھر ہارون نوٹس کیے بنا بولے جا رہا تھا۔

"مجھے حیرت ہے کہ آپ جیسی کام کرنے والی لڑکی ابھی تک جدہ میں فارغ کیوں ہے؟ آپ کو تو کچھ کرنا چاہیے۔"

اب کی بار زیاد سلطان نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ لیکن کہا کچھ نہیں۔ راملین خاموشی سے اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ دیکھ رہی تھی۔

"جی ہارون بھائی اور اصل میں اپنے اقامہ پہ جاب نہیں کر سکتی۔"

"تو اقامہ ٹرانسفر کروائیں نا۔ جہاں بھی آپ جاب شروع کریں گی آپ کا ایمپلائر آپ کے اقامے کو اپنے ساتھ ٹرانسفر کروا دے گا۔" وہ حیرت سے بولا۔

"جی میں جانتی ہوں۔" انٹرنیٹ سرچ تو وہ اب تک کر چکی تھی۔

"اگر آپ کو کفیل چاہیے تو میں۔"

زیاد نے بہت ضبط سے چمچ پیچھے رکھا۔ پھر چہرہ اٹھا کے ہارون کو دیکھا اور جبراً مسکراتے ہوئے بات کاٹی۔

"ایک دفعہ کشمالا کو جاب مل جائے تو میں اس کا اقامے کا مسئلہ حل کروا دوں گا۔" اس کا انداز دفاعی تھا۔ بات کاٹنے پہ ہارون ایک دم چپ ہوا۔ پھر پوری توجہ سے زیاد کو دیکھا۔

"آپ کہاں جاب کرتے ہیں؟" ہارون نے ایک دم سے سوالات کا رخ اس کی طرف موڑ دیا۔ راملین نے مخمل کے نیچے سے اس کو ہاتھ لگایا لیکن وہ پوری طرح سے زیاد کی طرف متوجہ تھا۔

"میں پی ایم اے میں کام کرتا ہوں۔ ایڈورٹائزنگ فرم ہے۔ میں مارکیٹنگ مینیجر ہوں۔"

"جس کا کنٹری ہیڈ عاطف الفریح ہے؟"

ہریسے سے بھرا چمچ لبوں تک لے جاتے ہوئے چھلک پڑا۔ وہ چونک کے ہارون کو دیکھنے لگا۔
"جی۔ طائف میرا باس ہے۔" اس نے تھوک نگلا۔

"انٹرسٹنگ۔ طائف کے والد میرے کلیگ ہیں۔ ال غریر فیملی سے ہمارے برسوں پرانے تعلقات ہیں۔ آپ کو کوئی بھی کام ہو تو مجھے بلا جھجک کہیے گا۔"

مالا نے بے اختیار اسے دیکھا۔ اس کے لبوں تک چند الفاظ آئے۔ (معید کی شادی کے لیے چھٹی؟) لیکن...

"ٹھیک ہو۔ میرا نہیں خیال مجھے کوئی ایسا کام ہوگا۔" زیاد اسی پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ دوبارہ ہریسے کی طرف متوجہ ہوگیا۔ مالا کے الفاظ حلق میں دم توڑ گئے۔

"رامین بتا رہی تھی کہ آپ کے ریسٹوران پہ ایک دفعہ پولیس آگئی تھی؟" ہارون نے بات وہیں سے شروع کی۔ اس کے انداز میں کشمالہ کے لیے بہت عزت اور مرعوب ہونے کا احساس تھا۔

"اور میں نے کہا تھا کہ بھاگ چلتے ہیں۔" رامین شرمندہ سی ہنس دی۔ "میں مسئلوں کے حل نکال لیتی ہوں۔" سادگی سے مسکرا کے بس اتنا سا کہا۔ انگلیوں نے گردن میں پہنی فالخہ کو چھوا۔

"کچھ وقت کے لیے ہم دونوں ریسٹوران سے غائب ہوگئے۔ لیکن پھر مالا واپس گئی۔ پولیس اسٹیشن اور اس نے اپنا بیان ریکارڈ کروایا اور پھر اس نے کئی مہینے وہ کیس لڑا۔ مالا ایک دفعہ کسی کو دشمن بنا لے تو اس کو قبر تک پہنچاتی ہے۔" رامین ستائش سے کہہ رہی تھی۔ زیاد کا حلق خشک ہونے لگا۔ اس نے تیزی سے پانی کا گلاس اٹھایا اور غٹاغٹ پی گیا۔

"رامین خود بھی کسی سے کم نہیں ہے۔ شاعرہ بھی ہے۔"

"مالا بھابی میں تو کہتا ہوں کہ لکھتی رہے۔ لیکن ان کو نیٹ فلکس سے فرصت ملے تو۔" ہارون نے مصنوعی افسوس سے رامین کو دیکھا۔ وہ ہنس پڑی۔

"باتیں ہیں بس سب۔" وہ تینوں اب مسکرا رہے تھے۔ البتہ زیاد سلطان نے بہت چونک کے پہلے ہارون اور پھر مالا کو دیکھا تھا۔ پھر کچھ کہتے کہتے وہ رک گیا اور دوبارہ کھانے کی طرف سر جھکا دیا۔ البتہ اس کے چہرے پہ واضح ناپسندیدگی تھی۔

"مالا بھابی؟"

ہارون اور رامین اٹھ کے بیسن تک گئے تو زیاد نے ایک دم جتانے والے انداز میں دیکھا۔ وہ ناسمجھی سے اسے دیکھنے لگی۔

"تمہارا نام کشمالہ ہے۔ یوں ایک اجنبی کو تمہیں نک نیم سے نہیں پکارنا چاہیے۔"

اس کی آنکھوں میں اچنبھا ابھرا، جیسے اسے سمجھ میں ہی نہ آیا ہو کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔

"رامین مجھے مالا کہتی ہے تو ان کو یہی لگا ہوگا کہ یہ میرا نام ہے۔"

"میں نے کبھی تمہیں مالا نہیں کہا۔ میں تمہارا پورا نام لیتا ہوں۔ مجھے ویسے بھی یہ نک نیم نہیں پسند۔"

زیاد کے چہرے پہ دبی دبی برہمی تھی۔

"مجھے سب مالا کہتے ہیں۔ بخت بی اور سلیم بیگ۔ اٹس اوکے زیاد۔" وہ قدرے حیرت سے اس کا بدلتا موڈ دیکھ رہی تھی۔

زیاد کچھ کہنے لگا۔ اسی پل وہ دونوں میاں بیوی آتے دکھائی دیے۔ وہ خاموش ہوگیا۔

البتہ کشمالہ یمین کی بھوک مرچکی تھی۔

باقی سارا وقت وہ قدرے خاموش رہی۔ رامین اسی طرح مالا کی تعریفیں کرتی رہی اور ہارون ہر تعریف پہ حوصلہ افزائی کرتا رہا۔ وہ دونوں کشمالہ کے بارے میں بات کرنے پہ مجبور تھے کیونکہ زیاد ہوں ہاں سے زیادہ کچھ نہیں کہہ رہا تھا۔ وہ اپنی ہر تعریف پہ زیاد کا چہرہ دیکھتی۔ وہاں گھٹن تھا۔

"سوری میں تھوڑا سا پوزیسو ہوگیا تھا۔" واپسی پہ ڈرائیو کرتے ہوئے زیاد کھنکھارا۔ وہ خاموشی سے کھڑکی سے باہر دیکھتی رہی۔ سن گلاسز اب آنکھوں پہ

"[illegible] اصل میں تم میرے لیے بہت خاص ہو۔ [illegible] تم سے بہت محبت کرتا ہوں اور میں [illegible] کہ تمہیں میرے سوا کوئی دیکھے نہ کوئی تم [illegible] محبت میں انسان ایسا ہی پوزیسو [illegible] ہو۔"

[illegible] گھٹن کے احساس نے اس کو اپنی لپیٹ میں لیا۔ جیسے اس کا سانس تنگ ہو رہا ہو۔ بے اختیار اس نے ناک سے لمبا سانس اندر کھینچا۔ اب اس کی آواز پرسکون تھی۔

"مالا میرا نام ہے۔ میں انتیس سال سے اس نام سے سن رہی ہوں۔ یہ میری پہچان ہے۔ میں اس کو [illegible] سکتی۔"

"لیکن ایک اجنبی کو تمہیں تمہارے نک نیم سے نہیں پکارنا چاہیے۔ تمہیں یہ سوچنا چاہیے کہ تمہارے شوہر کو برا لگے گا۔"

اس نے سائیڈ مرر میں اپنی مٹی ہوئی لپ اسٹک اور دانے کو دیکھا۔

"کل کو آپ کو میرا چہرہ برا لگنے لگ جائے تو کیا اسے بھی بدل لوں؟"

"یار پلیز میں..."

"آپ نے چھٹی اپلائی کر دی؟" اس کا لہجہ سپاٹ تھا۔

"میں اپلائی کروں گا لیکن وہ ریجیکٹ ہو جائے گی۔ پتا نہیں تمہیں ایک دفعہ میں بات کیوں نہیں سمجھ میں آتی؟" وہ بڑبڑاتے ہوئے ڈرائیو کر رہا تھا۔ مالا خاموشی سے کھڑکی کے باہر دیکھنے لگی۔ اسے معلوم تھا کہ اسے اب کیا کرنا تھا۔

☆☆☆

کیف کی عمارت کے اس مصروف ہم فلور پہ رینوویشن کا عملہ اسی طرح کام میں جتا تھا۔ ان کی وجہ سے لفٹ کے قریب کرسی میز ڈالے بیٹھی شبنم اس وقت ذرا چونکی تھی جب لفٹ کے دروازے کھلے اور ڈاکٹر معید یمین باہر نکلا۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا سفید چوکور باکس تھا۔

"[illegible]..." وہ اطراف میں متلاشی نظروں سے دیکھ رہا تھا جب شبنم نے کھنکھار کے اسے متوجہ کیا۔

"ماہر ہے..." ایک کان سے فون لگائے اس نے بازو لمبا کر کے سیڑھیوں کی طرف اشارہ کیا۔ معید سر کو خم دیتے اس طرف بڑھ گیا۔

زینہ تنگ سا تھا۔ دس بارہ سیڑھیاں چڑھ کے موڑ آجاتا تھا۔ اس موڑ پہ دیوار پہ ایک آئینہ آویزاں تھا جس سے اوپر اسٹڈی نما آفس کی شیشے کی دیوار دکھائی دیتی تھی۔ جس کے آگے بیرون بلائنڈز پڑے ہوا تھا۔ وہ چند زینے عبور کر کے شیشے کے دروازے تک آیا اور دروازے کا پردہ ہٹایا۔

وہ ایک تنگ سا آفس تھا۔ اندر تین دیواریں کتابوں کے ریکس سے بھری تھیں۔ تمام ریکس کے نیچے ایک سرخ رنگ کی ایل ای ڈی والی روپ لائٹ لکیر کی صورت میں گزر رہی تھی جو کمرے کی روشنی کو مدھم سا سرخ تاثر دیے ہوئے تھی۔ ان چار دیواروں کے درمیان بس اتنی سی جگہ تھی کہ ایک ہی مستطیل کانفرنس ٹیبل سما سکے۔

اس ٹیبل کے سرے پہ اس وقت ماہر فرید بیٹھا تھا۔ سوٹ میں ملبوس گال تلے دو انگلیاں رکھے ایک لگائے کسی گہری سوچ میں گم۔ سامنے چند کاغذ پھیلے تھے۔ اور میز کے وسط میں ایک سرخ عمارت کا ماڈل رکھا تھا۔

"کیف؟"

آواز پہ نگاہ اٹھائی۔ پھر مسکرا کے کھڑا ہوا۔

"آؤ معید۔ کل تمہارا میسج دیکھ کے مجھے اچھا لگا۔ تمہیں بہت پہلے میرے پاس آنا چاہیے تھا۔"

معید نے اس سے مصافحہ کر کے اس کے دائیں ہاتھ کرسی کھینچی۔ پھر ستائش سے اطراف میں دیکھا۔

"کون یقین کرے گا کہ کبھی تم ہمارے ڈرائیور تھے؟"

ماہر دھیرے سے ہنس دیا۔ اس کی ہنسی میں تھکی

تھی۔ معید کے چہرے پہ ایک دم معذرت خواہانہ سا تاثر ابھرا۔
"میرا مطلب تمہیں شرمندہ کرنا نہیں تھا۔ ہم سب اپنے حصے کے جھوٹ بولتے ہیں۔"
"لیکن میرے جھوٹ جلد میرے سامنے آ گئے۔ خیر۔ میں اتنا امیر نہیں ہوں جتنا تم سمجھ رہے ہو۔ میرا باپ امیر تھا۔ لندن میں ہم امیر ہوتے تھے" ایک ٹھنڈی سانس بھری۔ "استنبول میں میں وہی ہوں جو میں نے تمہیں اور... (تھوک نگلا) مالا کو بتایا تھا۔ ایک اسٹرگل کرتا انٹیریئر ڈیزائنر۔ اس ایک عمارت کے لیے..." سرخ عمارت کے ماڈل کی طرف اشارہ کیا۔ "میں کتنا خوار ہو رہا ہوں، تم اندازہ نہیں کر سکتے۔"
معید نے ایک نظر اس ماڈل کو دیکھا۔
"کیا تم کامیاب ہو جاؤ گے؟"
ماہر نے اثبات میں سر ہلایا۔
"ہاں۔ کیونکہ میں انسانوں کے معاملے میں اچھا ہوں۔"
"کیسے؟" معید کی آنکھوں میں اچنبھا ابھرا۔
"تم بتاؤ۔ استنبول تمہیں کیسا ٹریٹ کر رہا ہے؟" وہ ٹیک لگائے کرسی کا رخ اس کی طرف گھمائے مسکرا کے پوچھنے لگا۔
"کوئی خبر پہ تمہاری بہن کے میموریل ڈنر کے بارے میں دیکھا۔ آئی ایم سوری فار دیٹ۔"
ماہر نے سر کو خم دیا۔ جیسے اس کی تعزیت وصول کی ہو۔
"استنبول مجھے ایسے ہی ٹریٹ کر رہا ہے جیسے ہر سیاح کو کرتا ہے۔ خوب صورت تتلی سی بھری دنیا۔ مجھے آئے کچھ عرصہ ہو گیا ہے لیکن تم سے مل نہیں سکا۔ آج سوچا مل بھی لوں اور اس بہانے یہ بھی دے دوں۔"
اس نے ایک چوکور سفید باکس ماہر کی طرف بڑھایا۔ ماہر نے مسکرا کے باکس اٹھا لیا۔ وہ ایک کارڈ تھا جو باکس کی شکل میں تھا اور اسے سلور ربن سے بند کیا گیا تھا۔ ماہر نے ربن کی گرہ کھولی۔ نفیس سا کارڈ کتاب کی طرح کھلا۔ اندر ویڈنگ انویٹیشن اور نکاح کا وقت لکھا تھا۔ ساتھ ایک بے بی پنک پھول چپکا تھا۔ کارڈ سینٹڈ تھا۔ اس کی خوشبو کھلتے ہی سارے میں پھیل گئی۔
"میرا نکاح ایمرجنسی میں ہو رہا ہے۔ میری فیانسی کے دادا بیمار ہیں۔ میری بہنیں الگ ہراساں ہیں کہ اتنی جلدی کیا ہے۔ میں کچھ پریشان ہوں ان کی وجہ سے۔ لیکن اگر تم اپنی فیملی کے ساتھ آؤ تو مجھے خوشی ہوگی۔"
ماہر نے کارڈ کو دیکھا، پھر معید کو۔ پھر دوبارہ کارڈ کو۔ لبوں پہ مسکراہٹ تھی۔
"ہم سب اپنے حصے کے جھوٹ بولتے ہیں۔ لیکن تم مجھ سے سچ بول سکتے ہو۔"
معید چونکا۔ "سوری؟"
"یہ ایمرجنسی ویڈنگ نہیں ہے، معید۔ یہ destination wedding ہے۔" اس نے مسکرا کے کارڈ سامنے رکھا۔
"اس طرح کا کارڈ استنبول میں چھپوانے کے لیے کئی ہفتے لگتے ہیں اور یہ وینیو بک کرنے کے لیے کئی مہینے۔ تم جس فیلوشپ پہ آئے ہو اس کا کوئی خاص اسکوپ نہیں ہے۔ لیکن تم دونوں نے وہ فیلوشپ اس لیے منتخب کی کیونکہ تم موسم بہار میں اپنی ڈیسٹینیشن ویڈنگ کرنا چاہتے تھے۔ لیکن تمہارے رشتے دار ترکی میں آ کے شادی کرنے پہ بہت برا مناتے۔ بالخصوص تمہاری بہنیں۔ اس لیے تم دونوں نے دادا کی بیماری والا بہانہ بنایا۔ بلکہ..." وہ بغور معید کے چہرے کو پڑھ رہا تھا۔
"دونوں نے نہیں۔ صرف تم نے۔ کیونکہ تمہاری فیانسی تمہیں کافی عرصے سے کہہ رہی ہے کہ اپنی بہنوں کو بتا دو۔ لیکن تم آخری وقت تک ڈرتے رہے۔ یہاں تک کہ شادی کا وقت آن پہنچا۔ اب تم پریشان ہو کیونکہ تمہاری بہنیں یہاں آ کر ایک پرتعیش شادی دیکھ کر سب سمجھ جائیں گی اور تم چاہتے ہو کہ میں شادی پہ آؤں تاکہ میں ان کو سمجھا سکوں۔ اب مجھے بتاؤ میں غلط ہوں یا درست؟"
معید بیٹن کے کندھے ڈھیلے ہوئے۔ اس نے گہری سانس لی اور پیچھے ہو کے بیٹھا۔
"آئی ایم سوری میں نے جھوٹ بولا۔" اس نے شکست خوردگی سے کندھے اچکائے۔ "میں بری طرح پھنس چکا ہوں۔"
"سوری کس بات کا؟ تمہاری زندگی ہے۔ جو چاہے کرو۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔" پھر کارڈ کی طرف دیکھا۔ "اور مبارک ہو۔"
معید نے ماتھے پہ ہاتھ رکھ کے تکلیف سے آنکھیں بند کیں۔ چند لمحے خاموشی چھائی رہی۔
"وہ مجھے مار دیں گی۔ ماہی میری بوٹیاں کرے گی۔ بوٹیاں۔" وہ کراہا۔ ماہر ہنس دیا۔ گال کا گڑھا واضح ہوا۔
"میری بہنیں بہت ہیڈ اسٹرانگ ہیں۔ مالا مجھے معاف نہیں کرے گی۔ وہ ماہی کے سامنے میری سائیڈ لے گی لیکن وہ اندر سے مجھے معاف نہیں کرے گی۔"
"وہ معاف کرنے میں اچھی نہیں ہے۔" اس کے لبوں پہ سوگوار سی مسکراہٹ بکھری۔
"اور اگر میں یہ ڈیسٹینیشن ویڈنگ نہیں کرتا تو فیانسی کو کھو دوں گا۔ جانتے ہو کیا آبسیشن ہے لڑکیوں کو فیری ٹیل ویڈنگز کے ساتھ؟ میں اس شادی کے خرچے اٹھا اٹھا کے کنگال ہو چکا ہوں۔" اس نے تھکان سے ماہر کو دیکھا۔
"اگر تم شادی پہ آؤ تو شاید میری بہنیں میرا لحاظ کر لیں۔"
"تمہاری دونوں بہنیں آ رہی ہیں؟" وہ معید کو دیکھے بنا سامنے رکھے کاغذ ارینج کرنے لگا۔
"مالا اور زیاد آئیں گے۔ اس نے وعدہ کیا ہے۔ ماہی ناراض ہے۔ شاید نہ آئے۔"
"معید..." وہ کھنکھارا۔ ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کی۔ "میرا نہیں خیال مالا یا اس کا شوہر مجھے دیکھ کے خوش ہوں گے۔ وہ دونوں مجھے پسند نہیں کرتے۔"
"کم آن... وہ پرانی بات ہو گئی ہے اور زیاد تو تمہیں اتنا خاص نہیں جانتا۔"
ماہر فریدی سے مسکرایا۔
"وہ مجھے بہت اچھی طرح جانتا ہے۔" زیر لب کہا۔ پھر سر جھٹکا۔ "میں کوشش کروں گا۔ لیکن وعدہ نہیں کر سکتا۔ وعدہ کیا تو نبھانا پڑے گا۔"
"نکاح سے پچھلی رات ہم ایک فیملی ڈنر کر رہے ہیں۔ تم اس میں شرکت کر سکتے ہو۔" معید اس سے مصافحہ کرتے ہوئے کھڑا ہوا۔ ماہر نے گہری سانس خارج کی۔ "آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا۔" منہ میں بڑبڑایا۔ پھر کوٹ کا بٹن بند کرتے ہوئے اٹھا۔
"تم نے ویڈنگ کیک آرڈر کر دیا؟"
معید نے ماتھے کو چھوا۔ "اف... بہت سے کاموں میں بھول گیا۔"
"وہ میرا گفٹ ہوگا۔ اسے میرے اوپر چھوڑ دو۔" پھر اس کی آنکھوں میں دیکھ کے نرمی سے کہا۔ "اور اپنی بہنوں کو وقت سے پہلے سب بتا دو۔"
"کوشش کروں گا۔" اس کے انداز میں تکان تھی۔
معید چلا گیا تو شبنم وارد ہوئی۔ ساتھ ہی چند پرنٹ آؤٹس میز پہ رکھے جن پہ وہی سرخ ٹکڑا اسکین کر کے چھپا دکھائی دے رہا تھا۔
"میں نے اس سرخ موٹف کو مختلف سرچ انجنز میں ڈالا ہے۔ مجھے اس سے ملتا جلتا کوئی سرورق نہیں ملا۔ لیکن..." اس کی آنکھوں میں چمک در آئی۔ "یہ persian (ایرانی) آرٹ ورک ہے۔"
وہ تیزی سے سیدھا ہوا اور پرنٹ آؤٹس اونچے کر کے روشنی میں دیکھنے لگا۔
"اور یہ جائے نمازوں، ایرانی قالینوں اور مذہبی کتابوں کے سرورق پہ استعمال ہوتا ہے۔"
"مذہبی کتابیں۔" وہ تیزی سے بولا۔ "وہ کوئی

مذہبی کتاب ہے۔"

"مسئلہ دنیا میں مذہبی کتابوں پہ بننے والا آرٹ ورک عموماً اور جیٹل یا پرنٹس تک ہی ہوتا ہے اس لیے ہم یہ ٹھیک سے نہیں بتا سکتے کہ یہ ٹکڑا کس کتاب کا ہے۔ اس سے ملتے جلتے بہت سے ڈیزائن مجھے مل گئے ہیں۔ لیکن بالخصوص یہی ڈیزائن کہیں نہیں ملا۔" آخر میں قدرے مایوسی سے کندھے اچکائے۔

"تم جتنا کر سکتی تھیں تم نے کر لیا۔" ماہر نے تمام پرنٹ آؤٹس میٹ کے اکٹھے کیے اور انہیں اس سرخ ماڈل کے ساتھ رکھ دیا۔ یوں کہ کاغذوں کے کونے ماڈل کے نیچے آ گئے اور اب وہ ہوا سے اڑ نہیں سکتے تھے۔

"یقیناً میں آپ کی بیسٹ سیکرٹری ہوں؟" وہ عینک کے پیچھے سے مسکرائی۔

"سیکنڈ بیسٹ۔" وہ دوبارہ اپنے کمپیوٹر اسکرین کی طرف متوجہ ہو چکا تھا۔ شبنم کے ماتھے پہ سلوٹیں ابھریں۔

"میں بیسٹ ہوں۔" ماہر بے ساختہ طویل عرصے تک آپ کے پاس کوئی سیکرٹری نہیں ٹھہری۔"

"بہر حال بیسٹ تھی۔" وہ اب کچھ ٹائپ کر رہا تھا۔

"اچھا؟ کیا کرتی تھی وہ؟" وہ ناپسندیدگی سے اس کو دیکھ رہی تھی۔

ٹائپ کرتے ہوئے وہ مدھم سا مسکرایا۔ جیسے لمحہ بھر کو کسی اور زمانے میں جا پہنچا ہو۔

"وہ صرف کام ہی نہیں، بلکہ میرے دوستوں اور دشمنوں پہ بھی نظر رکھتی تھی۔"

شبنم نے ہونٹ بھینچ کر کے ناک سکوڑی اور ٹھک ٹھک کرتی پردہ ہٹا کے باہر چلی گئی۔

☆☆☆

ٹک ٹک ٹک...

وہ گہری نیند سے ہڑبڑا کے جاگی۔ دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ وہ نہ جانے خواب میں کیا دیکھ رہی تھی۔ سانپ۔ بچھو۔ دھن کی آواز پہ سب بھول گئی۔ سینے پہ ہاتھ رکھے بے اختیار الارم کلاک کو دیکھا۔

03:07AM

تین بج کر سات منٹ۔

کسی میکانکی عمل کے تحت اس نے موبائل اٹھایا اور نوٹس کھول کے آج کی تاریخ کے ساتھ وقت تحریر کیا۔

پھر گردن موڑ کے دیکھا۔ زیاد کروٹ لیے گہری نیند سو رہا تھا۔ کبھی وہ رات میں جاگتا تھا؟ کبھی نہیں۔ وہ ہر دوسرے میاں بیوی کی طرح شام تک ادھر ادھر کی باتیں کر کے اپنے درمیان آئی سرد دیوار کو پگھلانے میں کامیاب ہو چکے تھے۔ البتہ پاسپورٹ کے بارے میں نہ اس نے سوال پوچھا تھا، نہ زیاد نے چھٹی اپلائی کرنے کا ذکر دوبارہ کیا تھا۔

دھن خاموش ہو چکی تھی۔ وہ کانوں پہ تکیہ رکھ کے پھر سے لیٹ گئی۔ وہ آواز اب اسے ڈرانے لگی تھی۔

"مالا ایک بات کہوں؟ مجھے زیاد بھائی آپ کے کھنچے کھنچے، تھکے تھکے سے مختلف لگتے ہیں۔"

اس صبح جب سورج اپنے جوبن پہ چمک رہا تھا وہ دونوں کار پارک کر کے باہر نکل رہی تھیں۔ رامین نے بھورے رنگ کا عبایا پہن رکھا تھا اور اس نے ہلکا سر ڈھکا۔ سر پہ اسٹول تھا جس سے کانوں کے ٹاپس دکھائی دیتے تھے۔ اور آستین موڑ کے کہنیوں تک چڑھا رکھی تھی۔ آنکھوں پہ سیاہ سن گلاسز تھے۔

ان کے سامنے ایک کئی منزلہ اونچی عمارت کھڑی تھی، جس کی دیواریں شیشے سے ڈھکی تھیں۔

"اور تمہارا شوہر اتنا برا نہیں ہے جتنا تم بتاتی ہو۔" اس نے بظاہر ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔ جیسے وہ اس ذکر سے بچنا چاہ رہی ہو۔ مگر وہ بھی رامین تھی۔ مالا کی طرح وہ بات کا پیچھا نہیں چھوڑتی تھی۔

"ہارون کے گھر والوں کی وجہ سے ہمارے درمیان مسئلے ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن ہارون میری چھوٹی سے چھوٹی کامیابی کو بہت بڑھا چڑھا کے بتاتے ہیں۔ اور اگر آج بھی میری کوئی پرانی شاعری سامنے آ جائے تو وہ بہت فخر سے سب کو دکھاتے ہیں۔ لیکن مجھے لگا کہ زیاد بھائی آپ کی کامیابی پہ ان سکیور ہو رہے تھے۔ یہ کوئی اچھا سائن نہیں ہے۔" رامین کی زبان پر کوئی فلٹر نہ تھا اور مالا کی آنکھوں پہ سن گلاسز چڑھے تھے۔ ورنہ وہ ان میں ابھرتی بے چینی دیکھ لیتی۔

"زیاد کا کل ذرا موڈ خراب تھا، ورنہ وہ مجھے بہت اپریشیٹ کرتا ہے۔" وہ پھیکا سا بولی۔ جیسے اسے اپنی بات کا بھی یقین نہ ہو۔ وہ دونوں ساتھ ساتھ عمارت کی طرف بڑھ رہی تھیں۔

"اگر بیوی شوہر سے زیادہ کماتی ہو، یا اس کی تعریف کی جا رہی ہو، اور شوہر اس سے غیر آرام دہ ہونے لگے تو یہ چیز میاں بیوی کے رشتے کو کھا جاتی ہے۔ بند کمرے میں بیوی کو سراہنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ جو مرد اپنی بیوی پر بھری محفل میں فخر کر سکے، وہ ان سکیور مرد ہوتا ہے۔ جو یہ نہ کر سکے، وہ ان سکیور ہوتا ہے۔ آپ دونوں کو اس چیز پہ کام کرنے کی ضرورت ہے۔"

"زیاد..." الفاظ ختم ہو گئے۔ شک کا بیج دل کے کسی کونے میں سر اٹھانے لگا تھا۔

"ان سکیور مرد کو خود پہ بھروسا نہیں ہوتا۔ اسی لیے وہ اپنی بیوی کو ساری دنیا سے کاٹ کے رکھنا چاہتا ہے۔ بیوی میکے والوں سے ملے تو اس کو مسئلہ ہوتا ہے۔ بیوی کو کامیابی ملے تو اس کا موڈ خراب ہو جاتا ہے۔ یہ محبت یا پوزیسو نیس نہیں ہے۔ unhealthy behaviour (غیر صحت مندانہ رویہ) ہے جس کو شادی کے شروع میں ہی فکس کرنا ضروری ہے۔ میاں بیوی ایک ٹیم ہوتے ہیں۔ اگر وہ آپس میں مقابلہ کرنے لگ جائیں تو دنیا سے نہیں لڑ سکتے۔"

چھوٹی سی رامین بہت سمجھداری سے کہتی عمارت کی سیڑھیاں چڑھ رہی تھی۔ یہ جدہ کی ایک معروف کوورکنگ اسپیس تھی۔

"میں اس کو فکس کر لوں گی۔ وہ ٹھیک ہو جائے گا۔" اس نے گلاس ڈور سے اندر داخل ہوتے ہوئے گلاسز اتارے۔ نکلیں آنکھیں واضح ہوئیں۔ وہ اداس تھیں۔ الجھن میں تھیں۔ رامین نے اس بات پہ افسوس سے اسے دیکھا اور سر جھٹکا۔

"وہ آپ سے جھوٹ بھی بول رہے ہیں اور یہ سب وارننگ سائن ہیں۔ آپ کو ان کا ماضی کھوجنا چاہیے۔ کچھ ہے جو ہم نہیں جانتے۔ کوئی راز۔"

"میں بھی اس سے راز رکھنے لگی ہوں۔ میں بھی اچھی بیوی نہیں ہوں۔" اس کے انداز میں کچھ زخمی سا تھا۔ رامین نے الجھ کے اسے دیکھا۔

"کیسا راز؟"

مالا نے جواب نہیں دیا۔ وہ اب ریسپشن کے قریب آ چکے تھے۔ اس کے بعد کے مراحل بہت آسان تھے۔ چند منٹ بعد وہ دوسری منزل پہ بنے ایک کوورکنگ ایریا میں کھڑی تھیں جہاں قطار میں ڈیسک لگے تھے۔ چند خالی تھے۔ اور چند پہ فری لانسرز بیٹھے اپنے کاموں میں مصروف دکھائی دیتے تھے۔

"ہارون بھائی کو میرا شکریہ کہنا۔ ان کی وجہ سے مجھے اتنی آسانی سے یہاں ڈیسک مل گیا ہے۔"

"آپ نے مجھے اس وقت آسانی دی تھی جب مجھے اپنی کتاب چھپنی تھی۔ ہم کسی کے لیے آسانی پیدا کریں یا مشکل، وہ ایک نہ ایک دن ہمیں واپس ضرور ملتی ہے۔" رامین کھلے دل سے مسکرائی۔ "ہارون نے نورہ سے بات کر لی تھی۔ وہ کافی سخت قسم کی خاتون ہیں۔ آپ کی کوالٹی سے اتنی آسانی سے راضی نہیں ہوں گی۔ ان کو منانا اب آپ کا کام ہے۔"

نورہ عبدالمجید اسی کوورکنگ اسپیس میں ایک کارنر آفس میں بیٹھتی تھیں۔ ان کا آفس اس ہال سے چند گز کے فاصلے پہ تھا۔ شیشے کا دروازہ کھٹکھٹایا تو اندر سے ایک سرد سا "آئیں" سنائی دیا۔ وہ دھڑکتے دل

گیا۔ وہ واپس اپنے فلور تک آئی تو موبائل وقفے وقفے سے بجنے لگا۔ سلیم کی کالز آ رہی تھیں۔

"اتنی مسڈ کالز مت کیا کرو سلیم۔ یہاں واٹس ایپ نہیں چلتا۔ وی پی این آن کرنا پڑتا ہے پہلے آڈیو میسج بھیجا کرو بس۔" وہ لاک کھولتے ہوئے جھنجلا کے میسج ریکارڈ کر رہی تھی۔

لونگ روم میں زیاد بڑے صوفے پہ بیٹھا تھا یوں کہ پیر لمبے کر کے میز پہ رکھے ہوئے تھے۔ وہ اندر داخل ہوئی اور چہرے پہ مسکراہٹ لے آئی۔

"آپ کا دن کیسا گزرا؟" عبایا اتار کے کھونٹی پہ ٹانگتے ہوئے پوچھا۔

"بہت اچھا۔ اور تمہارا؟" وہ اچھے موڈ میں تھا اسے دیکھتے ہی مسکرا کے اٹھ کھڑا ہوا۔

"مجھے فیصل نہیں مل سکا۔ لیکن میں ہمت نہیں ہاروں گی۔" وہ تھکان سے مسکرائی۔

"اوہ اوکے۔ تم بہت ٹیلنٹڈ ہو۔ کچھ نہ کچھ مینیج کر لوگی۔ آج ہم باہر ڈنر کرتے ہیں۔ ٹھیک؟"

وہ اس کے عین سامنے آ کھڑا ہوا۔ وہ مسکرا رہا تھا۔ دونوں کے درمیان حائل سرد دیوار پگھلنے لگی۔ اسے آفس ڈیسک میں لاک کیا گیا بھورا پیکٹ یاد آیا۔ اسے پاسپورٹ کھولنا یاد آیا۔ اسے بہن کو گوگل پہ سرچ کرنا یاد آیا۔ اسے مالک کا نمبر کھو جانا یاد آیا۔ ایک عجیب سا گلٹ ہونے لگا۔ وہ بھی کن باتوں کو اپنے اور زیاد کے رشتے کے درمیان لا رہی تھی۔ وہ اس کو مکس کرتی گئی۔ وہ مالا تھی۔ وہ ہمیشہ سے سب کو مکس کر لیا کرتی تھی۔ حالات کو۔ اپنے بہن بھائی کو۔ بزنس کو۔

"اوکے۔ میں تیار ہو جاتی ہوں۔" وہ خوش گوار انداز میں بولی تو زیاد بھی مسکرا دیا۔ وہ تیار لگ رہا تھا۔ عبایا تو وہ پہنے ہی تھی۔

اسی پل سلیم کے آڈیو میسج آنے لگے۔ اس نے جلدی سے پہلا آڈیو کھولا۔

"دیوار کو سیم لگ رہی ہے باجی۔ پیسے بھیجیں تو میں ٹھیک کرواؤں۔"

"اف سیم... تم بھی نہ بہانے بہانے سے پیسے مانگتے ہو۔ ابھی میں مصروف ہوں۔ تین چار دن بعد یاد کروانا۔ بھیج دوں گی۔" وہ تیار ہونے کمرے میں چلی گئی۔ سلیم کے بھی بہانے ختم نہیں ہوتے تھے۔

☆☆☆

وہ جدہ کی ایک سنہری صبح تھی۔ سورج کی تپش اور سمندر کی نمی اس کو ورکنگ اسپیس کے اندر داخل ہونے سے قاصر تھی۔ جس کو اے سی کی ٹھنڈک نے خوش گوار ماحول عطا کر رکھا تھا۔

مالا اپنے ڈیسک پہ بیٹھی خاموشی اور سست روی سے کچھ ٹائپ کر رہی تھی جب ایک دم ٹھٹک کے رکی۔ دائیں بائیں دیکھا۔ کاغذ اٹھائے۔ فریم کے پیچھے جھانکا۔ بیگ کھول کے چیزیں الٹ پلٹ کیں۔ چہرے پہ پریشانی در آئی۔ وہ تیزی سے اٹھی اور راہداری کی طرف بڑھی۔ متلاشی نگاہیں اطراف میں دیکھ رہی تھیں۔

ہال کے سرے پہ کافی بار بنا تھا۔ وہاں کافی مشین اور وینڈنگ مشین اور فریج رکھے تھے۔

"میرا فون یہاں رہ گیا ہے شاید۔" وہ پریشانی سے بڑبڑاتے ہوئے اس طرف آئی۔ کپ ہٹائے۔ ادھر ادھر جھانکا۔

"یہ سعودی عریبیہ ہے۔ یہاں کوئی تمہارا فون نہیں چرائے گا۔ وہیں سے ملے گا جہاں اسے کھویا تھا۔" کافی مشین کے سامنے اپنا کپ رکھتی ہوئی سیاہ عبایا والی نورہ نے ایک اچٹتی نظر اس پہ ڈالی اور واپس مشین کی طرف متوجہ ہو گئیں۔ مالا نے گہری سانس خارج کی۔ لیکن فکرمندی کم نہیں ہوئی۔ وہ لاہور سے آئی تھی۔ فکر کرنا اس کی عادت میں شامل تھا۔

"شاید باتھ روم میں چھوڑ دیا ہو۔" خود سے بڑبڑاتی آگے بڑھنے لگی۔ پھر رکی۔ نظر نورہ کے دوسرے ہاتھ میں پکڑے کاغذوں پہ پڑی۔ وہ پرنٹ آؤٹس تھے جو وہاں رکھی کاپی مشین سے انہوں نے ابھی ابھی پرنٹ کیے تھے۔ مالا نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے۔ پھر خود کو روک لیا اور دوسری طرف

پلٹ گئی۔

"Say It" وہ نظریں کپ پہ جمائے بولیں۔ کپ میں بھورے مائع کی دھار گرتی جا رہی تھی۔

وہ دھیرے سے پلٹی۔

"یہ آپ کے کیفے کا تھیم ہے؟"

انہوں نے جواب نہیں دیا۔ سپاٹ چہرے کے ساتھ بھرتے کپ کو دیکھے گئیں۔

"اتنے گہرے رنگ افسردہ کرنے کے ساتھ ساتھ نیند بھی طاری کرتے ہیں۔ لوگ کیفے میں کافی کے لیے آتے ہیں تاکہ جاگ سکیں۔ ویسے بھی دنیا اب گہرے رنگوں سے دور جا رہی ہے۔ اب Bohemian ڈیکور کا زمانہ ہے۔ خاکی فرش، ہلکی دیواریں، rugs (غالیچے)، ہاتھ سے بنی ٹوکریاں... اور بہت سے پودے۔" آخر میں وہ مسکرائی۔

نورہ نے ایک نظر اٹھا کے اس کا چہرہ دیکھا۔ پھر کمان جیسے سیاہ ابرو اچکائے۔ کپ اٹھایا اور آگے بڑھ گئیں۔ اس نے افسوس سے انہیں جاتے دیکھا۔

موبائل باتھ روم میں ہی رکھا تھا۔ بالکل وہاں جہاں اس نے چھوڑا تھا اور وہ بج رہا تھا۔ ہارون کی کال آ رہی تھی۔ وہ صبح سے اس کو دو کالز کر چکی تھی۔ اسی لیے وہ کال بیک کر رہا تھا۔

"آپ نے اپنے فیصل سے بات کی؟" اس نے چھوٹتے ہی پوچھا۔

دوسری طرف خاموشی کا ایک طویل وقفہ چھا گیا۔ پھر وہ دھیرے سے کھنکھارا۔

"میں نے بات کی تھی۔ لیکن یہ سعودی تھوڑے" وہ جیسے الفاظ تلاش کر رہا تھا۔ "اصولوں کے پابند ہوتے ہیں۔ وہ سفارش پسند نہیں کرتا۔ اس لیے میں نے اصرار نہیں کیا۔" اس کا انداز محتاط سا تھا۔

"اوکے۔ نو پرابلم۔" اس کے اندر کچھ بجھ سا گیا۔ "زیاد کو مت بتائیے گا کہ میں نے اپنے کزن سے بات کی تھی۔ اس کو برا لگے گا۔" کچھ بے چین سا تھا اس کی آواز میں جو اسے کھٹکا۔ شاید اس کا وہم تھا۔ بہرحال اس نے ہارون کو تسلی دی کہ وہ زیاد کو کچھ نہیں بتائے گی۔ لیکن کال بند ہونے کے بعد وہ کتنی ہی دیر اپنی کرسی پہ یونہی بیٹھی رہی۔

کیا کرے؟ میز کی چٹ میں مالک فرید کا نمبر کئی دن سے آیا رکھا تھا۔ اس نے ایک دفعہ بھی اس نمبر پہ کال کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ دراز میں بھورا پیکٹ بھی موجود تھا۔ اس نے اسے بھی کھولنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

ماں ہوتیں تو بتاتیں کہ کیا کرنا ہے۔

☆☆☆

آج وہ گھر آئی تو اداس سی تھی۔ زیاد کو دوپہر میں میسج کر کے چھٹی کا پوچھا تھا۔ اس نے میسج دیکھنے کے باوجود جواب نہیں دیا تھا۔ مالا کا دل مزید خراب ہوا تھا۔ اپارٹمنٹ کا دروازہ کھولا تو وہ سامنے اوپن کچن میں بیٹھا دکھائی دیا۔ لیپ ٹاپ کاؤنٹر ٹیبل پہ رکھے، وہ عینک لگائے کچھ ٹائپ کر رہا تھا۔ ایک نظر اٹھا کے اسے دیکھا۔ آج چہرے پہ مسکراہٹ نہیں آئی۔ آج ماتھے پہ بل برقرار رہے۔

"میں نے سوچا تھا میری شادی ہو گی، تو گھر آنے پہ میری بیوی میرا کھانے پہ انتظار کرتے ہوئے ملے گی۔ اور ہم ایک خوش گوار ماحول میں ڈنر کیا کریں گے۔" واپس اسکرین پہ نگاہیں جمائے کہتے ہوئے اس کی آواز میں ناپسندیدگی سی تھی۔

"آپ کو یہ نہیں سوچنا چاہیے تھا کیونکہ آپ ایک کیریئر اورینٹڈ لڑکی سے شادی کر رہے تھے۔" اندر آتے ہوئے انگلی سے اسٹول اتارا اور کھونٹی پہ لٹکایا۔ پھر کرسی پہ بیٹھ کے جھک کے جوتے اتارنے لگی۔ انداز میں تھکان تھی۔

"یا آپ کو ایسی لڑکی سے شادی کرنی چاہیے تھی جس کو کیریئر بنانے میں دلچسپی نہ ہو۔ اور وہ گھر پہ رہنا چاہتی ہو۔"

زیاد نے نگاہیں اٹھا کے اسے دیکھا۔
"اتنی تلخ کیوں ہو رہی ہو؟ کیا گھر میں رہنا بری بات ہے؟"
"میں نے کب کہا بری بات ہے؟ میری اپنی بہن ہاؤس وائف ہے۔ یہ اس کی چوائس ہے۔ لیکن اگر آپ کو ہاؤس وائف چاہیے تھی تو کیریئر وومن سے شادی نہیں کرنی تھی نا۔" وہ خفگی سے کہتی ہوئی کچن کی طرف آئی اور فریج کھولا۔ باہر شدید گرمی تھی اور اس کا حلق خشک ہو رہا تھا۔ اسے اس وقت صرف ٹھنڈا پانی چاہیے تھا۔
"تم تو ایسے کہہ رہی ہو جیسے تمہارا کوئی کیریئر ہے۔" اس نے ہے پہ زور دیا۔ "ایک کو ورکنگ اسپیس میں جاتی ہو' اے سی میں بیٹھتی ہو' پلان بناتی ہو' کافی پیتی ہو اور واپس آجاتی ہو۔ کیا فائدہ اس سب کا؟"
اس کے دل پہ جیسے کوئی پیر رکھ کے گزر گیا تھا۔ وہ تڑپ کے مڑی اور تکلیف سے اسے دیکھا۔
"اگر آپ نے دبئی سے اپنے ٹرانسفر کروانے کی کوشش کی ہوتی تو میرا کیریئر پھر سے شروع ہو چکا ہوتا۔ دبئی میں مجھے جاب مل گئی تھی اور یہاں بھی میں فارغ نہیں ہوں۔ اپنا اسٹارٹ اپ شروع کرنے کی کوشش کر رہی ہوں۔" اسے جلد غصہ نہیں آتا تھا لیکن اس وقت آ رہا تھا۔ گال گلابی ہو رہے تھے اور آنکھوں میں نمی در آئی تھی۔
"میں کچھ غلط تو نہیں کہہ رہا۔" وہ بڑبڑاتے ہوئے واپس اسکرین کی طرف متوجہ ہوا۔
"شادی سے پہلے آپ نے یہ واضح کیا تھا کہ آپ کو میرے کام کرنے پہ اعتراض نہیں ہوگا تو اب بھی نہیں ہونا چاہیے۔"
"اعتراض نہیں کر رہا۔ لیکن تم فضول میں وقت اور پیسہ ضائع کر رہی ہو۔"
وہ پانی کی ٹھنڈی بوتل ہاتھ میں لیے کتنی ہی دیر وہیں کھڑی اسے دیکھتی رہی۔ اس کا چہرہ گرم ہو کے دہک رہا تھا۔
"آپ نے چھٹی اپلائی کی؟"
اور زیاد سلطان کے جیسے زخم پہ کسی نے نمک چھڑک دیا ہو۔
"کشمالہ...." اس نے تڑپ کے اسکرین فولڈ کی اور عینک اتار کے برہمی سے اسے دیکھا۔
"میں نے بتایا ہے' ہم نہیں جاسکتے۔"
"ہم نہیں جاسکتے ہیں' تو میں جاسکتی ہوں اور میں جاؤں گی۔ وہ میرا بھائی ہے۔ میں اس سے تعلق ختم نہیں کرسکتی۔ اگر آپ کو میری پرواہ ہے تو آپ اپنی سیٹ بک کروائیں۔ نہیں تو میں اکیلے جاسکتی ہوں۔" اس نے جیسے فیصلہ سنایا اور بوتل تھامے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔
زیاد سوچتی نظروں سے اس کی پشت کو دیکھنے لگا۔
"تمہیں سعودی عرب سے نکلنے کے لیے ری انٹری چاہیے اور میری اجازت کے بغیر وہ تمہیں نہیں ملے گی۔"
کمرے تک جاتے اس کے قدم ٹھہرے۔ وہ دھیرے سے مڑی۔ سبز آنکھوں کی پتلیاں سکوڑ کے زیاد سلطان کو دیکھا۔ وہ پرسکون سا سینے پہ بازو لپیٹے بیٹھا اسے دیکھ رہا تھا۔
"اور مجھے یقین ہے کہ آپ میری ری انٹری سائن کردیں گے اور ماہی کی پیش گوئی کو درست ثابت نہیں ہونے دیں گے۔ میں فریش ہو کے آتی ہوں' پھر ڈنر کریں گے۔ میں صبح کھانا بنا کے گئی تھی۔ ہر روز کی طرح۔"
اس کے لہجے میں کچھ سخت تھا۔ کچھ مختلف۔
زیاد نے پہلو بدلا۔ سر کو خم دیا۔ چہرے کے تنے تاثرات ڈھیلے ہوئے۔
"میں باس سے چھٹی کے لیے دوبارہ بات کروں گا۔ ڈونٹ وری۔" انداز نرم تھا۔ مالا نے بس ایک نظر اسے دیکھا' سر کو جنبش دی اور آگے بڑھ گئی۔
اب ہر طرف خاموشی چھائی تھی۔ ☆☆

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

زینب ظفر

لمحے

”اماں......! نزہت آرہی ہے۔ سنا اماں؟ میری جیٹھانی نزہت۔ اماں وہی نزہت جس کے در پہ میں اپنے بیٹے کے لیے رشتہ مانگنے گئی تو اس نے کہا تھا ”اپنی اوقات میں رہ نادرہ...... کہاں تیرا بیٹا‘ کہاں میری شہزادی۔ تو نے یہ سوچا بھی کیسے‘ ارے ماں بیٹا جاکر ایک بار آئینہ ہی دیکھ لیتے۔ اور نہیں تو اپنے ماچس جتنے گھر پہ ہی نظر ڈال لی ہوتی۔ تو میری کوٹھی تک آنے کی تیری جرات ہی نہ ہوتی۔“

میں اپنے کمرے میں نوٹس بنارہی تھی اور امی کی آواز مجھے بری طرح ڈسٹرب کیے جارہی تھی۔ ان کی تیز جوشیلی آواز تھی تو میں نے نانی اماں کی پرسکون آواز سنی۔

”آ کیوں رہی ہے وہ؟“ نانی صحن میں قرآن کی تلاوت کررہی تھیں۔

کھڑکی سے میں نے انہیں قرآن چوم کر رحل پہ رکھتے دیکھا۔ اماں پاس ہی بیٹھ گئیں۔

”ہونہہ...... کیوں کہ جس اونچے گھر میں اس نے بیٹی کو بیاہا تھا۔ انہوں نے بھی نزہت کو اوقات یاد دلادی۔ جھگڑے کہاں نہیں ہوتے۔ لیکن انہوں نے تو جھٹ طلاق ہی دے ڈالی اور بیٹی کو نزہت کے در پہ پھینک گئے۔ اب اسے قدر آئی میرے شریف بیٹے کی اور میری۔“ اماں کا لہجہ بتارہا تھا کہ وہ دل میں بہت کچھ رکھے بیٹھی تھیں نانی بھی سمجھ گئیں، پیار سے بولیں۔

"رفعت اچھی اور نیک لڑکی ہے نادرہ...... اگر تیرے بیٹے کی خواہش کا وسیلہ بن رہا ہے تو دیکھ...... پرانے ادھار چکانے مت بیٹھ جانا...... اسے......" مگر امی نے جملہ کاٹ دیا تھا۔

"چکاؤں گی ۔ آج تو گن گن کے بدلے چکاؤں گی اماں...... ایسے بھگو کر ماروں گی جوتے کہ نزہت ساری رات کروٹیں بدلے گی...... آئینے میں اسے اس کا بدصورت چہرہ دکھاؤں گی میں۔ کانوں کو ہاتھ لگائے گی میرے زہر بھرے طعنے سن کر ۔ میں اس کے گھر سے روتے ہوئے نکلی تھی۔ آج میرے گھر سے روتے ہوئے جائے گی وہ۔"

امی ہانپتے ہوئے بولے گئیں۔ نانی سخت ناراضی کے ساتھ انہیں دیکھ رہی تھیں۔ تب ہی امی کی نظر ان کے قرآن پر پڑی۔ انہوں نے کتاب مقدس اٹھائی اور بولیں۔

"اماں! یہ وہ ابا والا قرآن ہے نا۔ میں لے لوں؟" نانی نے ان سے قرآن لے کر سنجیدگی سے کہا۔

"یہ میرے شوہر کی نشانی ہے۔ یہ اسے شاہ فیصل مرحوم نے دیا تھا۔ جب شاہ فیصل "اسلامی سربراہی کانفرنس" پہ پاکستان تشریف لائے تھے۔ اس نے انہیں سلام کیا تھا اور تسبیح پیش کی تھی۔ جس پر انہوں نے اپنی گاڑی سے یہ قرآن نکال کر اسے دیا تھا۔ اس کا حق دار میں صرف اسے بناؤں گی...... جس کا دل صاف ہوگا...... میں نے تیری یہ تربیت نہیں کی تھی نادرہ...... بڑوں کا احترام سکھایا تھا...... صلہ رحمی سکھائی تھی اور تو......"

امی کا چہرہ میں نے ایک لمحے کے لیے متغیر ہوتے دیکھا مگر......

"نہیں اماں۔ نزہت کی طبیعت صاف کرنے سے مجھے آج کوئی نہیں روک سکتا، آپ کی تربیت بھی نہیں" ۔ اور یہ وہ وقت تھا جب اطلاعی گھنٹی بجی اور پھر دروازہ دھکیل کر نزہت تائی اندر داخل ہوگئیں۔ لیکن ہماری توقعات کے برعکس وہ ایک اجڑی ہوئی عورت تھیں۔ اور...... جس کے ہاتھ جڑے ہوئے تھے جب بولیں تو آواز بھیگی ہوئی تھی۔

"لو...... آج میں تم سے اپنی بیٹی کی خوشیوں کی بھیک مانگنے آئی ہوں نادرہ...... لو آج خوب ذلیل کر...... آج تو ایک لفظ دل میں نہ رکھنا...... آج سارے بدلے لے لو...... لیکن تمہیں اللہ کا واسطہ...... پھر اس کے بعد میری عرضی قبول کر لینا"

جب تک ہم تینوں ان تک پہنچتیں۔ وہ روتے ہوئے بولے گئیں اور ہکا بکا رہ گئیں جب امی نے ان کے ہاتھ تھامے۔

"نہیں بھابھی...... ذلیل ہوں آپ کے دشمن۔"

امی کی آواز کی نمی نے مجھے ٹھٹکا دیا۔ مگر نانی مسکرا دیں۔

"آپ بڑی ہیں...... ہم چھوٹے...... بڑے جھڑک ہی دیا کرتے ہیں۔" امی کا انتقام؟ وہ ان کی شیخیاں؟ ۔ یا خدا وہ برا لمحہ آنے سے پہلے ہی کیسے ٹل گیا۔ وہ تائی کے ہاتھ پکڑ کر بول رہی تھیں۔ دونوں ہی رو رہی تھیں۔

"آپ نے پہلے پہل ایک ماں کی طرح گھر داری سکھائی مجھے۔ بچوں کی بیماریوں پہ میرے ساتھ جاگیں...... مشکل وقت میں رقم قرض دی...... بس ایک رشتہ ہی نہیں دیا نا...... تو وہ تو آپ کا حق تھا جسے مرضی دیں۔"

"میری نادرہ......"

"بھابھی جان"

اور دونوں آپس میں لپٹ گئی تھیں۔ میں حیران کھڑی تھی اور نانی نے ان کے الگ ہونے پر اپنا قرآن آگے کیا۔

"لو نادرہ...... اپنی امانت...... اپنا حق سنبھالو بیٹی!"

اور امی کی آنکھوں میں قرآن تھامتے ہوئے آنسو آگئے تھے۔

☆☆

آگہی

لڑکیوں کے سپنوں کی خواب جیسی باتوں میں
ایک مشترک سپنا اپنے گھر کا ہوتا ہے
تتلیاں پکڑنے کی عمر جب گزرتی ہے
لڑکیوں کے خوابوں کی چلمنیں سمٹتی ہیں
اور خوش نما پریاں اپنے گھر میں بستی ہیں
تب وہ ایک لمحے کی اجنبی صداقت سے
روشناس ہوتی ہیں
اپنے گھر کی خواہش میں ان کی شوخ
آنکھوں نے
جتنے خواب دیکھے تھے، اب وہ سب
پرائے ہیں
صرف ایک بندھن کی بے قرار رفاقت میں
خواب ہی نہیں ٹوٹے، اپنا پن بھی کھویا ہے
لڑکیوں کے سپنوں کی خواب جیسی باتوں میں
کتنا قیمتی سپنا اپنے گھر کا ہوتا ہے

فرزانہ ناز

کیسا دل سوز یہ تنہائی کا سفر تھا
سچ پوچھو تو یہ جدائی کا سفر تھا

عجب شان سے وہ اکثر راہ میں ملتا تھا
ہر لمحہ ایسا لگتا ہے گویا دلربائی کا سفر تھا

جدا ہوا مجھ سے، ساتھ رستے میں چھوڑا
یقین ہو گیا کہ وہ دراصل بے وفائی کا سفر تھا

موسیقی تھی ہر طرف خواب کے سفر میں
پُر لطف تھا کتنا یہ جو تنہائی کا سفر تھا

ہم نے کچھ یوں زندگی گزاری ہے فیضان
ایسا لگتا ہے کہ یہ محض جگ ہنسائی کا سفر تھا

فیضان سروری

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"دو نعمتیں ایسی ہیں جن کے بارے میں اکثر لوگ دھوکے کا شکار ہیں۔ صحت اور فراغت۔"

صحت میں انسان بہت سی نیکیاں کرسکتا ہے جو بیماری میں نہیں کرسکتا، غفلت کی وجہ سے یہ موقع ضائع کر دیتا ہے۔ اسی طرح اپنے وقت کی صحیح قیمت وصول نہ کرکے گھاٹا پاتا ہے۔

ہم عام طور پر کہہ دیتے ہیں کہ فلاں نیکی نہیں کرسکتا کیونکہ میرے پاس وقت نہیں، حالانکہ بہت دفعہ ہم اپنا وقت کھیل کود، لہو لعب، ہنسی مذاق، غیبت وغیرہ اور فضول گپ بازی میں گزار دیتے ہیں۔ ٹی وی، ویڈیو گیم وغیرہ پر وقت کا ضائع ہونا بہت واضح ہے۔

ان فضولیات میں وقت ضائع کرنے کے بجائے ایسی تفریح کا انتخاب کرنا چاہیے جس سے کوئی فائدہ حاصل ہو۔ بہت سے غیر اسلامی تہواروں مثلاً بسنت وغیرہ پر بے شمار وقت اور پیسہ ضائع ہوتا ہے اسی طرح کے گناہوں کا ارتکاب کرکے شیطان کو خوش کیا جاتا ہے۔ مسلمانوں پر ان سے اجتناب کرنا فرض ہے۔

پیش بندی

جولیٹ نے شمع سے پوچھا۔
"اگر تمہیں مجھ سے محبت تھی تو تم نے پہلے اس کا اظہار کرنے پر تالا کیوں لگا رکھا تھا تم نے تو مجھے بالکل ہی مسترد کر دیا تھا۔"

"میں دیکھنا چاہتی تھی تم کیا ردعمل دکھاتے ہو۔" شمع نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔
"میں طیش سے کہتا تو...؟"

"ایسا نہیں ہوسکتا تھا۔ میں نے دروازے کو تالا لگا رکھا تھا۔" شمع نے اطمینان سے جواب دیا۔

فرمودات آئن اسٹائن

- اپنا ہاتھ ایک منٹ کے لیے گرم چولہے پر رکھو تو یوں محسوس ہوگا کہ گھنٹے بھر سے وہیں رکھا ہوا ہے۔ کسی خوبصورت لڑکی کے ساتھ ایک گھنٹہ گزارو تو یوں لگے گا جیسے ابھی ایک منٹ ہی گزرا ہے۔ یہی نظریہ اضافیت ہے۔
- اگر حقائق کسی نظریے پر پورے نہیں اترتے تو حقائق بدل ڈالو۔
- ہمیشہ سے عظیم انسانوں کے نظریات کو اوسط درجے کے ذہنوں کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا ہے۔
- بے وقوفی ایک کام کو بار بار کرنا اور ہر بار مختلف نتائج کی توقع رکھنا۔
- دانش مند وہ ہے جو مسائل کو درست طریقے سے حل کرے، نابغہ وہ ہے جو انہیں پیدا ہی نہ ہونے دے۔
- جس نے کبھی کوئی غلطی نہیں کی اس نے کچھ نیا کرنے کی کوشش بھی نہیں کی۔
- میں نہیں کہہ سکتا کہ تیسری جنگ عظیم میں کون سے ہتھیار استعمال ہوں گے مگر یہ یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ چوتھی جنگ عظیم پتھروں اور ڈنڈوں سے لڑی جائے گی۔

- عقل مندی اور بے وقوفی میں فرق یہ ہے کہ عقل مندی کی ایک حد ہوتی ہے۔
- مرد عورتوں سے اس لیے شادی کرتے ہیں کہ وہ ہمیشہ ایسی ہی رہیں گی جیسی وہ شادی کے وقت ہیں۔ اور عورتیں مردوں سے اس لیے شادی کرتی ہیں کہ وہ شادی کے بعد بدل جائیں گے۔ افسوس کہ دونوں کو مایوسی ہوتی ہے۔
- صرف دو چیزیں لامحدود ہیں۔ کائنات اور حماقت۔ کائنات کے بارے میں مجھے ابھی تک سو فیصد یقین نہیں۔

پرکشش شخصیت

مشہور مصنف مسٹر گارلنڈ بائرن نے اپنی ایک تصنیف میں ایک سرمایہ دار سے کیا گیا سوال تحریر کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے۔
"میں نے سرمایہ دار سے سوال پوچھا کہ اس نے اپنے وسیع کاروبار کو چلانے کے لیے اور بے حساب دولت حاصل کرنے کے لیے کن کن اور کس قسم کے لوگوں سے مدد طلب کی تھی۔ سرمایہ دار کا جواب تھا۔
"میں انسان کے لیے سب سے پہلے پرکشش شخصیت کو ترجیح دیتا ہوں اور اسی کو پسند کرتا ہوں۔"

اس کے بعد

ایک امیر صنعت کار ایک مچھیرے کو دیکھ کر بہت حیران ہوا جو مچھلیاں پکڑنے کے بجائے اپنی کشتی کے کنارے سگریٹ سلگائے بیٹھا تھا۔
صنعت کار: "تم مچھلیاں کیوں نہیں پکڑ رہے؟"
مچھیرا: "کیونکہ آج کے دن میں کافی مچھلیاں پکڑ چکا ہوں۔"
صنعت کار: "تو تم مزید کیوں نہیں پکڑ رہے؟"
مچھیرا: "میں مزید مچھلیاں پکڑ کر کیا کروں گا؟"
صنعت کار: "تم زیادہ روپے کما سکتے ہو۔ پھر تمہارے پاس موٹر والی کشتی ہوگی جس سے تم گہرے پانیوں میں جاکر مچھلیاں پکڑ سکو گے۔ تمہارے پاس نائلون کے جال خریدنے کے لیے کافی پیسے ہوں گے۔ اس سے تم زیادہ مچھلیاں پکڑو گے اور زیادہ روپے کماؤ گے۔ جلد ہی تم ان پیسوں کی بدولت دو کشتیوں کے مالک بن جاؤ گے۔ ہو سکتا ہے تمہارا ذاتی جہازوں کا بیڑا ہو۔ پھر تم بھی میری طرح امیر ہو جاؤ گے۔"
مچھیرا: "اس کے بعد میں کیا کروں گا؟"
صنعت کار: "پھر تم آرام سے بیٹھ کر زندگی کا لطف اٹھانا۔"
مچھیرا: "تمہیں کیا لگتا ہے، میں اس وقت کیا کر رہا ہوں؟"

سمجھ دار بیوی

مسز آئن اسٹائن کا کہنا ہے کہ ایک اچھی اور سمجھ دار بیوی شوہر کی کامیابی میں برابر کی حصہ دار ہوتی ہے۔ میرے شوہر چونکہ ہر وقت مصروف رہتے تھے۔ لیکن ان کی مصروفیت میں انہیں تھوڑی تفریح بہم پہنچانے کا انتظام اس طرح کرتی تھی کہ اپنے دوست احباب کو کبھی کبھی چائے پر مدعو کرلیا کرتی تھی۔ اس طرح آئن اسٹائن ان سے مل کر کچھ فرحت محسوس کرتے ان لوگوں سے گپ شپ کرتے۔ ان کے دل و دماغ کو آسودگی نصیب ہوتی۔ کئی دفعہ ایسا بھی ہوا کہ میرے شوہر اپنی مصروفیت کی وجہ سے چائے میں شریک ہونے سے معذوری کا اظہار کرتے تو میں انہیں بہلا پھسلا کر کسی نہ کسی طور چائے میں شرکت پر راضی کر لیتی۔ میری ہر ممکن کوشش ہوتی تھی کہ ان کے تھکے ہارے دل و دماغ کو کسی طرح آرام پہنچاؤں۔

مختصر مختصر

- میرے دادا جان آزادی کی تلاش میں ایک سو سال پہلے امریکہ گئے تھے۔ لیکن ان کی جدوجہد لاحاصل رہی۔ ان کے پیچھے پیچھے دوسری کشتی میں دادی جان بھی پہنچ گئیں۔
- چچا جان بہت ہی اچھے لطیفہ ساز واقع ہوئے ہیں۔ انہوں نے ورزش کے لیے گھومنے والی سائیکل پر بھی مقبول عام آئینہ لگا رکھا ہے۔

نادیہ یاسر

امت الصبور

سارہ رشید لیاری — کی ڈائری سے

نئے سال کے موقع پر مسٹری محمد اللہ دین کی نظم
آپ کی نذر

دسمبر جانے والا ہے
چلو اک کام کرتے ہیں
پرانے باب بند کر کے
نظر انداز کرتے ہیں

نئے سپنے سب ہی چن کر
الفت کے دھاگے چن کر
وفا داری پہ جینے کی
راہیں ہموار کرتے ہیں

بھلا کر رنجشیں ساری
مٹا کر نفرتیں دل سے
معافی دے دلا کر
اپنے دل صاف کرتے ہیں

جہاں پر ہوں سب ہی مخلص
نہ ہو دل کا کوئی مفلس
اک ایسی بستی اپنوں کی
کہیں آباد کرتے ہیں

جو تم دیتے نہ ہوں گہرے
ہوں ایسے سب وہاں ٹھہرے
سب اپنے ہی مکینوں سے
مکاں کی بات کرتے ہیں

نہ دیکھا ہو زمانے میں
نہ پڑھا ہو فسانے میں
اب ایسے جنوری کا ہم
سب ہی آغاز کرتے ہیں

محمد سہیل — کی ڈائری سے

میری ڈائری میں تحریر رئیس وارثی کی یہ غزل
آپ سب کی نذر

رئیس صاحب یہ اپنے غم کا عجب فسانہ سنایا تم نے
کہ خود بھی روئے کسی کی خاطر ہمیں بھی شب بھر رلایا تم نے

نہ دل فگاری، نہ ہم نوائی، نہ کوئی اندیشہ جدائی
جو اس کی فطرت تھی بے وفائی تو اس سے دل کیوں لگایا تم نے

تمہیں وفا کی اگر طلب تھی تو بے وفائی نہ بے سبب تھی
جسے بھی چاہا ہدف بنایا نہ دیکھا اپنا پرایا تم نے

یہ بہکے بہکے قدم تمہارے، یہ ہر نظر درد کے اشارے
وہ راز جو سب پہ عیاں ہے پیارے وہ راز سب سے چھپایا تم نے

یہ مہرباں کی بخشش کہ مسلسل جفا کی ان سے امید بر ہو
رئیس تم بھی بھٹکتے پاگل دیا ہوا بس جلایا تم نے

نادیہ خاتون

خط بھجوانے کے لیے پتا۔
خواتین ڈائجسٹ۔37۔ اردو بازار کراچی۔
Email:Info@khawateendigest.com

مشعل جمیل...... گوجرانوالہ
ٹائٹل پسند آیا۔ سدرۃ المنتہیٰ سے ملاقات زبردست رہی۔ دانہ پانی کا اختتام اداس کر گیا۔ اگلے ماہ کا انتظار رہے گا۔ راحت جبیں کا ناول ابھی نہیں پڑھا۔ افسانوں میں ہائی لائٹ بازی لے گیا۔ ناولا اچھا چل رہا ہے۔ کرداروں کو ایک دوسرے کی خوبیاں اور خامیاں بہت اچھے طریقے سے معلوم ہوتی ہیں کہ کس نے کس وقت کیا کرنا ہے۔ اگلا بندہ کیا قدم اٹھانے والا ہے پھر پتا نہیں کیوں ان کے ساتھ ٹریجڈی ہوتی ہے۔
آسیہ جی کے ہر ناول میں انڈیا کے شہر ہوتے ہیں، کیا وہ انڈیا میں رہتی ہیں۔
ج: پیاری مشعل! آسیہ رئیس خان انڈیا میں رہتی ہیں اس لیے ان کی تحریروں میں انڈیا کے شہروں کے نام نظر آتے ہیں۔
خواتین کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

ارم نعیم...... بحریہ ٹاؤن راولپنڈی
پہلے میں آپ کو بتاؤں کہ میں نے آپ کو تین دفعہ خط لکھا ہے، پہلی دفعہ آپ نے میرا نام ٹھیک ہی لکھا تھا۔ دوسری دفعہ آپ نے میرا نام ارم حلیم لکھا اور اب تیسری دفعہ آپ نے ارم نیلم لکھا۔ میرا نام ارم نعیم (ہے اس بار مجھے ڈائجسٹ بہت لیٹ ملا۔ اور میرے ایگزامز قریب ہیں۔ تو اس وجہ سے بھی میں نے صرف ناولا ناول ہی پڑھا۔ مجھے ابھی تک یقین نہیں آ رہا ہے کہ زیادوں کی ماں سرکار ہے۔ ہم سب نے سرکار کو آدی سمجھا تھا۔ میں تو زیاد کی ماں کو بہت اچھا سمجھتی تھی۔ پر زیاد مجھے شروع سے ہی برا لگتا تھا۔ خیر ویسے یہ قسط بھی ہمیشہ کی طرح بہت ہی زبردست تھی۔ باقی میں نے جو پڑھا اس کے علاوہ میں نے کچھ نہیں پڑھا کیونکہ پہلا پیپر 25 تمبر کو ہے۔
ج: پیاری ارم! ہمیں بے حد افسوس ہے کہ آپ کے تین خط شائع ہوئے اور دو بار نام غلط شائع ہوا۔ لیکن اس میں ہمارا زیادہ قصور نہیں ہے۔ آپ نعیم جس طرح لکھتی ہیں۔ اس کو پڑھنا آسان کام نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو ہر امتحان میں کامیابی سے نوازے۔

اجالا خان...... کراچی
سب سے پہلے اپنا تعارف کرواؤں۔ ڈائجسٹوں، رسالوں، میگزین وغیرہ سے تعلق قریباً سولہ سال پرانا ہے بچپن سے لڑکپن میں داخل ہوئی تو تینوں بڑی بہنوں کو ڈائجسٹوں کا شوقین پایا، ان کی دیکھا دیکھی میں نے بھی پڑھنا شروع کر دیے کچھ سمجھ میں آتا کچھ سر کے اوپر سے گزر جاتا لیکن شوق و دلچسپی بڑھتی رہی پڑھتے پڑھتے لکھنے کا شوق جاگا۔ دو، تین ڈائجسٹ میں افسانے، کہانیاں بھیجیں جو اللہ کے فضل سے شائع ہوئیں۔ شاعری میں بھی طبع آزمائی کی، وہ بھی شائع نہیں ہوئی۔ کچھ سال لکھا۔ پھر والد کی بیماری ان کا انتقال۔ بڑی بہنوں کی شادی اور گھر کی پریشانیوں اور ذمہ داریوں نے لکھنے سے دور کر دیا مگر پڑھنا نہیں چھوڑا۔ پھر میں بیمار ہو گئی اور کچھ عرصے بعد شادی ہو

راحت جبیں کو ابھی نہیں پڑھا۔ امید رکھیں، اداس مت رہا کریں۔ آپ بہت اچھی ہیں اور ہنستے ہوئے بہت اچھی لگتی ہیں۔ باقی سارے سلسلے ٹھیک ہی تھے۔ اگر آپ نے میرا خط شائع نہ کیا تو؟ کچھ نہیں کیونکہ جب آپ نے میری پچھلی چیزیں ردی میں پھینکی تھیں تو میں نے کون سا ٹریفک بلاک کر کے سیاپا ڈالا تھا؟ نفسیاتی الجھنیں کی بہن مس زے کہتا ہے آپ دلیر سے اتنی دوستی کریں، اس کو اتنا پیار کریں کہ وہ حیران رہ جائے۔ وہ دم بخود چکرا جائے اور جب کوئی اس کے کان بھرے تو وہ آگے سے کہے گا۔ "لیکن میری امی تو اتنی سویٹ ہیں کہ اب میں سوچ بھی نہیں سکتی ہوں۔"

اچھا خط کو جو مرضی کریں لیکن غزل اور افسانہ اللہ کا واسطہ شائع کر دیجیے گا۔ سرورق پر کتنے عرصے سے کوئی دلہن نہیں بٹھائی۔ وجہ؟ دلہن شازیہ کو بہت اچھی لگتی ہے۔ شازیہ میری بہن اور آپ کی فین اس کا سلام اور میرا اللہ حافظ قبول کریں۔

پیاری نجب! آپ کا افسانہ لحہ پڑھ لیا ہے۔ شائع ہو جائے گا۔ پچھلے ناول ہمیں موصول نہیں ہوئے۔ شازیہ کو ہماری طرف سے وعلیکم السلام کہہ دیں۔

نخوت حق..... ٹنڈو آدم

اس ماہ تو خواتین ڈائجسٹ نے چونکا دیا۔ ہاہاہا جی آپ 4 دسمبر کچھ چیزوں کی خریداری کے لیے بازار جا رہا ہوا اور رسالے والے بھائی کے اسٹال کے سامنے سے گزر ہوا تو بھائی نے جھٹ سے خواتین ہمارے سامنے کیا کہ یہ لیں باجی آپ کا رسالہ۔ جلدی سے پکڑ لیا اور سامان لے کر جلدی جلدی گھر پہنچے سب سے پہلے صفحہ "ہمارے نام" کھولا۔ سامنے ہی اپنا نام دیکھ کر دل خوش ہوا کہ میرا خط اتنا اچھا نہیں ہوتا جتنا باقی بہنوں کا ہوتا ہے۔

سب سے پہلے کرن کرن روشنی میں "نماز" کے ٹاپک پر پڑھ کر اپنی اصلاح کی اور باقی گھر والوں کو بھی "درس" دیا۔ پھر انشاء جی کی کھٹی میٹھی باتیں اف ہنس ہنس کر ہمارے پیٹ میں درد شروع ہو گیا ہاہاہا اس کے بعد سیدھے ہم پہنچے "دانہ پانی" کی جانب آخری قسط کا اینڈ بہت زبردست اور آخری پیراگراف کی لائنز بہترین تھیں۔ دل کو چھونے والے الفاظ، مرتا کا اینڈ پڑھ کر افسوس ہوا۔ سوچتا ہے بیچاری پھر اکیلی رہ گئی۔ خیر آپی دانہ پانی کے اگلے حصے کا انتظار رہے گا۔

سمیرا آپی کی طبیعت خرابی کا پڑھ کر دل اداس ہوا۔ راحت آپی کا نیا سلسلہ شروع ہوا۔ معذرت آپی ابھی پڑھا نہیں۔ نمرہ آپی ملالا پڑھ کر ہمیشہ کی طرح مزہ آیا اور جب بیربل نے کبیرہ بیگم کے چہرے پر ناک کے بارے بولا تھا جو کبیرہ بیگم نے سرجری کے بعد پکی کی وہ سوٹ نہیں کر رہی ہاہاہا کتنا محنت طلب کام کیا تھا۔ اس نے مزا آ گیا۔ باقی رسالہ ابھی نہیں پڑھ سکی۔

آپ کا باورچی خانہ میں نگہت آصف کو پڑھ کر اچھا لگا۔ اور موسم کے پکوان بھی مزہ دار رہا۔ سردی کے مطابق بیوٹی بکس تو ہمیشہ ہی اچھا ہوتا ہے اور عدنان بھائی کے بہنوں کو مشورے کار آمد ہوتے ہیں۔ عدنان بھائی راستہ دکھا دیتے ہیں۔

ج: پیاری نخوت! ہماری کوشش تو یہی ہوتی ہے کہ پرچا آپ کو وقت پر مل جائے اور آپ کو انتظار کی زحمت نہ اٹھانا پڑے۔ خواتین کی پسندیدگی کے لیے ممنون ہیں۔

ناہید اسماعیل...... کراچی

اکتوبر کے شمارے میں بہن مہناز رانی کی بات کے جواب میں نے لکھا تھا کہ آپ کراچی آئیں تو ہم مل کر گوشی جمال کے گھر چلیں گے۔ ان کی اماں کی پر لطف باتیں لائیو سنیں گے لیکن یہ کیا ہو گیا۔ گوشی آپ کا دکھ اپنے دل پر محسوس ہو رہا ہے۔ گیارہ نومبر کو میرے ماموں بھی پانچ ماہ کی علالت کے بعد ہم سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو گئے۔ میرے ماموں آٹھ بہنوں کے اکلوتے اور سب سے چھوٹے بھائی تھے۔ ساتوں خالائیں رخصت ہو گئیں۔ اب ماموں بھی۔ امی تنہا سہہ پا رہی ہیں۔ بہت کمزور تنہا محسوس کرتی ہیں بیمار بھی رہتی ہیں، ایک دھڑکا خوف۔ مسلسل افسردگی نے دل کو حصار میں لیا ہوا ہے۔ اللہ ان کا سایہ ہمارے سر پر قائم و دائم رکھے آمین۔

"کرن کرن خوشبو" ہمیشہ کی طرح مفید اور معلوماتی ہے۔ بہنوں کی محفل میں تمام خطوط لاجواب تھے۔ خاص

طور پر صدف ناصرہ کا تبصرہ۔ صدف بہت سی اچھی عادات کی مالک لگتی ہیں ان سے ملنے کا دل چاہتا۔ تبسم اور ماہانہ جانے کیوں خط نہیں لکھتیں ورنہ بھی میری دعاؤں میں رہتی ہیں۔ رمشا روشن کو کہنا ہے کہ میں نے آپ کی تحریر پر ایک جملے کی تعریف نہیں کی تھی لیکن صفحات کی کمی کی وجہ سے ادارے کی مجبوری ہے ورنہ آپ کا رحاء تو یادگار ہے اور سچ بتائیں، ہمارے محسوسات تو اکثر رحا جیسے ہو جاتے ہیں پھر اداسی کا دورہ پڑ جاتا ہے۔

"دانہ پانی" اپنے عارضی اختتام کو پہنچا اور توقع کے مطابق ٹریجڈی رہا۔ اب انتظار ہے اس کے دوسرے حصے کا لیکن دو اہم ترین کرداروں کے نہ ہونے سے یہ کہانی اس قدر پرکشش اور دلچسپ ہو پائے گی جیسی پہلے حصے میں رہی۔ نمرہ کی ہر تحریر لاجواب اور بے مثال ہوتی ہے لفظ لفظ سحر انگیز۔ ملالا کی زیاد سے شادی برداشت نہیں ہو رہی، ہاں یہ بہت اچھا ہوا کہ سرکار نے جس بیٹے کے لیے اتنا کشٹ اٹھایا وہ ماں کی پرواہ کیے بغیر اس سے دور چلا گیا۔

پیاری اور عزیز ترین سمیرا حمید اکل شفا کے ساتھ عمر دراز عطا فرمائے آمین۔

ناول کی لسٹ میں راحت جبیں کا نام دیکھ کر لبوں پر بے اختیار مسکراہٹ آگئی اور سچ میں یہ پہلی مسکراہٹ تھی جس نے کافی دن بعد لبوں کو چھوا۔ یقیناً ہم ایک اور شاہکار پڑھنے جا رہے ہیں۔

آسیہ رئیس خان بہت جلد ان رائٹرز میں شامل ہو چکی ہیں جن کا نام دیکھ کر دل خوش ہو جاتا ہے۔ ہمارے معاشرے میں عزہ کی سچائی اور بے وفائی کو سراہا نہیں جاتا لیکن ہمارے دل کو عزہ کا کردار خوب بھایا بلکہ مجھے اس میں اپنا عکس نظر آیا۔

"مجبور" اچھی تحریر تھی۔ حنان کی دوغلی شخصیت کا پول جلد کھل گیا ورنہ رشنا کا نقصان ہو جاتا تھا۔ حمیرا شفیع کا "روپ در روپ" بہت اچھا پیغام تھا۔ "نائٹ لائٹ" بہت اچھا لگا۔ رشتوں کے گہرے زخموں پر تسلی آمیز میٹھے لفظوں کا "مرہم" لگانا بڑے سہل انداز میں رمشا روشن نے سکھایا، یہ حقیقت ہے۔ ہماری تربیت میں ہمارے پیارے رسالوں کا سب سے بڑا کردار ہے۔ حنا بشریٰ کا افسانہ بھی اچھا لگا گو موضوع کچھ پرانا لیکن رائٹرز کا کمال ہے کہ پرانے موضوعات کو بالکل نئے انداز میں بیان کر کے پسندیدگی کا معیار برقرار رکھتی ہیں۔ "آسیب" میں محسنہ کے انجام پر افسوس ہوا اظہار بزدل سے زیادہ نفسیاتی مریض لگا، وہ نہ اپنی محبت کی حفاظت کر سکا نہ بچی کی اچھی تربیت۔

سدرۃ المنتہیٰ سے ملاقات بہت اچھی لگی دانیال خان سے باتیں ٹھیک ہی تھیں سچ تو یہ ہے کہ ہمیں اپنی رائٹرز کے انٹرویوز کے سامنے کچھ بھاتا ہی نہیں۔ صدف آصف کا باورچی خانہ پسند آیا۔ ہم پھر ہر بار کی طرح یہی کہیں گے کہ ہمارے سوا سب ہی بہنیں کس قدر سلیقہ مند ہیں۔ موسم کے پکوان میں گوند پنجیری اچھی لگی لیکن یہ حلوے کی شکل میں بھی بنتا ہے اس کی بھی ترکیب دیجیے۔

ج: پیاری ناہید! بہت شکریہ کہ آپ نے ہماری مجبوری سمجھی۔ یقین جانیے کچھ خطوط تو اتنے دلچسپ ہوتے ہیں کہ ایک لفظ بھی کاٹنے کو جی نہیں چاہتا۔

آپ کی امی کا دکھ سمجھ سکتی ہوں۔ سات بہنیں اور پھر اب بھائی بھی۔ بہن بھائیوں کے ساتھ بیٹھ کر ان سے باتیں کر کے جو خوشی ہوتی ہے اس کی الگ ہی بات ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کی امی کو صحت مند اور سلامت رکھے (آمین)

نوشی مغل..... جلال پور جٹاں

میں ناراض ہوں آپ سے لیکن پھر بھی آ گئی (گزارہ جو نہیں ہوتا) آپی جان میں نے آپ کا ادھار دینا تھا نہیں ناں دیا؟؟ یہ کیا بات ہوئی میں اکتوبر کے شمارے میں تفصیلی تبصرے کے ساتھ آئی تھی اور شاید چوہوں نے کتر کتر کر میرا تبصرہ آدھے سے زیادہ کھا لیا (اداسی) اور افسوس تو اب بھی ہو رہا ہے کہ نومبر میں بھی میرا پیارا منا سا نام غائب تھا اور دسمبر میں بھی مجھے اپنا آپ کہیں نظر نہ آیا۔ (بہت رونا آیا بہنوں) اور تو اور کسی نے مجھے دوستی کے لیے ہاتھ بھی نہ بڑھایا۔ آپی اگر میرا یہ خط بھی شائع نہ ہوا تو میں نے کراچی آ جانا اور دفتر کے باہر منجی (چارپائی) بچھا کر دھرنا دے لینا (کھلم کھلا دھمکی)

ج: پیاری نوشی! ہم یہ بات پہلے بھی لکھ چکے ہیں کہ لیٹ ایڈیٹ کرنا ہماری مجبوری ہے۔ کراچی ضرور آئیں۔ ہمیں آپ سے مل کر خوشی ہوگی۔

ثریا یاسمین..... موگہ تلہ گنگ

شمارہ 8 دسمبر کو ہاتھ میں آتے ہی دانہ پانی کی طرف دوڑ لگائی۔ عمیرہ احمد کے ناولوں میں اب انتہا اور تشنگی دونوں ملتی ہیں۔ مراد کا مرنا دل کو رلا گیا۔ کرن کرن روشنی میں اپنا بہت بڑا اسکالا آسانی سے سمجھ میں آ گیا۔ نیند کی حالت میں نماز واقعی سمجھ میں نہیں آتی۔ "آنگنا پھول کھلیں گے" ایک اچھا اضافہ ہے۔ ثانیہ کی محبت کہانی کا ہیرو وحید ہی ہوگا۔ آسیہ رئیس نے سہو کار میں بہت بڑا معاشرتی المیہ بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ تو گناہ کبیرہ بھی بخش دیتا ہے۔ مگر لوگ معمولی خطا بھی نہیں بھولتے۔ توبہ تائب ہونے ہی نہیں دیتے۔ روپ در روپ کے اختتام نے آنکھیں نم کر دیں۔ افسانے سب بہترین رہے۔ "ملالا" پہ تبصرہ نہ کرنا ممکن ہی نہیں۔ حسب روایت نمرہ جی نے کیا کمال لکھا ہے۔ میری تو سمجھ میں ہی نہیں آتا۔ نمرہ اتنے اچھوتے خیال کہاں سے لاتی ہیں۔

ج: پیاری ثریا! شعاع آپ کو پسند آیا۔ یہ جان کر بہت خوشی ہوئی۔ آئندہ شرکت کرتی رہیے گا۔

یاسمین یوسف انصاری..... طارق کالونی منگھن آباد

سب سے پہلے تو آپ کا بہت شکریہ کہ آپ نے میرا خط "میرے نام" میں شامل کیا۔ مجھے بہت خوشی ہوئی گھر میں سب کو اپنا خط دکھایا۔ سب نے بہت مبارک باد دی۔

ہاں آپی آپ کے مشورے پر ضرور عمل کروں گی کہ اپنے اندر اعتدال پیدا کروں اپنے اندر جذباتی پن کو کم کروں اور اپنے اندر ٹھہراؤ پیدا کروں۔

سب سے پہلے تو مجھے سب سے حیران کن "آسیب" "عابدہ صباحی" کا بہت ہی دکھی اور بہت ہی تکلیف دہ لگا۔ اللہ ایسا تو کسی دشمن کے ساتھ بھی نہ کرے۔ حنا اشرفی جی کا ناولٹ "جھگڑ" جس میں بے چاری مہک کے ساتھ بہت ظلم ہوا۔ زندگی اجیرن تھی لیکن اسے صبر کا پھل بھی ملا شان کی صورت میں کاش کہ مجھے بھی ایسا ہی شوہر ملے کیا میرا انجینئر بھی بالکل ایسا ہی ہے۔ وہ تو میرا شہزادہ ہے اور ان شاء اللہ بہت جلد ہماری شادی بھی ہونے والی ہے۔ آپی آپ دعا کرنا میرے اور میرے شہزادے کے لیے آپ کو مٹھائی بھیجوں گی۔ قرۃ العین خرم ہاشمی جی کا افسانہ "ہائی لائٹ" پڑھ کر بہت مزہ آیا۔ خاص طور پر جب فروا اور ان کی امی کراچی جاتی ہیں مال میں گھومنے۔ گول گپے کھاتی ہیں۔ مجھے ایسا لگا کہ میں بھی ان کے ساتھ گول گپے کھا رہی ہوں۔ اور سب سے اہم بات کہ نوشین اپنی بیٹی کو جو بھی بات سمجھاتی ہے میں نے اسے بہت ہی غور و فکر سے پڑھا اور سمجھا ان کے سمجھانے کا انداز ہی بہت کمال تھا۔ قسم سے سچ میں ایک آئیڈیل والدہ۔ والدہ کو بالکل ایسا ہی ہونا چاہیے۔"

ج: پیاری یاسمین! آپ کے اور آپ کے شہزادے کے لیے دعا گو ہیں۔ ہمیشہ خوش رہیں اور اسی طرح ہنستی کھلکھلاتی رہیں اور ایک بات یاد رکھیں کہ شہزادے صرف کہانیوں میں ہوتے ہیں اصل زندگی میں نہیں ہوتے۔ ہاں اگر کسی سے محبت ہو تو وہ شہزادہ لگتا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کی محبت کو قائم دائم رکھے۔

کراچی سے نورین حفیظ لکھتی ہیں

میں پہلی مرتبہ آپ کو خط لکھ رہی ہوں۔ حالانکہ شعاع اور خواتین سے رابطہ ان کی پیدائش کے ساتھ ہی شروع ہو گیا۔ ہمارے ابو مطالعہ کے بہت شوقین تھے۔ آفس سے آنے کے بعد ان کے ہاتھ میں کوئی نہ کوئی رسالہ ڈائجسٹ مذہبی بکس وغیرہ ضرور ہوتی تھیں۔ ہم سے بڑے بہن بھائی بھی ان کے نقش قدم پر چل رہے تھے۔ چھ سال کی عمر میں بھائی جان نے ہمارے ہاتھ میں بچوں کا اخبار دیکر کہا "امی کو سناؤ" کیونکہ امی کو سلائی کا بہت شوق تھا۔ وہ ہر وقت سلائی کڑھائی کرتی رہتی تھیں۔ بس اس دن کے بعد تو نورین کی لاٹری نکل آئی۔ بچوں کے کون سے رسالے تھے جو اس نے نہیں پڑھے۔ بچوں کی دنیا، پھول، غنچہ، نونہال، نور اس کے علاوہ بے شمار جن کے اب نام بھی یاد نہیں۔ بچوں کے ناول اخبار والا جب ابو کے ڈائجسٹ لے کے آتا تھا۔ تو نورین بڑی شرافت سے جا کر ہاتھ باندھ کر کھڑی ہو جاتی تھی۔ اخبار والے کے پاس جتنے بھی بچوں کے رسالے ہوتے تھے۔ سب نورین کے پاس

اب یہ سب رسالے تو نورین نے ایک ہفتے میں ختم کر لیے۔ اب ابو کی ڈائجسٹیں پڑھنی شروع۔ حالانکہ عمر اتنی کم تھی کہ کچھ سمجھ میں بھی نہیں آتا تھا ہر وہ چیز جو ابو پڑھتے تھے وہ ہمارے ہاتھ میں ہوتی تھی۔

خود زیب النساء خواتین، کرن اور شعاع بے شمار ناول رسالے لائبریری سے منگوا کر اور رات کو کچن میں بیٹھ کر وہ دو بہنیں اس طرح پڑھتی تھیں جیسے پہلے قرآن خوانی میں ایک سپارہ دو دو خواتین مل کر ختم کرتی تھیں۔ اس زمانے میں ہمیں بھی کہانیاں لکھنے اور سنانے کا بہت شوق تھا۔ مگر ہماری پڑھائی ادھوری رہ گئی کیونکہ ابو واپڈا میں تھے اور ان کا ٹرانسفر گدو بیراج میں تھا۔ وہاں پرانے زمانے کے دو اسکول تھے۔ لڑکے لڑکیاں ساتھ پڑھتے تھے۔ ہماری عمر اس وقت دس سال تھی اور کلاس میں لڑکیوں کی تعداد چار تھی۔ لڑکے چند رہ یا بیس تھے اور سب داڑھی مونچھوں والے۔

ہم پڑھائی میں بہت اچھے تھے۔ سر ہماری بہت تعریف کرتے تھے اور لڑکوں کو ذلیل کرتے دیکھو، کتنی چھوٹی بچی ہے اور تم کتنے بڑے۔ امی کو یہ بات پتا چلی تو انہوں نے ہمیں گھر بٹھا لیا۔ کہ کہیں لڑکے اس کے دشمن نہ بن جائیں۔ پھر ہم لوگ کراچی آ گئے۔ مگر گھر کے حالات ایسے تھے کہ ہم نے اسکول میں داخلہ نہیں لیا اور پھر کچھ سالوں کے بعد یعنی پچیس سال کی عمر میں B گریڈ میں میٹرک پاس کیا۔ پھر انٹر علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی سے بی اے بی ایڈ کیا پرائیویٹ اسکول جاب کی شادی کے بعد جاب الحریم میں آٹھ سال جاب کی۔

جوڑوں اور گٹھیا کی تکلیف کی وجہ سے جاب چھوڑنی پڑی اب میں بالکل گھر میں قید رہتی ہوں۔ کیونکہ میرا فلیٹ سیکنڈ فلور پر ہے اور میرے لیے اٹھنا بیٹھنا چلنا پھرنا بہت مشکل ہے۔ مگر خواتین اور شعاع کا ساتھ مسلسل چل رہا ہے۔ شادی کے ایک ہفتے بعد میں نے میاں جی سے خواتین منگوایا۔ دو سال پہلے شوہر کا بھی انتقال ہو گیا ہے۔ بچے ہیں نہیں گھر میں فلیٹ کے بچوں کو قرآن پاک کی تعلیم دیتی ہوں۔ خواتین کو دینی مسئلے مسائل سمجھاتی ہوں۔

عمیرہ احمد کی تحریروں سے شروع سے متاثر ہوں۔ ہر رائٹر اپنی جگہ ایک نگینہ ہے۔ دل ریاولیٹر کا تہہ خانے کا منظر رونگٹے کھڑے کر رہا تھا۔ تو (اے طائر لاہوتی) کی بی اماں میری آئیڈیل تھیں۔ اور میری خواہش تھی کہ میں اپنا بڑھاپا ان کی طرح گزاروں اس وقت میری عمر اڑتالیس سال ہے اور میں بالکل اکیلی رہتی ہوں مگر سب فلیٹ والے میرا بہت خیال رکھتے ہیں۔ اور مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میں تھوڑی تھوڑی بی اماں کی طرح ہوں میرا بہت دل چاہتا ہے کہ میں سروے میں حصہ لوں۔ مگر میرے لیے یہ ممکن نہیں ہے کیونکہ ڈائجسٹ باجی خریدتی ہیں وہ پڑھنے کے بعد مجھے بھیجتی ہیں۔ اس وقت مہینے کا تقریباً اینڈ چل رہا ہوتا ہے۔ جب تم سے ناتا جوڑا ہے پڑھ کر اتنا دل بے چین ہوا کہ میں لکھے بغیر نہیں رہ سکی۔

میں سارا دن فالتو رہ کر گھبرا جاتی ہوں۔ قرآن پاک اور تسبیحات کے بعد بھی اس لیے میں نے کاغذ اور قلم سے ناتا جوڑ لیا ہے۔ حالانکہ میں تھوڑا سا لکھ کر تھک جاتی ہوں۔ اور ہاتھ میں بھی درد ہونے لگتا ہے۔ اگر آپ حوصلہ افزائی کی تو آگے بھی یہ سلسلہ جاری رہے گا۔

ج: پیاری نورین! آپ کا خط پڑھ کر بے حد خوشی ہوئی آپ اتنے عرصے سے ہمارے پرچے پڑھ رہی ہیں تو پھر خط لکھنے میں اتنی تاخیر کیوں کی؟ افسانہ قابل اشاعت ہوا تو ضرور شامل ہوگا۔ ان شاء اللہ

صدف ناصر..... جزاءاللہ

2022ء کا آخری شمارہ ہاتھوں میں ہے جو کہ بہت خواری کے بعد ملا۔ تمام ادارہ خواتین اور قاری دوستوں اور بہنوں کے لیے نئے سال کی دلی دعائیں اور اپنی سسٹر صائمہ کے لیے۔

"نامکمل اچھا لگا۔ سحر خان (رنگ محل) کو نامکمل کی زینت بنا ئیں

گو زندگی فلم کی ریل کی طرح ریوائنڈ تو نہیں ہو سکتی لیکن ہمارے لکھے کا حساب لکھنے والے مالک نے جو میرے قلم کو رواں کیا ہے، چلایا ہے تو اس میں بھی اس کا کوئی خاص اشارہ ہے کہ کیا کرنا چاہتی ہیں۔ اس کے جواب میں کہیں لگے کہ آپ نے تو میرے دل کی بات پوچھی ہے وہ سوال جو میں صرف اپنے آپ سے کرتی اور جواب ڈھونڈتی رہی آج اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر پوچھا تو دل کا سارا غبار آنسوؤں میں بہہ کر آپ کو اپنی پوری کہانی سنا گیا آپ نے سوال ہی ایسا کیا ہے۔ کہ ٹوٹے ہوئے تار پھر بج اٹھے ہیں، ادھورے خواب پھر آنکھوں میں جاگ اٹھے ہیں یا اپنی ادھوری تحریریں مکمل کر کے اور کچھ لکھ کر بھیجنے کی تشنگی بجھائی۔

3- الحمدللہ میں اپنی موجودہ زندگی اپنے شوہر کرنل فیصل اور اپنی بچیوں کے ساتھ بہت خوش و مطمئن ہوں۔

میری دونوں بچیاں فرماں بردار، نیک اور لائق و سگھڑ ہیں، بڑی بیٹی ڈاکٹر عائشہ انڈس ہاسپٹل میں گائناکولوجسٹ اور چھوٹی نے ایم ایس سی ٹیکسٹائل کیا، دونوں اپنے گھروں میں و بچوں کے ساتھ خوش و خرم ہیں، دونوں داماد بیٹوں جیسے ہیں اور بچیوں کے سسرال والے انتہائی قدر دان ہیں۔

اور رہی بات تبدیلی کی سوچتی ہوں بیٹے کا اگر وہ جان کا حادثہ نہ ہوتا تو زندگی شاید کسی اور ڈھب سے گزرتی۔ وہ اسکول و کالج کی بیسٹ اسٹوڈنٹ، وہ حیدرآباد بورڈ سن 71ء انٹرمیڈیٹ کے امتحان میں سیکنڈ پوزیشن حاصل کرنے والی گولڈ میڈلیسٹ، وہ انگلش ورڈ کی بیسٹ ڈیبیٹر وہ اپنے کالج کے اردو میگزین کی ایڈیٹر، وہ اخبار رسالوں میں لکھنے والی قلمکار جسے میں رکھ کر کہیں بھول گئی ہوں اسی کو دوبارہ زندہ کروں جو عام سی گھریلو عورت بن کر رہ گئی۔

ارم ربانی، سوہدرہ

1- اپنی زندگی میں اتنے ڈائجسٹ پڑھے ہیں کہ حساب بھی یاد نہیں، کسی بھی ناول یا ناولٹ کے لیے ہیروئن کا وجود از حد ضروری ہوتا ہے ہیروئن کے کردار کے بغیر نہ کوئی ناول مکمل ہے نہ کوئی قلم کار تکمیل کیا ہے کہ مجھے ہیروئن صرف وہی یاد رہ گئی جو کہانی میں باقاعدہ اپنا ایک حصہ رکھتی تھی، جس کا کردار شفاف ذہنوں کے آئینوں پر اپنا عکس چھوڑ گیا شہرزادت کی فلک یا پھر شان دار پرسنالٹی اماسہ ہاشم بھی نہیں بھولتی، لاحاصل کی زینت، تالیہ جیسی غدر سے خوف، ہاں کردار میں مجھے اپنا آپ نظر آتا ہے وہ ہے وقت حاضر کی کشمالہ "عرف مالا" جو ہر غلطی پر مدتوں پریشان رہتی اس کا گلٹ ختم نہیں ہوتا، ہر کسی پر بغیر پرکھے بھروسہ کر لیتا ہے پھر بعد میں پریشان ہو جاتا۔

2- زندگی کے کئی ماہ و سال بسر کر دیے، ہر سال ارادے باندھے اور پھر اپنی آنکھوں سے ان ارادوں کو ٹوٹتے دیکھا لیکن شکر الحمدللہ زندگی کی ہر خواہش کسی نہ کسی مرحلے پر پوری ضرور ہوگئی۔ آنے والے سال میں نیک ارادہ تو یہ ہے کہ خواتین ڈائجسٹ کچھ اچھا لکھ کر بھیجوں جو اہل خواتین ڈائجسٹ کو پسند آجائے۔ دوسرا ارادہ یہ ہے کہ مفلس لوگوں کے لیے کچھ بہت اچھا کروں، جس علاقے سے میں ہوں، وہاں معیار زندگی پسماندہ ہے۔ نئے سال سے ہم سب ایک ہی توقع رکھتے ہیں کہ شاید اس سال اللہ کو پاکستان پر رحم آجائے۔

3- میں نے اپنی زندگی میں بہت سے غلطیاں کیا ہیں، شکر ہے اللہ نے پھر غلطی کے مداوے کی توفیق بھی عطا کی، زندگی کو سمجھتے سنتاتے یہ وقت آگیا ہے کہ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میرے قریبی اب مجھ سے خوش ہیں، اب تو کوئی کسی خواہش بھی نہیں، شوق ذکر الٰہی بھی ہے سو میں مطمئن زندگی کے مراحل میں ہوں۔

زندگی میں بہت جگہوں پر کوئی نہ کوئی کمی محسوس رہی لیکن اپنے عزیز از جان دوستوں کی کمی بہت محسوس ہوتی ہے جو شاید اپنی اپنی زندگیوں میں بہت مصروف ہیں یا شاید میں بھی انہیں یاد آتی ہوں اور وہ بھی میری کمی محسوس کرتی ہوں

☆☆

خبریں و دیگر

واصفہ سہیل

ایک اور محبت

رومانس کے حوالے سے افتخار عارف کہتے ہیں "میں عمر کے اس مرحلے میں بہت سی باتیں کہہ سکتا ہوں۔ دنیا میں سب ہی لوگ محبت کرتے ہیں۔ میری ایک بیٹی اور ایک بیٹا ہے۔ بیٹی کی شادی ہوئی لندن میں، جب وہ ہنی مون پر جانے لگی تو مجھ سے ملنے آئی ہم دونوں باپ بیٹی ایک صوفے پر بیٹھ گئے۔ میں نے اس کے سر پر دست شفقت پھیرتے ہوئے کہا۔
"بیٹی میں نے تم سے بھی بڑھ کر ایک محبت اور کی ہے اور وہ میری شاعری ہے۔"

مطالعہ کے متعلق افتخار عارف کے خیالات بہت شاعرانہ ہیں۔ "مجھے ایک اچھی کتاب پڑھنے کو مل جائے تو سکون ملتا ہے۔ کوئی بھی نئی اچھی اور بہترین کتاب پڑھنے سے پہلے میں خوب اہتمام کرتا ہوں۔ باقاعدہ نئے کپڑے بدلتا ہوں پرفیوم لگاتا ہوں، اس رات کھانا باہر کھانے جاتا ہوں پھر رات کو جاگ کر کتاب کا مطالعہ کرتا ہوں" (واہ جی واہ) یہ ہوتی ہے کتاب سے محبت۔

واپسی

شرمین عبید اکثر ویشتر پاکستان کا بھدا اور بدصورت چہرہ پیش کر کے ایوارڈ حاصل کرتی رہتی ہیں۔ 2012ء میں شرمین عبید چنائے کو لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ سے نوازا گیا تھا۔ تاہم اب شرمین عبید چنائے نے اپنا ایوارڈ واپس کرنے کا اعلان کر دیا ہے۔ اس کی وجہ لکس ایوارڈ میں فیروز خان کی نامزدگی بتائی گئی ہے۔

شرمین عبید چنائے کا کہنا ہے کہ جب لکس اسٹائل ایوارڈ میں خواتین پر گھریلو زیادتی اور تشدد کرنے والے مردوں کو نامزد کیا جائے تو وہ خاموش نہیں رہ سکتی ہیں (اور ان عورتوں کے متعلق کیا خیال ہے جو عورتوں پہ ظلم کرتی ہیں) اس لیے وہ اپنا ایوارڈ واپس کر رہی ہیں۔ (ویسے گھریلو معاملات اور کام کو الگ رکھنا چاہیے اور تصویر کا ایک رخ دیکھ کر فیصلہ نہیں کرنا چاہیے کیوں کہ بعض اوقات جو سامنے ہوتا ہے ویسا پس منظر میں نہیں ہوتا۔)

☆☆

آپ کا باورچی خانہ

صائمہ احمد ...... لاہور

س: "کھانا پکاتے ہوئے آپ کن باتوں کا خیال رکھتی ہیں؟"

ج: "کھانا پکاتے ہوئے میں سب کی پسند کا خیال ضرور رکھتی ہوں اور اس میں، میں غذائیت کو اولیت دیتی ہوں۔ میرے گھر والے بہت زیادہ Health conscious (صحت کا خیال رکھنے والے) ہیں۔ بیٹا چونکہ ڈاکٹر بن رہا ہے اس لیے ہمارا دسترخوان ڈھیر ساری سلاد اور سبزیوں سے بھی سجا رہتا ہے۔ الحمدللہ۔"

س: "اچانک مہمان آجائیں کوئی ایسی ڈش جو فوری طور پر بنائی جاسکے؟"

ج: "اب تو وہ دور ہے کہ بغیر بتائے کوئی نہیں آتا۔ اس لیے ایسا بھی نہیں ہوا کہ بن بتائے کوئی مہمان آجائے۔ ایک دو دن کا نوٹس ضرور ملتا ہے۔ لیکن میں آپ کو ایک ایسی ترکیب بتاتی ہوں جو آپ اچانک بنا سکتی ہیں۔ دال یا چاول یا سالن کے ساتھ مہمانوں کو سرو کرسکتی ہیں۔"

چکن روسٹ

ایک مرغی آٹھ بڑے پیس بنوا کر کٹ لگوا لیں۔ اچھی طرح دھو کر خشک کرلیں۔

اب ایک باؤل میں چھ سے آٹھ بڑے چمچے لیموں کا رس لیں اس میں نمک، لال مرچ حسب ذائقہ، چاٹ مسالا، دو بڑے چمچے لہسن ادرک پاؤڈر ایک بڑا چمچہ (تازہ بھی پسا ہوا استعمال کرسکتے ہیں) سفید زیرہ کٹا ہوا۔

سارے مسالے مکس کرکے چکن پر اچھی طرح لگا لیں۔

چکن کو فریز کرلیں۔ جب بھی اچانک کوئی مہمان آئے تو چاہے دال پکائیں یا آلو اس چکن کو نکالیں تھوڑے سے تیل میں تیز آنچ پر فرائی کرکے علیحدہ سے پین میں ہلکی آنچ پر دم پر لگا دیں۔ تیس سے چالیس منٹ میں لذیذ روسٹ تیار ہے۔

س: کچن عورت کی سلیقہ مندی کا آئینہ دار ہوتا ہے آپ کچن کی صفائی کا کیا اہتمام کرتی ہیں؟

ج: الحمدللہ بہت صفائی پسند ہوں اور کوشش کرتی ہوں کہ روز کے روز کچن صاف ہوتا رہے۔ جب بھی کوئی الماری یا کچن کا کوئی کونا گندہ نظر آتا ہے تو اس کی فوراً صفائی کی جاتی ہے خاص طور پر چکن وغیرہ کو دھونے کے بعد اس کی جو ایک خاص بدبو پھیل جاتی ہے وہ مجھے بہت بری لگتی ہے۔

س: صبح کا ناشتا کیا بناتی ہیں؟

ج: ہمارے گھر میں سب کا ناشتا مختلف ہے۔ میاں صاحب ساڑھے سات آفس چلے جاتے ہیں تو وہ دلیہ اور سبزیوں والا آملیٹ کھاتے ہیں۔ پھر بیٹا یونیورسٹی جاتا ہے تو وہ بھی تیز یا تیز کے بغیر کھا کر جاتا ہے۔ میں اور بیٹیاں فرائی انڈہ بریڈ کے ساتھ لیتی ہیں۔ تو بہت سادہ سا ناشتا ہوتا ہے۔ ہاں سبزیوں والے آملیٹ میں شملہ، پیاز، ٹماٹر، پالک، توری، ہر مسالہ مکس کرکے بناتی ہوں۔ بہت مزے دار بنتا ہے۔

س: گھر سے باہر کھانا فیشن بنتا جارہا ہے آپ مہینے میں کتنی بار جاتے ہیں۔

ج: گھر سے باہر ہوٹلنگ لاہور جیسے بڑے شہر میں رہتے ہوئے ناممکن ہے۔ ہاں باہر جائیں یا گھر پر آرڈر کریں یہ بچوں کے موڈ پر منحصر ہوتا ہے۔

س: کھانا پکاتے ہوئے موسم کو مدنظر رکھتی ہیں؟

ج: جی بالکل، سردیوں میں اگر ساگ اور اس کی پنیاں نہ ہوں تو سردیوں کا مزہ بالکل نہیں آتا۔ ویسے بچے تو موسم کی نہیں کرکٹ کا موسم سمجھ کر کھانا کھاتے ہیں۔ جیسے کل اب پاکستان اور نیوزی لینڈ کا بھی فائنل ہے تو مجھے آرڈر کر دیا گیا ہے کہ بریانی بنائی جائے۔ اب بریانی کے ساتھ کیا بناؤں کی یہ سوچتی ہوں۔

س: اچھا پکانے کے لیے کتنی محنت کی قائل ہیں۔

ج: دیکھیں محنت کا تو نہیں جانتی مگر ہاں کھانا پکانے میں اگر دلچسپی نہ ہو تو کھانا اچھا نہیں بنتا۔ ہر کام کو بہترین بنانے کے لیے اس میں انٹرسٹ لینا بہت ضروری ہے اور مجھے کوکنگ کرنا اور نئے تجربے کرنا اچھا لگتا ہے۔

س: کچن کی کوئی ٹپ؟

ج: کھانے پکاتے ہوئے غلطیاں بھی ہوتی جاتی ہیں۔ مجھ سے بھی ہوتی ہیں لیکن پھر کر کرا کر ہم کھا لیتے ہیں۔ چاول ابالتے وقت ایک چمچہ سفید سرکہ ڈال دیں تو چاول کھلے ہوئے بنتے ہیں۔

☆☆

عدنان

کیا ذاتی گھر ہی کچھ نہیں

آمنہ علی

عدنان بھائی! میرا مسئلہ نئی بات نہیں ہے۔ سینکڑوں بلکہ ہزاروں عورتیں ہوں گی جنہیں اس دکھ سے گزرنا پڑتا ہوگا لیکن پتا نہیں کیوں میں برداشت نہیں کر پا رہی ہوں۔ میری شادی کو پندرہ سال گزر چکے ہیں۔ چار بچے ہیں، اللہ کا دیا گھر میں سب کچھ ہے۔ مجھے ہر آسائش حاصل ہے۔ لیکن یہ سب کچھ شادی کے وقت نہیں تھا۔ میرے شوہر کرائے کے مکان میں رہتے تھے۔ ایک کچی آبادی میں ساٹھ گز کا گھر تھا۔ چھت ٹین کی چادروں کی تھی جو گرمیوں میں بہت بری طرح تپتی تھی جبکہ سردی میں انتہائی سرد ہوتی تھی۔ شوہر کی تنخواہ بہت قلیل تھی گھر میں ان کی ایک بہن اور ماں بھی تھیں۔ بہن کی شادی بھی ان کی ذمہ داری تھی کیونکہ والد وفات پا چکے تھے۔ میں نے ان کو کاروبار کا مشورہ دیا۔ انہیں خود بھی یہ شوق تھا۔ ان کی اماں دہی بڑوں کا مسالا، قورما مسالا، چاٹ مسالا، بہت اچھا بناتی تھیں انہوں نے مارکیٹ میں ایک کرائے کی دکان پر کام شروع کیا۔ دکان کے ایڈوانس کے لیے رقم میں نے اپنا زیور دے کر فراہم کی۔ میں اور اماں گھر پر مسالے تیار کرتے۔ اللہ تعالیٰ نے برکت دی۔ ان کو ایک بڑا آرڈر مل گیا۔ یوں یہ کام چل نکلا۔ انہوں نے ملازم رکھ لیے۔ ہم نے اپنا ذاتی گھر بنا لیا۔ گاڑی بھی آگئی بچے اچھے اچھے اسکول میں داخل کرا دیے۔ بہن کی شادی ہوگئی۔ اب مجھے پتا چلا ہے کہ شوہر صاحب نے دوسری شادی کی ہوئی ہے۔ شادی کو آٹھ سال گزر چکے ہیں۔ ان کے دو بچے بھی ہیں۔ میں نے شوہر سے پوچھا تو انہوں نے اقرار کرلیا۔ لیکن اس اقرار کے بعد انہوں نے کہا۔ "اب تم جان ہی چکی ہو تو میں تم دونوں کے ساتھ انصاف کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے اس لیے چھپایا تھا کہ میں نہیں چاہتا تھا کہ تمہیں تکلیف ہو۔"

اب وہ ایک رات میرے ساتھ رہتے ہیں اور ایک رات دوسرے گھر میں دوسری بیوی کے ساتھ لیکن میرا دل اس صورت حال کو تسلیم نہیں کر پا رہا ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ وہ اب یہاں نہ آئیں۔ میں نے ان سے کہا ہے کہ میں علیحدگی چاہتی ہوں۔

ج: عزیز بہن! آپ کا دکھ بجا ہے آپ علیحدگی چاہیں گی تو وہ آپ کو چھوڑ دیں گے کیونکہ ان کی دوسری بیوی موجود ہے۔ لیکن وہ بچوں کو نہیں چھوڑیں گے۔ اگر انہوں نے بچے لے لیے تو کیا آپ بچوں کے بغیر رہ سکیں گی؟ اور بچے آپ کے پاس چھوڑ دیے تب بھی مسئلہ ہے، وہ خرچ دیں تب بھی اکیلے آپ کے لیے بچوں کی ذمہ داری اٹھانا آسان نہیں ہوگا۔ بچوں خصوصاً لڑکوں کے لیے باپ کا ہونا بہت ضروری ہے۔ اگر آپ دوسری شادی کرنا چاہتی ہیں۔ تب تو باقاعدہ خلع یا طلاق ضرور لیں۔ دوسری صورت میں آپ ان سے تعلق نہ توڑیں۔ طلاق یا خلع آپ کے لیے بہت سے مسائل کھڑے کر سکتی ہے۔

مریم...... کراچی

عدنان بھائی! میری شادی کو تین ماہ ہوئے ہیں لیکن مجھے لگتا ہے کہ جیسے صدیاں گزر گئی ہوں۔ اصل میں

پابندیاں لگتا ہے گھر میں نہیں جیل میں رہ رہی ہوں۔

گھر میں دس افراد ہیں۔ میرے شوہر سب سے چھوٹے ہیں۔ ان کے دو بڑے بھائی شادی شدہ ہیں۔ ان کے بچے ہیں۔ ساس سسر ہیں۔ گھر میں سب کے لیے فجر کے وقت اٹھنا لازمی ہے۔ ساس کمرے کا دروازہ اس وقت تک بجاتی رہتی ہیں جب تک سب جاگ کر انہیں اپنے جاگنے کی اطلاع نہ دے دیں۔ نماز فجر کے فوراً بعد کچن میں انٹری ہوتی ہے۔ ناشتا کی تیاری، آٹا رات کو گوندھ لیا جاتا ہے لیکن پراٹھوں کی تیاری کسی کو آلو کا پراٹھا چاہیے۔ کوئی مولی کا پراٹھا پسند کرتا ہے۔ مجھے نیند بہت آتی ہے۔ صبح صبح اتنا کام کرتے ہوئے بار بار نیند کے جھونکے آتے ہیں۔ نیند بھگاتے ہوئے کبھی کبھی تو رونا آنے لگتا ہے۔

دوپہر کھانے کا وقت ایک بجے مقرر ہے۔ اس وقت تک کھانا تیار ہونا چاہیے۔ ناشتے کے بعد فوراً ہی کھانے کی تیاری شروع ہو جاتی ہے۔ گھر میں جھاڑو برتن کے لیے ماسی آتی ہے۔ کھانا جٹھانیوں کے ساتھ مل کر پکاتی ہوں۔ دوپہر کھانے کے بعد کچن کی صفائی...... نماز سے فارغ ہوتے تین بج جاتے ہیں۔ آرام کے لیے لیٹتی ہوں، تو شام کی چائے کا وقت ہو جاتا ہے۔ پھر رات کے کھانے کی تیاری، رات نو بجے رات کا کھانا کھایا جاتا ہے۔ خواہ بھوک ہو یا نہ ہو، کھانے کی میز پر سب کو مقررہ وقت پر حاضر ہونا لازمی ہے۔

ہمارے گھر کا ماحول یکسر مختلف تھا۔ گھر میں افراد بھی کم تھے۔ ہم دو بہنیں اور دو بھائی تھے۔ گھر میں سونے جاگنے کھانے پینے کا کوئی وقت مقرر نہیں تھا۔ جب بھوک لگی۔ کھا لیے۔ نیند آئی، سو جاتے، پڑھائی کے لیے رات دیر تک جاگنا پڑتا تو دن میں سو کر اس کی کسر نکال لیتے۔

امی نے بھی اس طرح کی چھوٹی چھوٹی باتوں پر پابندی نہیں لگائی۔ شوہر صاحب خود بھی ان پابندیوں کو پسند نہیں کرتے لیکن گھر میں ان کی اماں جان کا سکہ چلتا ہے۔ میں نے علیحدہ رہنے کی بات تو انہوں نے کہا۔ میری تنخواہ اتنی نہیں کہ گھر کا کرایہ اور بل افورڈ کرسکوں۔

ج: ایک نئے اور بالکل مختلف ماحول میں گزارہ کرنا مشکل تو ہوتا ہے لیکن بہت سی لڑکیوں کو شادی کے بعد اس کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ آپ کی شادی کو صرف تین ماہ ہوئے ہیں۔ اس لیے آپ سے یہ تبدیلی برداشت کرنا مشکل ہو رہا ہے۔ کچھ عرصے بعد عادی ہو جائیں گی۔

ویسے بھی یہ سب ہمیشہ نہیں رہے گا۔ وقت کے ساتھ تبدیلی یقینی امر ہے۔ آپ کی ساس گھر کا نظام اور ذمہ داریاں زیادہ دیر نہیں سنبھال سکیں گی۔ آگے چل کر گھر آپ نے ہی سنبھالنا ہے۔ پھر آپ اپنی مرضی کے مطابق زندگی گزاریے گا، کوئی مداخلت نہیں کرے گا۔

خوش آئند بات یہ ہے کہ آپ کے شوہر بھی ان پابندیوں سے بیزار ہیں۔ اس لیے ان کی طرف سے آپ کو کبھی تنقید کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔

ایک بات نوٹ کرلیں: یہ پابندیاں جو آپ کو آج بری لگ رہی ہیں۔ ایک دن آپ کو ان کی افادیت کا احساس ہوگا۔ زندگی میں کچھ پابندیاں اور نظم وضبط بہت ضروری ہے۔

☆☆

خوبصورت بال

خشک بال

خشک بالوں کو سنوارنے کے لیے آپ نیم گرم ناریل کا تیل لیں۔ انگلیوں کی پوروں کو تیل میں ڈبو کر بالوں میں پھیلائیں اور انگلیوں سے پہلے دھیرے دھیرے پھر تھوڑی تیزی سے مالش شروع کریں۔ جب تک تیل بالوں کی جڑوں میں اچھی طرح جذب نہ ہو جائے تب تک مالش کرتی رہیں۔ مالش کرنے کے بعد دو گھنٹے تک تیل کو بالوں میں رہنے دیجیے پھر سیکا کائی سے بالوں کو دھو لیں۔ سیکا کائی پاؤڈر باآسانی بازار میں مل جائے گا۔

ایک اور طریقہ ہے۔ ایک انڈا لیں اسے پھینٹ کر اس میں ایک لیموں کا عرق اور چائے کا ایک چمچ ناریل کا تیل ملا لیں۔ اب اس کو پھر سے پھینٹ کر بالوں کی جڑوں میں لگائیے اور ہلکے ہلکے آدھے گھنٹے تک ملیے اور سادے پانی سے دھو لیں۔

چکنے بال

بہت زیادہ چکنے بالوں کے لیے آپ ملتانی مٹی گیلی کر کے اس میں ایک لیموں نچوڑ لیں۔

اب اس کو اپنے بالوں کی جڑوں میں پھیلا دیں۔ سر کو دھونے سے غیر ضروری تیل نکل جائے گا اور سر کی کھجلی بھی دور ہو جائے گی اور دماغ کو تراوٹ بھی ملے گی۔ ایک اور طریقہ ہے بیسن سے سر دھونے کا یہ بھی اتنا ہی فائدہ مند ہے جتنی کہ ملتانی مٹی اس کے علاوہ آپ دہی سے بھی سر کو دھو سکتی ہیں۔ دہی میں وہ سارے اجزا موجود ہیں جو صحت مند بالوں کی نشوونما کے لیے ضروری ہوتے ہیں۔ دہی سے بال دھونے کے بعد آپ کو تیل لگانے کی بھی ضرورت نہیں رہے گی۔ دہی لے کر اسے ہاتھ سے تب تک بالوں میں ملیں جب تک وہ کسی کی طرح نہ ہو جائے۔

اب اسے بالوں کی جڑوں میں انگلیوں کے پوروں سے لگایئے اور پندرہ منٹ تک لگا رہنے دیجیے۔ بعد میں پانی سے سر کو دھو لیں۔ اس طرح آپ کے بال سیاہ، لمبے اور چمکیلے ہو جائیں گے۔

گھنگھریالے بال

گھنگھریالے بالوں کو سنوارنا بے حد مشکل ہوتا ہے اگر آپ کے بال گھنگھریالے ہیں تو مایوس نہ ہوں۔ تھوڑی سی محنت سے آپ ان بالوں کو اپنی پسند کے انداز سے سنوار سکتی ہیں۔ بالوں میں کئی بار برش کیجیے اس سے بالوں کے سیدھے ہونے میں کافی مدد ملے گی۔ ناریل کا نیم گرم تیل لیجیے اور اسے اچھی طرح بالوں میں ملیے اس کے بعد ایک پیالی میں پانی لے کر کنگھی اس میں ڈبو ڈبو کر بالوں میں کیجیے۔ بالوں کو چوٹی تک کس کر باندھیں۔

اگر آپ کے بال سفید ہو رہے ہیں تو اس کی کئی وجوہات ہو سکتی ہیں۔ دکھ، صدمہ، ذہنی پریشانی اور کڑھتے رہنے سے بھی بال جلدی سفید ہونے لگتے ہیں۔ آپ کی غذا میں وٹامن اے اور ڈی کی کمی بھی بالوں کو قبل از وقت سفید کر دیتی ہے۔ اچھا ہوگا کہ اس معاملے میں آپ ڈاکٹر سے صلاح لیں۔ ویسے گھریلو علاج یہ ہے۔

چائے کا چمچ ایک مہندی کا پاؤڈر لیں، اتنی ہی مقدار میں آملہ اور چائے کی پتی لیں۔ اب ان سب کا ایک پیالی پانی میں آمیزہ بنا لیں، اس میں ذرا سا نمک اور عرق گلاب ڈال دیں، لیموں کا رس بھی ملا لیں اب اس کو چار پانچ گھنٹے تک رکھا رہنے دیں۔ اس دوران اس کو ایک بار ہلانا نہ بھولیے۔ اس کے بعد اس تیل کو اپنے بالوں میں دھیرے دھیرے ملیے۔ دو گھنٹے کے بعد بالوں کو پانی سے دھو ڈالیے۔ ہر ہفتے اس عمل کو دہرانے سے آپ کے بال سفید نہیں ہوں گے۔

خالص
عرقِ گلاب
سپرے
چہرے کی شگفتگی وتروتازگی کے لیے
چہرہ کِھلے
جیسے گلاب!
Gold Standard Quality
عرقِ گلاب
سپرے
DRAP
Enlisted
Qarshi www.qarshi.com | www.qarshihealthshop.com | QarshiNaturalHealth